اسلام اور جدید ذہن کے شبہات

محمد قطب

شبہات حول الاسلام

ترجمہ:
محمد سلیم کیانی۔ ایم اے

البدر پبلیکیشنز

۲۳۔ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور ۲

مندرجات

- پیش لفظ (مترجم) — ۴
- دیباچہ اشاعت ششم — ۵
- دیباچہ اشاعت اوّل — ۷
- کیا اب اسلام کی ضرورت نہیں رہی؟ — ۱۵
- اسلام اور غلامی کا مسئلہ — ۵۴
- اسلام اور جاگیرداری — ۱۰۷
- اسلام اور سرمایہ داری — ۱۲۶
- اسلام اور ذاتی ملکیت — ۱۳۸
- اسلام اور طبقاتی نظام — ۱۵۲
- اسلام اور صدقات — ۱۶۰
- اسلام اور عورت — ۱۶۷
- اسلام کا نظریۂ جُرم وسزا — ۲۳۳
- اسلام اور تہذیب — ۲۴۲
- اسلام اور رجعت پسندی — ۲۴۸
- اسلام اور مسئلہ جنس — ۲۶۰
- اسلام اور آزادیٔ فکر — ۲۷۱
- کیا اسلام عوام کی افیون ہے؟ — ۲۸۳
- اسلام اور غیر مُسلم اقلیتیں — ۳۰۰
- اسلام اور اشتراکیت — ۳۱۰
- اسلام اور مثالیت — ۳۲۹
- پس چہ باید کرد؟ — ۳۴۳

پیش لفظ

زیر نظر کتاب مصر کے معروف دینی عالم، صاحب قلم اور مجاہد سید قطب شہیدؒ کے بھائی محمد قطب کی کتاب "شبہات حول الاسلام" کا ترجمہ ہے۔ اسلام کی خاطر مصر کے اس علمی خانوادے نے جس خندہ پیشانی سے مصائب شدائد کو برداشت کیا اور مخالفتوں کے باوجود جس پامردی سے اپنا کام جاری رکھا ہے، اسے دیکھ کر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ علم اور عمل دونوں میں یہ خاندان اپنی مثال آپ ہے۔ اسلامی نظام معاشرت و سیاست و اقتصادیات اور ادب پر ان دو بھائیوں نے جو علمی سرمایہ چھوڑا ہے، وہ بڑے بڑے تحقیقی اداروں کے کام سے زیادہ وقیع اور بھاری ہے۔ عربوں کی نئی نسل پر ان کے کام اور کردار کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اور اس کا ثبوت وہ اسلامی تحریک ہے جو سالہا سال سے ہر قسم کے ظلم و تشدد کا تختۂ مشق بننے کے باوجود اب بھی دنیائے اسلام کی سب سے بڑی اور جاندار اسلامی تحریک ہے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔ کاش مسلمان اپنے حقیقی محسنوں اور دشمنوں میں امتیاز کرنا سیکھیں۔

اپنے نامور بھائی کی طرح محمد قطب بھی اسلام اور جدید علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے جدید تہذیب کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور وہ اس کی خامیوں اور کوتاہیوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ نہ صرف جدید دور کے مسائل، نظریات اور نظاموں سے واقف ہیں بلکہ ان پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی صلاحیت سے بھی بدرجۂ اتم بہرہ ور ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کا اندازِ بیان بھی بڑا دلنشیں اور موثر ہے۔ اور ان کے اسلوب نگارش میں استدلال کا رنگ نمایاں ہے۔ اس کی ایک مثال یہ کتاب ہے جو اس وقت قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے اسلام کے بارے میں جدید ذہن میں پیدا ہونے والے شبہات کا مدلل اور سائنٹیفک جواب دیا ہے۔ اسے پڑھ کر اسلام کی شدید ضرورت کا احساس ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہی دنیا کے موجودہ مصائب اور دکھوں کا واحد علاج ہے۔

آخر میں میں اپنے ان تمام دوستوں اور بزرگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے تعاون اور مفید مشوروں کے بغیر اس ترجمہ کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ اس سلسلے میں جناب خلیل احمد حامدی میرے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔ آج سے دو سال قبل انہی کی ترغیب سے میں نے اس کتاب کو انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ یہ انگریزی ترجمہ کویت سے

کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ میں جناب ملک نصر اللہ خان صاحب عزیز کا بھی تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اپنی پیرانہ سالی اور مصروفیت کے باوجود انہوں نے ترجمے کے مسودہ پر نظر ثانی کی تکلیف کو بخوشی گوارا فرمایا۔ کتاب کی ظاہری اور صوری خوبیاں ملک ظفر اللہ صاحب اور اکرام غازی صاحب کی دلچسپی اور محبت کا نتیجہ ہیں۔ میں ان کا بھی ممنون ہوں۔ برادرم شریف کیانی اور عزیزم اختر علی علوی نے جس محبت اور خلوص کے ساتھ ترجمہ صاف کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا، اس کے لیے میں ان دونوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

محمد سلیم کیانی

دیباچہ اشاعتِ ششم

جن دِنوں مَیں یہ کتاب لکھ رہا تھا، اس وقت مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اس کی اتنی گرم جوشی سے پذیرائی ہوگی۔ جب اس کے کئی ایڈیشن یکے بعد دیگرے شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، تو میرا سَر جذبۂ شکر سے خدا کے حضور جُھک گیا۔ اور میرے دِل میں اِن قارئینِ کرام کے لیے احترام و امتنان کے جذبات مچلنے لگے، جنہوں نے اس محبّت اور گرم جوشی سے اس کتاب کو پذیرائی بخشی تھی۔

اس کے باوجود مَیں یہ سمجھتا تھا کہ اس کتاب کو آئندہ شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ میرے خیال میں ہمیں اپنی کوششیں مخالفینِ اسلام کی پھیلائی ہُوئی ان غلط فہمیوں اور شبہات کے ازالہ تک ہی محدود نہیں رکھنی چاہئیں جو وہ ہمیں پریشان کرنے اور منفی اندازِ دفاع اختیار کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً پھیلاتے رہتے ہیں، بلکہ ضرورت ہے کہ اب ہم زندگی کے مختلف دوائر میں اسلامی تعلیمات کے ایجابی پہلو کو اجاگر کریں اور اسلامی قانون کے ان پہلوؤں کو دُنیا کے سامنے نمایاں کریں جن سے زندگی میں اسلامی قانون کا مثبت اور نگراں کردار واضح ہوتا ہے۔ اس کتاب کے بعد شائع ہونے والی اپنی دوسری کتابوں[1] میں میرے پیشِ نظر یہی مقصد رہا ہے۔

---

[1] ان کتابوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں: الإنسان بين المادية والإسلام، في النفس و المجتمع، قبسات من الرّسول، معركة التقاليد، هل نحن مُسلمون؟ دراسات في النفس الانسانيه، التطور والثبات في حياة البشرية، منهج التربية الإسلامية، منهج الفن الإسلامي۔ (مترجم)

لیکن جب مشہور مستشرق مسٹر ولفریڈ کینٹویل اسمتھ (WILFREDCANTWILL SMITH) کی کتاب (ISLAM IN MODERN HISTORY) میری نظر سے گزری اور میں نے دیکھا کہ مصنف نے تین مختلف مقامات پر میری اس کتاب کے بارے میں اتنے تیز و تند اور توہین آمیز کلمات استعمال کیے ہیں کہ ان میں اور دشنام طرازی میں کوئی فرق نہیں رہ گیا، تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جس کتاب کے مندرجات نے متعصّب مسیحی کو اس قدر غضب ناک کیا ہے وہ ضرور اس قابل ہے کہ وہ بار بار شائع ہو اور پڑھی جائے۔

والحمد للہ اوّلاً و آخیراً ..... ومن اللہ التوفیق۔

محمّد قطب

دیباچہ اشاعتِ اوّل

جدید "تعلیم یافتہ" طبقے کی اکثریت شدید مذہبی بحران سے دوچار ہے۔ کیا مذہب فی الواقع انسانی زندگی کی کوئی حقیقت ہے؟ ممکن ہے ماضی میں ایسا ہو، مگر کیا آج بھی جب کہ سائنس نے حیاتِ انسانی کے دھارے کا رُخ بالکل بدل ڈالا ہے اور زندگی میں سوائے سائنسی حقائق کے اور کسی چیز کی گنجائش نہیں، یہ دعویٰ صحیح ہے؟ کیا مذہب، انسان کی فطری ضرورت ہے؟ یا یہ مختلف انسانوں کی محض مزاجی کیفیت کا اظہار ہے کہ کوئی اسے قبول کرتا ہے اور کوئی اس کا انکار۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مذہب کو ماننے یا نہ ماننے سے آدمی کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوتی؟ اور ہم انسان کی جن حالتوں کو "کفر" اور "ایمان" سے تعبیر کرتے ہیں ان میں حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق موجود نہیں ہے؟

یہ لوگ جب اسلام کے متعلق بات کرتے ہیں، تو اس میں بھی ان کے ذہن کی یہ بحرانی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے، نہ صرف روحانی پاکیزگی یا انسانی بھلائیوں کی تہذیب اور تنظیم تک محدود ہے، بلکہ ایک ہمہ گیر اور مربوط وحدت ہے جو اپنے اندر ایک عادلانہ نظامِ معیشت، متوازن معاشرتی نظام، دیوانی، فوجداری اور بین الاقوامی ضابطہ ہائے قانون، مخصوص فلسفۂ حیات اور تربیت جسمانی کا ایک نظام سمیٹے ہوئے ہے جو سب دراصل اس کے بنیادی عقیدہ اور اخلاقی اور روحانی مزاج ہی کے برگ و بار ہیں، تو ان حضرات کو سخت اُلجھن ہوتی ہے، کیونکہ بقول ان کے اسلام عرصہ ہوا اپنی ساری توانائی اور افادیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکا ہے، اسی لیے جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اسلام کسی مُردہ مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک زندہ و توانا اور پھلتا پھولتا نظامِ حیات ہے جس میں ایسے صحت مند عناصر شامل ہیں

جن کی مثال سوشلزم میں مل سکتی ہے اور نہ اشتراکیت اور کسی اَور نظام میں تو ان کے ضبط کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور وہ ہم سے پوچھتے ہیں؛ کیا تم یہ سب باتیں اس مذہب کے بارے میں کہہ رہے ہو جو غلامی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کو جائز قرار دیتا ہے؟ جو عورت کو نصف مَرد کے مساوی سمجھتا ہے؟ اور اسے گھر کی چار دیواری کے اندر قید کر کے رکھتا ہے؟ وہ مذہب جو سنگساری، قطع اعضاء اور کوڑوں کی وحشیانہ سزائیں دیتا ہے؟ جو اپنے پیرؤں کو خیرات پر زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے؟ اور انہیں مختلف طبقات میں بانٹ دیتا ہے تاکہ کچھ لوگ دوسروں کو اپنے استحصالِ بے جا کا نشانہ بنائے رکھیں؟ وہ نظامِ زندگی جو محنت کاروں کو عمدہ اور آرام کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دیتا؟ اور وہ اسلام جو ایسا اور ایسا ہے کیا تم یہ سب باتیں اسی اسلام کے متعلق کر رہے ہو؟ اس کا ترقی کرنا اور مستقبل میں نئی نئی کامرانیوں سے ہمکنار ہونا تو خیر دُور کی بات ہے، ہمیں تو اب اس کا وجود ہی سرے سے خطرے میں نظر آتا ہے — آج کی دُنیا میں جب کہ مختلف معاشرتی اور اقتصادی نظاموں کے درمیان نظریاتی کشمکش برپا ہے، اسلام جیسے فرسودہ مذہب کا پنپنا اور کامیاب ہونا خارج از بحث ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے آیئے ذرا ان "تعلیم یافتہ" متشککین کے حقیقی خدوخال پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ اور دیکھیں کہ ان کے شکوک و شبہات کا حقیقی منبع اور ماخذ کیا ہے؟ کیا ان کا یہ اندازِ فکر ان کی اپنی آزاد سوچ بچار کا نتیجہ ہے یا دوسروں کی اندھی تقلید کی پیداوار؟

واقعہ یہ ہے کہ جس قسم کے شکوک و شبہات یہ حضرات اسلام کے خلاف ظاہر کرتے ہیں وہ ان کی اپنی آزاد سوچ اور ذہن کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ دوسروں سے ماخوذ ہیں۔ ان کا اصل منبع معلوم کرنا ہو تو دَورِ جدید کی تاریخ پر نگاہ دَوڑا لیجیے۔

عہدِ وسطیٰ میں یورپ اور دُنیائے اسلام کے درمیان خوفناک صلیبی جنگیں ہوئیں۔ اس کے بعد ایک ایسا دَور آیا جب بظاہر دونوں میں صلح ہو گئی، مگر درحقیقت ان کے درمیان مستقل مفاہمت اور مصالحت کبھی نہیں ہوئی۔ وہ مستقل طور پر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہے؛ چنانچہ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں جب انگریزوں نے یروشلم پر قبضہ کیا، تو انگریز لارڈ ایلن بائی (ALLEN BY) نے علی الاعلان کہا: "آج صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ پچھلی دو صدیوں میں بالخصوص یورپی سامراج اور اسلامی دُنیا کے درمیان ایک مسلسل کشمکش برپا رہی ہے۔ توفیق پاشا کی غداری کی بدولت انگریزوں کو مصر میں اپنے قدم جمانے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس کی مدد سے انہوں نے اعرابی پاشا کی قیادت میں رونما ہونے والے ۱۸۸۲ء کے عوامی انقلاب کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد سے انگریزی پالیسی کا اصل الاصول یہ رہا ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے دُنیائے اسلام پر اپنی سامراجی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جائے اور ہر ممکن طریقے سے اسلامی تحریک اور شعور کو دبایا جائے تاکہ ان

گلیڈ اسٹون نے قرآنِ مجید کا ایک نسخہ ہاتھوں میں اُٹھا کر برطانوی دارالعوام کے ارکان کو بتایا: "مصریوں کے پاس جب تک یہ کتاب موجود ہے اس وقت تک ہمیں مصر میں امن اور چین سے رہنا نصیب نہیں ہو سکتا۔"

اسی لیے انگریزوں نے مُسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ اور منحرف کرنے کے لیے شعائر اسلامی کو تمسخر و استہزا کا نشانہ بنایا اور ان کے سامنے اسلام کی تاریک سے تاریک تصویر پیش کی تاکہ مصر پر ان کی سامراجی گرفت مضبوط رہے اور ان کے مذموم مقاصد پورے ہوتے رہیں۔

مصر میں انہوں نے جو تعلیمی پالیسی اختیار کی اس نے مُسلمان طلبہ کو حقیقی معنوں میں اپنے دین سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ یہاں تک کہ انگریزی سامراج کی قائم کردہ درس گاہوں سے تکمیلِ علوم کے بعد بھی وہ اسلام کی حقیقی رُوح سے ناآشنا رہتے تھے۔ ان درس گاہوں میں اسلام کے متعلق انہیں جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ قرآن خدا کی کتاب ہے جس کو محض حصولِ برکت و ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے اور اسلام انسان کو دوسرے مذاہب کی طرح اچھا انسان بننے اور اپنے اندر اخلاقی خوبیاں پیدا کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور ان کی طرح یہ بھی عبادات اور اوراد و وظائف، تصوّف اور کشف و کرامات کا مجموعہ ہے اور بس ــــ جہاں تک اسلام کے معاشرتی و اقتصادی نظام یا اس کے نظامِ حکومت اور اس کی بین الملّی اور بین الاقوامی پالیسی، اس کے نظامِ تعلیم و تربیت اور اس کی حیات بخش

اور حیات آفریں حیثیت کا تعلق تھا، طلبہ کو نہ صرف ان کے بارے میں اندھیرے میں رکھا جاتا تھا، بلکہ مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کے انہیں مسلسل انجکشن دیے جاتے تھے تاکہ ان کے ذہنوں کو پراگندہ کر کے انہیں اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بنایا جا سکے۔

سامراج کے وضع کردہ اس نظامِ تعلیم میں طلبہ کو صرف یہ سکھایا گیا کہ دنیا میں صالح ترین نظامِ حیات یورپ کا ہے۔ بہترین نظامِ معیشت یورپی مفکرین کی فکری کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اور دورِ جدید کے لیے موزوں ترین دستوری نظامِ حکومت وہ ہے جو اہلِ یورپ نے صدیوں کے تجربے کے بعد وضع کیا ہے۔ اس نے طلبہ کو یہ بھی ذہن نشین کرایا کہ انسان کو بنیادی حقوق سب سے پہلے انقلابِ فرانس نے دلوائے۔ جمہوریت اور جمہوری زندگی کی موجودہ ہر دلعزیزی اور فروغ تمام تر اہلِ انگلستان کے جمہوری کارناموں کا ثمرہ ہے اور تہذیب و تمدّن کی حقیقی بنیادیں رومن تہذیب و سلطنت کا عطیہ ہیں۔ الغرض اس نظامِ تعلیم نے یورپ اور اہلِ یورپ کا بڑا ہی پُرکشش اور مرعوب کُن تصور پیش کیا۔ اسے دیکھ کر یُوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا یورپ ایک سرکش، مگر عظیم قوت ہے جس پر کسی کو کوئی قابُو یا زور حاصل نہیں اور نہ اس کے عزائم کی تکمیل کی راہ میں کوئی طاقت حائل یا مزاحم ہو سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مشرق کو طلبہ کے سامنے ہمیشہ حقیر اور ذلیل بنا کر پیش کیا گیا۔ گویا یہ ناٹے قد کا ایک بونا ہے جس کی نہ صرف دیو قامت یورپ کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں، بلکہ اس کا وجود اور اس کی بقا سراسر اہلِ یورپ کی نظرِ کرم پر منحصر ہے۔ اس کی اپنی کوئی تہذیب یا ثقافت نہیں ہے اور جو ہے وہ اس قدر گھٹیا ہے کہ مشرق مغرب کے معاشرتی اور ثقافتی سرمائے سے اقدار کی خوشہ چینی پر مجبور ہے۔

سامراجیوں کی یہ سیاسی چالیں بالآخر رنگ لائیں اور مصری مسلمانوں کی جو نئی نسل اٹھی وہ قومی خودداری اور اپنی آزاد ثقافتی انفرادیت کے احساس اور خیال سے بالکل محروم تھی۔ ان کے دل اور دماغ پر یورپ اور اس کی تہذیب کا غلبہ تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے اور نہ اپنے ذہن سے آزادانہ طور پر سوچ سکتے تھے۔ ان کی نظر اور فکر دونوں کی پرواز محدود

اور اپنے یورپی آقاؤں کی مرضی اور مصلحتوں کے تابع تھی۔

اس تاریخی پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے، تو مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا وجود سامراجی طاقتوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں کا شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان کی سازشوں کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ مسلمان معاشرے میں اس طبقے کے افکار و نظریات سامراج کے حقیقی عزائم کے صحیح آئینہ دار ہیں۔

اسلام کے بارے میں ان بے چاروں کی معلومات ناقص اور اپنے مغربی اساتذہ سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح مذہب کے بارے میں ان کے خیالات بھی دراصل اہلِ یورپ کے اعتراضات و شبہات کی صدائے بازگشت ہیں؛ چنانچہ ان کی دیکھا دیکھی یہ لوگ بھی اسلام پر طرح طرح کے بے معنی اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ اسلام کا کاروبارِ سلطنت میں کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے اور کبھی سائنس اور اسلام کی مخاصمت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔

لیکن جہالت کا بُرا ہو، انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ یورپ جس مذہب کے خلاف بغاوت پر مجبور ہوا تھا وہ اسلام نہیں تھا، بلکہ اس سے بالکل مختلف نوعیت کا مذہب تھا۔ وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جن حالات و واقعات نے اہلِ یورپ کو اپنے مذہب سے بے زار اور برگشتہ کیا وہ صرف یورپ تک ہی محدود تھے اور دُنیا کے کسی اور خطّے میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ کم از کم اسلامی تاریخ تو اس طرح کے حالات و واقعات سے قطعاً ناآشنا ہے اور نہ آئندہ اس میں اس قسم کے واقعات کے رُونما ہونے کا کوئی امکان ہے، مگر یورپ کے یہ اندھے مقلد بغیر سوچے سمجھے اسلام کو اپنی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی سے خارج کرنے پر گویا ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام محض اس لیے متروک اور گردن زدنی ہے، کیونکہ اہلِ یورپ مذہب سے بے زار ہیں اور اپنے مذہب کو دیس نکالا دے چکے ہیں۔

یورپ میں مذہب اور سائنس کی چپقلش کا اصل باعث اہلِ کلیسا کی حماقت تھی جس کی وجہ سے انہوں نے سوچے سمجھے بغیر یونان سے ورثے میں ملنے والے بعض "سائنسی حقائق" کو اپنے مذہب کا جزو بنا کر انہیں تقدس کا رنگ دے دیا تھا۔ ان کے نزدیک ان کا انکار صداقت اور حقیقت کا انکار تھا؛ چنانچہ جب نظری اور تجرباتی طور پر سائنس نے اُن کے ان

مجوب نظریات کی خامی اور غلطی کو واشگاف کر دیا، تو بھی ان لوگوں کو عقل نہ آئی اور وہ بدستور اپنی غلطی پر مُصر رہے۔ اس صورتِ حال نے یورپ میں کلیسا اور اہلِ کلیسا دونوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچایا۔ کلیسا اور سائنس کی یہ کشمکش اس وقت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی اور لوگوں میں کلیسا کے مذہبی جبر و تشدد کے خلاف شدید ردِ عمل پیدا ہُوا اور اس سے نجات پانے کی خواہش انتہائی شدت پکڑ گئی جب کلیسا نے اپنے "خدائی اختیارات" کو انتہائی ظالمانہ طریقے سے اندھا دھند استعمال کرنا شروع کیا۔ اپنے اس طرزِ عمل سے اہلِ یورپ کے سامنے انہوں نے مذہب کا جو تصور پیش کیا' وہ انتہائی گھناؤنا اور تاریک تھا۔ ان کا مذہب ایک ایسا غول بیابانی تھا جو انسان کو دن کے وقت چین سے بیٹھنے دیتا تھا اور نہ رات کو کوئی اس کے شر سے محفوظ تھا۔ کلیسا مذہب کے نام پر عوام سے جو بھاری رقوم وصول کرتا رہتا تھا اس کی وجہ سے وہ عملاً اس کے غلام بن کر رہ گئے تھے۔ اہلِ کلیسا زمین پر اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ ان کی ہر بکواس اور خرافات کو بلا چون وچرا قبول کر لیں؛ چنانچہ جن سائنس دانوں نے ان کی کسی رائے سے اختلاف کیا انہیں ان لوگوں نے شدید ترین جسمانی اذیتوں میں مبتلا کیا اور معمولی معمولی باتوں پر انہیں زندہ آگ میں جلا دیا۔ اس کی ایک مثال وہ سائنس دان تھے جو زمین کے گول ہونے کے قائل تھے۔

بہر حال کلیسا کے ان مکروہ مظالم اور جرائم نے یورپ کے تمام سوچنے سمجھنے والے' آزاد اور باضمیر افراد کو مضطرب کر دیا اور انہوں نے یہ تہیّہ کر لیا کہ اس عفریت کا ڈٹ کر مقابلہ کریں تاکہ یا تو یہ بالکل ختم ہو جائے یا اس حد تک بے اثر ہو جائے کہ آئندہ کبھی لوگوں کو ستا اور پریشان نہ کر سکے اور نہ دُنیا میں اپنی غلط مثال سے یہ گمراہ کُن تاثر پھیلا سکے کہ مذہب نام ہی جھوٹ اور فریب کا ہے!

لیکن کیا ہم مُسلمانوں اور اسلام کے درمیان تعلق کی نوعیت وہی ہے جو اہلِ یورپ اور کلیسا کے تعلق کی تھی؟ اگر نہیں' تو پھر اسلام اور سائنس کی مخاصمت کے بارے میں یہ سارا ہنگامہ کیوں ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور سائنس کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے اور ابھی تک کوئی بھی ایسی سائنسی حقیقت منظرِ عام پر آئی ہے جس سے نظریۂ اسلام کا ابطال

لازم آتا ہو۔ اسلام کے طویل دَورِ حکومت میں کوئی ایسا وقت نہیں گزرا جب سائنسدانوں کو مظالم اور وحشیانہ سزاؤں کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ آج اسلام کی ساری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں طب، فلکیات، ریاضیات، طبیعیات اور کیمیا کے بڑے بڑے ماہرین ہو گزرے ہیں، لیکن کوئی ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو محض اس کے نظریات کی بدولت ظلم اور تشدّد کا نشانہ بننا پڑا۔ ان مسلمان سائنسدانوں میں سے کسی نے بھی اسلام اور سائنس کے درمیان کوئی بُعد یا تضاد نہیں محسوس کیا۔ اسی طرح مُسلمان حُکمرانوں نے اہلِ کلیسا کی طرح سائنس والوں کو کبھی اپنا حریف نہیں سمجھا؛ چنانچہ اسلام کی تاریخ میں نہ کسی سائنسدان کو آگ میں جلایا گیا اور نہ اسے قید و بند کی اذیتیں دی گئیں۔

مگر اس کے باوجود کچھ لوگ اسلام اور سائنس کو ایک دوسرے کے خلاف "ثابت" کرنے پر گویا تُلے ہُوئے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کا علم حاصل کیے بغیر اس میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ سب باتیں دراصل اس زہرِ ہلاہل کی محض ظاہری علامات ہیں جو سامراجیوں نے ان کے رگ و پے میں اتار دیا ہے، مگر وہ ہیں کہ انہیں اب تک اس کا کوئی احساس تک نہیں۔

موجودہ کتاب کے اصل مخاطب یہ لوگ نہیں ہیں، کیونکہ میرے خیال میں ان سے کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ ان کے راہِ راست پر آنے کے لیے ہمیں اس ساعتِ سعید کا انتظار کرنا چاہیے جب ان کے مغربی آقا اور ولی نعمت اپنی بے خدا مادی تہذیب سے بالکل مایوس ہو کر ایک ایسے نظامِ حیات کے لیے تشنگی محسوس کریں جو زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہو اور رُوح اور مادہ، ایمان اور عمل سب کے بارے میں رہنمائی دیتا ہو۔ اس وقت ممکن ہے ان کی دیکھا دیکھی یہ لوگ بھی راہِ راست پر آجائیں۔

اس کتاب میں میرا خطاب مخلص اور روشن ضمیر نوجوانوں کے اس گروہ سے ہے جو سنجیدگی سے حقیقت اور صداقت کا متلاشی ہے، مگر عیّار سامراجی طاقتوں کی سازشیں اور جھوٹا پروپیگنڈا اس کی راہ میں حائل ہے۔ سفید سامراج اور اشتراکی فتنہ باز دونوں میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ وہ اسلام کی حقیقی رُوح سے کما حقہٗ آگاہ ہوں اور اس راہ کو پاسکیں

جو آزادی، عزّت اور عظمت کی واحد راہ ہے۔ میں ان نوجوان دوستوں کی خدمت میں اپنی یہ کتاب پیش کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ یہ اسلام کے بارے میں ان کے شکوک و شبہات کو دُور کرنے میں مفید ثابت ہو۔ آمین۔

محمّد قطب

کیا اب اسلام کی ضرورت نہیں رہی؟

جدید سائنس کی حیرت انگیز کامیابیوں نے اہلِ مغرب کو کچھ اس طرح مسحور کیا ہے کہ ان میں اب یہ خیال عام ہے کہ سائنس نے مذہب کو ہمیشہ کے لیے پسپا کر دیا ہے کیونکہ اسکی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ معروف ماہرینِ نفسیات و عمرانیات میں سے تقریباً سبھی نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور یورپی ماہر نفسیات فرائڈ نے احیائے دین کی کوششوں کا مذاق اُڑاتے ہُوئے لکھا: "انسانی زندگی تین واضح نفسیاتی اَدوار میں سے گزرتی ہے: دَورِ وحشت، دَورِ مذہب اور دَورِ سائنس — اب سائنس کا دَور ہے، لہٰذا مذہب کی باتوں میں اب کوئی معنویت نہیں۔ وہ فرسودہ ہو چکا اور اپنی تمام قدر و قیمت کھو چکا ہے۔"

مذہب دُشمنی کی اصل وجہ

اس سے پہلے ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں کہ مذہب کے متعلق یورپی سائنسدانوں کے مخالفانہ طرزِ عمل کی اصل وجہ وہ کشمکش تھی، جو یورپی کلیسا کے خلاف انہیں پیش آئی تھی۔ اس کشمکش میں اہلِ کلیسا نے جس کردار کا مظاہرہ کیا، اس کو دیکھ کر یہ لوگ بجا طور پر یہ سمجھنے لگے کہ مذہب رجعت پسندی، بربریت، تاریک خیالی اور بے معنی افکار و اعمال کا مجموعہ ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے اس کا قصہ تمام کر دیا جائے اور سائنس کو آگے بڑھایا جائے تاکہ اس کی رہنمائی میں انسانیت اور تہذیب کا ارتقاء جاری رہ سکے۔

۔یورپ کے اندھے مقلد

یہ تھی مذہب سے یورپی سائنسدانوں کی مخاصمت کی اصل وجہ، مگر مذہب کے بعض "مسلمان" مخالفین نہ اس اصل وجہ کو سمجھتے ہیں اور نہ مشرق اور مغرب کے حالات کے فرق ہی کو ملحوظ رکھتے ہیں اور مذہب کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ ان کی مخالفت کسی گہری سوچ بچار کا نتیجہ نہیں، بلکہ یورپ کی اندھی تقلید کی پیداوار ہے۔ ان کے نزدیک ترقی وکمال کی واحد راہ وہی ہے جس پر یورپ کی اقوام غالب گامزن ہیں۔ انہوں نے مذہب سے پیچھا چھڑا لیا ہے، اس لیے ہمیں بھی مذہب کی پیروی ترک کر دینی چاہیے ورنہ لوگ ہمیں وحشی اور رجعت پسند ہونے کا طعنہ دیں گے۔

بدقسمتی سے یہ حضرات بھول جاتے ہیں کہ یورپ کے علما میں بھی مذہب دشمنی کے متعلق نہ پہلے کبھی مکمل اتفاق رائے موجود تھا اور نہ اب موجود ہے، بلکہ بعض چوٹی کے علمائے یورپ، جو الحادی تہذیب سے بیزار ہیں، اس حقیقت کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ مذہب انسان کی ناگزیر نفسیاتی اور عقلی ضرورت ہے۔

علمائے یورپ کی شہادت

ان علما میں ممتاز ترین نام مشہور ماہر فلکیات جیمز جینز (JAMES JEANS) کا ہے۔ جیمز نے زندگی کا آغاز ایک ملحد اور تشکیک زدہ نوجوان کی حیثیت سے کیا، مگر اپنی سائنسی تحقیقات کے بعد وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ مذہب انسانی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے، کیونکہ خدا پر ایمان لائے بغیر سائنس کے بنیادی مسائل حل ہی نہیں کیے جا سکتے۔ مشہور ماہر عمرانیات (JEANS BRIDGE) تو مذہب کی حمایت میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے مادیت اور روحانیت کے امتزاج سے عقیدہ وعمل کے ایک متوازن نظام کی تشکیل پر دل کھول کر اسلام کی تعریف کی۔ انگلستان کے مشہور ادیب سمرسٹ ماہم (SOMERSET MAUGHAM) نے مذہب کے

بارے میں جدید یورپ کے منفی رویّے کو ان الفاظ میں بیان کیا "یورپ نے اپنے لیے ایک نیا خدا ——— سائنس ——— دریافت کر لیا ہے اور پُرانے خدا سے مُنہ موڑ لیا ہے۔"

یورپ کا نیا خدا

مگر یورپ کا یہ نیا خدا انتہائی متلوّن نکلا ہے۔ یہ ہر لحظہ تغیّر کی زد میں ہے اور اس کا مؤقف مستقلاً تبدیلی کا شکار۔ ایک چیز کو وہ آج حقیقت کہتا ہے اور کل کو اسے جھوٹ، فریب اور باطل قرار دینے لگتا ہے۔ تبدیلی کا یہ چکّر یونہی چلتا رہتا ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور اس کے پجاری بھی دائمی اضطراب اور پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں، اس طرح کے متلوّن اور ہر آن بدلتے خدا کے زیرِ سایہ وہ آخر اور کس چیز کی توقع کر سکتے ہیں؟ جدید مغربی دُنیا پر آج بے چینی اور اضطراب کے جو بادل چھائے ہیں اور جس طرح وہ گوناگوں نفسیاتی اور اعصابی عوارض میں مبتلا ہے، وہ اس کے اصل روحانی مرض کی محض ظاہری علامات ہیں۔

سائنس کی نئی دُنیا

سائنس کو خدائی کے منصب پر بٹھا دینے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہ دُنیا جس میں ہم آپ رہ رہے ہیں کسی واضح مقصدیت اور معنویت سے یکسر محروم ہو گئی ہے۔ اس کا نہ تو کوئی اعلیٰ مفہوم ہے، نہ نظام اور نہ کوئی اعلیٰ ہستی یا طاقت ہی یہاں ایسی موجود ہے جو دُنیا کی رہنمائی کر سکے۔ یہاں پر متضاد قوّتوں کے درمیان ایک دائمی کشمکش بپا ہے۔ یہاں کی ہر شئے تغیّر کی شکار ہے۔ اقتصادی اور سیاسی نظام ہوں یا حکومت اور افراد کے درمیان تعلقات، یہاں کی ہر چیز بدل جاتی ہے، حتّٰی کہ سائنسی حقائق بھی بدل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تاریک اور بھیانک دُنیا میں انسان کو سوائے دائمی اضطراب اور پریشانی کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، خصوصاً جبکہ اس کی فضائیں کسی بالاتر ہستی کے تصوّر سے بھی نا آشنا ہوں کہ جب زندگی کی بے رحم کشاکش سے وہ گھبرائے تو اس کے دامن

میں پناہ لے، حوصلہ اور اطمینان پاسکے۔

امن کی واحد راہ

مذہب اور صرف مذہب ہی دُنیا کو کھوئے ہُوئے امن وسلامتی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ وہ انسان کے دِل میں سچائی سے محبّت پیدا کر کے اس کو بدی اور استبداد کے سامنے ڈٹ جانے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور اس کو بتاتا ہے کہ اگر وہ اپنے ربّ اور آقائے حقیقی کی خوشنودی کا طالب ہے، تو اس کو بُرائی کے غلبے اور اقتدار کے بُت کو پاش پاش کر کے زمین پر صرف اپنے رب کی حکومت قائم کرنی چاہیے۔ اس راہ میں ہر طرح کی مشکلات اور مصائب کو صبر و استقامت سے برداشت کرنا چاہیے اور صرف آخرت کے اجر پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ پھر کیا آج کی دُنیا کو امن کی سلامتی کی اور اطمینان وسکون کی اور دوسرے لفظوں میں مذہب کی ضرورت نہیں ہے؟

مذہب کے بغیر

مذہب کے بغیر زندگی میں کوئی معنویت سِرے سے باقی ہی نہیں رہتی۔ مذہب کی بُنیادی خصوصیت آخرت کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کے بعد کرۂ ارض پر انسان کی زندگی نئی وسعتوں کا دامن چھُونے لگتی ہے اور انسان کے سامنے امکانات کے نئے نئے افق اُبھرنے لگتے ہیں کہ وہ اگر نہ ہوں، تو انسان ہیچ میرزی کے اذیت ناک احساس کا شکار ہو جائے۔ حیات بعد موت کے انکار کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی مجموعی عمر میں سے ایک معتدبہ حصّہ حذف کر دیا جائے اور اُسے اپنی اندھی بہری خواہشات اور توہمات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد انسان اپنی خواہشاتِ نفس کی آسودگی میں گم ہو جاتا ہے اور اس کی کوششوں کا ہدف صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ جتنی مسرتیں وہ سمیٹ سکتا ہے سمیٹ لے، اور کسی کو ان میں شریک نہ کرے۔ یہیں سے رقابتیں اور وحشیانہ جنگیں جنم لیتی ہیں، کیونکہ خواہشات کے بندوں کی اس دُنیا میں ہر کوئی اپنے سامنے پھیلے ہُوئے

خوانِ یغما پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنا چاہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ فائدے کم سے کم وقت میں خود سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ اس کے دِل میں کسی بالاتر ہستی کا خوف نہیں ہوتا، کیونکہ اس دُنیا کا نہ کوئی خدا ہوتا ہے اور نہ کوئی نظام عدل و انتقام۔

کم نگاہی اور دُوں ہمّتی

آخرت سے انکار کے باعث انسان جذبات اور افکار کی پست سطح پر گر جاتا ہے۔ اس کا تخیّل بلند پروازی سے محروم اور اس کے مقاصد اور طریقے دون ہمتی اور کم نگاہی کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ انسانیت دائمی خانہ جنگی کا اکھاڑہ بن جاتی ہے اور پھر اس کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اعلیٰ مقاصدِ حیات کے لیے تگ و دَو کر سکے۔ اس نئی دُنیا میں محبت اور ہمدردی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ مادی لذات کی طلب اور خواہشات کی بالادستی انسان کو اس قابل ہی نہیں رہنے دیتی کہ وہ اعلیٰ اقدارِ حیات اور شریفانہ جذبات کی قدر کر سکے۔

مادہ پرستی کا نتیجہ

بلاشبہ مادہ پرست انسان کو کچھ مادی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں مگر مادہ پرستی ایک ایسی لعنت ہے کہ اس کی وجہ سے یہ ظاہری فائدے بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ انسان ان کی محبت میں اندھا ہو کر اپنے ہی ابنائے نوع سے مستقل طور پر برسرِ پیکار رہتا ہے۔ حرص و ہوس، خواہشاتِ نفس اور نفرت کے تیز و تُند جذبات پر اسے کوئی قابو نہیں رہتا اور وہ کبھی ان کے غلبے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

جو قومیں مادہ پرستی کی روش پر چل نکلتی ہیں ان پر ایک مستقل آویزش اور خانہ جنگی کی حالت طاری رہتی ہے جس کے نتیجے میں زندگی کا تمام نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور سائنس اور اس کے ہیبت ناک ہتھیار نسلِ آدم کی خدمت کے بجائے اس کی تباہی و بربادی میں صرف ہونے لگتے ہیں۔

علاجِ تنگیٔ داماں

مادہ پرستی انسان کی تنگ نظری کا شاخسانہ ہے۔ اس کی خرابیوں سے بچنے کے لیے انسانیت کے ذہنی افق کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مقصد صرف مذہب ہی کے ذریعے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ صرف وہی انسانیت کو نئی وسعتوں اور نئی بلندیوں سے ہمکنار کر سکتا ہے، کیونکہ مذہب کی نگاہ میں زندگی صرف اسی دُنیا تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد بھی اس کا سلسلہ تا ابد جاری و قائم رہتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کے دل میں امید کے نئے چراغ روشن کرتا ہے۔ اسے بدی، جبر و استبداد اور ظلم کے خلاف پامردی سے نبرد آزمائی کا حوصلہ دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ سارے انسان اس کے بھائی ہیں۔ محبت، باہمی ہمدردی اور عالمگیر اخوت کی یہ تعلیم ہی انسانیت کو امن و سکون اور حقیقی خوشحالی اور ترقی سے مالا مال کر سکتی ہے۔ ان حقائق کے ہوتے ہُوئے کون کہہ سکتا ہے کہ مذہب انسان کی ناگزیر ضرورت نہیں ہے یا انسان آج بھی اسی طرح اس کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ صدیوں پہلے تھا۔ کارزارِ حیات کے لیے مذہب جس طرح انسان کو تیار کرتا ہے، اس طرح کوئی اور طاقت انسان کو تیار نہیں کر سکتی۔

روشنی کے مینار

مذہب انسان کو اپنے لیے جینے کے بجائے دوسروں کے لیے جینا سکھاتا ہے۔ اُسے ایک اعلیٰ اور پاکیزہ نصب العین دیتا ہے اور اس نصب العین کے لیے مصائب و آلام کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا سکھاتا ہے۔ اگر انسان مذہب کے بخشے ہُوئے اس ایمان و ایقان سے محروم ہو جائے، تو پھر وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس کی ساری زندگی خود غرضی اور خود پرستی کا مرقع بن جاتی ہے اور اس میں اور وحشی درندوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ تاریخ میں ایسے بے شمار انسان گزرے ہیں جو عمر بھر حق و صداقت کی خاطر سینہ سپر رہے اور اپنی جانِ عزیز تک اس کے لیے قربان کر دی۔ انہیں اپنی سعی و جہد

اور قربانیوں کا کوئی ثمرہ اس دُنیا میں نہ مِلا۔ سوال یہ ہے کہ آخر کس چیز نے ان لوگوں کو ایک ایسی لڑائی مول لینے پہ آمادہ کیا، جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ انہیں کوئی مادی کامیابی حاصل نہ ہوئی، بلکہ جو کچھ ان کے پاس تھا، اس لڑائی کے بعد وہ بھی ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا؟ اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ ہے ایمان! ان پاکیزہ نفوس انسانی کا وجود اسی ایمان کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ اس کے برعکس حرص و ہوس، بغض و کینہ، خود غرضی اور نفرت ایسے گھٹیا محرکات ہیں کہ ان کے ذریعے کوئی حقیقی اور پائیدار کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان کی چمک دمک ظاہری اور عارضی ہوتی ہے۔ ان کے زیرِ اثر انسان فوری جلبِ منفعت چاہتا ہے جس کے باعث انسان میں کبھی صحت مند کردار نہیں اُبھر سکتا اور نہ اس میں کسی اعلیٰ نصب العین کی خاطر جہان کو تج کر صبر و استقامت سے ایک طویل عرصہ تک مسلسل جہاد کا جذبہ پر وان چڑھ سکتا ہے۔

نفرت کے پجاری

ہمیں معلوم ہے کہ بعض نام نہاد مصلحین محبّت کے بجائے نفرت کے ذریعے دُنیا کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ نفرت ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اسی سے وہ قوّت اور غذا حاصل کرتے ہیں اور اسی کے سہارے مصائب و آلام کے ہجوم میں جرأت اور استقلال سے اپنی "اصلاحی مہم" جاری رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی نفرت کا ہدف نسلِ انسانی کا کوئی خاص گروہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بحیثیتِ مجموعی سارے بنی نوع انسان یا وہ مخصوص دورِ تاریخ اس کا نشانہ ہو، جس میں نفرت کے یہ پجاری آنکھیں کھولتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ انسانیت سے بیزار "مصلحین" کا یہ گروہ بظاہر اپنے بعض مقاصد حاصل کر لے۔ نفرت کے جوش، اس کے آتشیں مزاج اور بالطبع ظلم و ستم کا خوگر ہونے کے باعث یہ لوگ اپنے مقصد کی خاطر ثابت قدمی بھی دکھا سکتے ہیں اور ہر طرح کی محرومیاں بھی گوارا کر سکتے ہیں مگر جس عقیدے کی اساس محبّت کے بجائے نفرت پہ ہو، اس سے انسانیت کو کبھی خیر اور فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس سے معاشرے کی بعض رائج بُرائیوں اور موجودہ بے انصافیوں

کا تو بلاشبہ کسی حد تک تدارک ہو جاتا ہے، مگر اس کا دامن انسانیت کے ان عوارض کے کسی ٹھوس علاج سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اصلاحی تدابیر جو معاشرے کی موجودہ خرابیوں کے علاج کے نام پر اختیار کی جاتی ہیں، انہیں گھٹانے اور ان پر قابو پانے کے بجائے اُلٹا انہیں کئی گنا اور زیادہ بڑھا دیتی ہیں اور وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ع

مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی

عقیدۂ آخرت کا ایک اہم پہلو

اس کے برعکس جس عقیدے میں فوری مادی منفعت مطلوب نہیں ہوتی نہ محض بغض و عداوت اس کی پیدائش کا محرک ہوتی ہے اور جو انسانوں میں محبّت، اخوت اور ایثار، حتیٰ کہ اپنے ابنائے نوع کی خاطر نقد جاں تک پیش کرنے کے جذبات پیدا کرتا ہے، درحقیقت وہی عقیدہ انسانیت کو حقیقی اور پائیدار نعمتوں سے مالا مال کر سکتا ہے اور مستقبل کی خوشحالی اور ارتقاء کا سہارا بن سکتا ہے۔ اس عقیدے کا جوہر خدا پر ایمان اور اس کی محبّت ہوتی ہے جو انفرادی زندگی کو پاکیزگی بخشتی اور افراد کو اپنے خالق کا قُرب عطا کرتی ہے، مگر آخرت پر ایمان کے بغیر خدا پر ایمان یا اس سے محبّت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آخرت کا خیال انسان کو ایک طرح کا احساسِ تحفظ بخشتا ہے، اسے حیاتِ دوام کی نوید سُناتا ہے۔ اس کے بعد انسان کو اس یقین کی ضمانت مِل جاتی ہے کہ اپنی جسمانی موت کے ساتھ وہ نیست و نابود نہیں ہو جائے گا۔ نہ کارزارِ حیات میں اس کا جہادِ مسلسل بے ثمر رہے گا، بلکہ اگر اس کو اس کا صِلہ اس دُنیا میں نہ مِلا، تو آنے والی زندگی میں تو بہر حال مِل کے رہے گا۔

یہ ہیں وہ ثمرات جو مجرد خدا اور آخرت پر ایمان کے درخت سے پیدا ہوتے ہیں، مگر اسلام صرف انہی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ان کے علاوہ اَور بھی بہت کچھ ہمیں عطا کرتا ہے۔ اس کی داستان باقی داستانوں سے مختلف اور کہیں زیادہ حسین و دِلکش ہے!

اسلام کے بارے میں ایک غلط فہمی

جو لوگ اسلام کو قصۂ ماضی سمجھتے ہیں اور موجودہ زمانے میں اس کی افادیت اور ضرورت کے منکر ہیں، وہ دراصل نہ تو اسلام کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہیں اور نہ زندگی میں اس کے اصل مشن سے واقف۔ بچپن میں سامراج کے ایجنٹوں نے درسی کتابوں میں انہیں جو کچھ سکھایا تھا، وہ اب تک اسی آموختہ کو دُہراتے چلے آتے ہیں، ان کے خیال میں اسلام کی آمد کا مقصد انسان کو بُت پرستی سے نجات دلانا تھا، ایک دوسرے کے دشمن عرب قبائل کو ملا کر ایک برادری بنانا تھا، انہیں شراب نوشی، قمار بازی، دختر کشی اور اسی طرح کی اور بہت سی اخلاقی خرابیوں سے پاک کرنا تھا؛ چنانچہ اسلام نے عربوں کی خانہ جنگی کو ختم کر کے ان کی قوّت کو ضائع ہونے سے بچا لیا اور پھر اس قوّت کو دنیا میں اپنے پیغام کی اشاعت کی خاطر استعمال کیا۔ مسلمانوں کو اس غرض کے لیے دوسری قوموں سے بہت سی لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں جس کے نتیجے میں دُنیائے اسلام اپنی موجودہ سرحدوں اور حد بندیوں کے ساتھ عالمی نقشہ پر نمودار ہوئی۔ یہ ایک تاریخی مشن تھا جو اب پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ دُنیا سے بُت پرستی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ عرب قبائل بڑی بڑی قوموں کی صورت اختیار کر چکے ہیں، اس لیے اب اسلام کی کوئی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ جہاں تک قمار بازی اور مے خواری کا تعلق ہے، ان پر ترقّی و تہذیب کے موجودہ دَور میں کوئی قدغن عائد نہیں کی جا سکتی۔ الغرض ان لوگوں کے نزدیک اسلام ایک مخصوص دَور کے لیے نہایت موزوں نظامِ زندگی تھا، مگر اب دُنیا اتنی آگے جا چکی ہے کہ اس کی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس لیے رہنمائی اور روشنی کے لیے اب ہمیں اس کی جانب نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ جدید نظریات اور فلسفہ ہائے حیات سے یہ روشنی اور ہدایت مستعار لینی چاہیے۔ اسی میں ہماری نجات اور فلاح پوشیدہ ہے۔

مغرب کے یہ مشرقی شاگرد اس طرح اپنے استاد کے رٹے رٹائے جملے دُہرا کر غیر شعوری طور پر اپنی کم نظری اور بے خبری کا پردہ فاش کر دیتے ہیں۔ یہ بیچارے نہ اسلام کو جانتے

ہیں اور نہ زندگی میں اس کے حقیقی مقصد سے باخبر ہیں' اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلام کے مفہوم اور اس کی دعوت وپیغام پر گفتگو کی جائے۔

اسلام کا انقلابی مفہوم

ایک جملے میں بات کو بیان کرنا چاہیں' تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام غلامی کی ہر اس نوع سے آزادی کا نام ہے جو ارتقائے انسانیت میں رکاوٹ بنتی ہے اور اس کو نیکی اور بھلائی کی راہ سے روکتی ہے۔ یہ آزادی کا پیغام ہے' جبر واستبداد سے اور آمرِ مطلق سے جو انسانوں کے جان ومال' آبرو' عزتِ نفس اور خوداعتمادی سب کچھ لوٹ لے جاتے ہیں۔ اسلام انسان کو سکھاتا ہے کہ اقتدار کا حقیقی مالک خدا اور صرف خدا ہے۔ وہی انسانوں کا حقیقی فرمانروا ہے۔ سارے انسان اس کی پیدائشی رعایا ہیں۔ وہی انسانوں کی تقدیر کا مالک ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر نہ کوئی کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ کوئی مصیبت یا تکلیف دور کر سکتا ہے۔ قیامت کے روز اگلے پچھلے سارے انسان اس کے حضور جمع کیے جائیں گے اور وہ ان میں سے ہر ایک کے کارنامہ حیات کا حساب لے گا۔ اسلام کی یہ تعلیم انسان کو خوف' ظلم' بے انصافی اور دوسرے انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے نجات دلاتی ہے۔

خواہشاتِ نفس سے آزادی

یہی نہیں' بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر اسلام انسان کو خواہشات وشہوات کی غلامی سے بھی آزاد کرتا ہے حتیٰ کہ خود زندگی کی خواہش سے بھی اس کو بے نیاز بنا دیتا ہے۔ "حُبِّ جاں" کی یہی انسانی کمزوری ہے جس سے مستبد حکمران ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھاتے اور دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بناتے رہے ہیں۔ اگر انسان میں یہ کمزوری نہ ہوتی' تو وہ کبھی کسی کی غلامی پر راضی نہ ہوتا اور نہ دیو استبداد کو یوں رقصِ ابلیسی کی اجازت دیتا۔ جبر واستبداد کے سامنے سرافگندگی کے بجائے پامردی سے اس کا مقابلہ کرنے کی تعلیم دے کر اسلام نے انسانیت پر عظیم احسان کیا ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ
وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ
وَاَزْوَاجُكُمْ
وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ
اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ
تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ
فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا
حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۹:۲۴)

اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ
اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور
تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال
جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ
کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو
خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم
کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے
رسول اور اُس راہ میں جدوجہد
سے عزیز تر ہیں، تو انتظار کرو یہاں
تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے
سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں
کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

زندگی کی اصل قوّت

اسلام اللہ کی محبت کو جو ہمدردی، نیکی، صداقت اور اللہ کی راہ میں یعنی زندگی کے تمام اعلیٰ اور پاکیزہ مقاصد کے لیے جہاد سے عبارت ہے، شہوات اور خواہشات نفس کے مقابلے پر لے آتا ہے اور انہیں اس کے تابع بنا کر رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اندھی بہری خواہشات کے مُنہ زور گھوڑے کو وہ خدا کی محبت سے قابو میں لانا سکھاتا ہے اور زندگی میں صرف خدا کی محبّت کو قدرِ غالب اور اصل کارفرما قوّت کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے۔ جو اس دولت سے محروم ہو وہ مُسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔

دُنیا پرستوں کی غلط فہمی

ممکن ہے حرص وہوس اور خواہشات کا کوئی پرستار اپنی غلط بینی کے باعث

یہ گمان کرے کہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اس کی زندگی زیادہ کامیاب اور مسرتوں سے لبریز ہے، لیکن اپنی اس کوتاہی کی سزا اسے بہت جلد بھگتنا پڑتی ہے۔ جب وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا ہے، تو اپنے آپ کو خواہشاتِ نفس کا بے بس غلام پاتا ہے جس کی تقدیر میں محرومی و شقاوت اور اضطراب و بے بسی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ اگر انسان ایک بار اپنی خواہشاتِ نفس کے سامنے ہتھیار ڈال دے، تو وہ پھر کبھی انہیں اپنے قابو میں نہیں لا سکتا، بلکہ ان کی خودسری جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے ان کی پیاس میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح انسان حیوانیت کی پست ترین سطح پر گر جاتے ہیں اور لذّت پرستی میں اس طرح غرق ہو جاتے ہیں کہ انہیں کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل کے بارے میں اس طرح کا رویّہ انسانیت کو کسی مادی یا رُوحانی ترقّی سے ہمکنار نہیں کر سکتا۔ ترقّی مادی ہو یا رُوحانی، اس کے لیے انسان کا اپنی خواہشاتِ نفس کی غلامی سے آزاد ہونا پہلی شرط ہے۔ اس کے بعد ہی سائنس، آرٹ اور مذہب کے میدانوں میں کوئی ترقّی ممکن ہوتی ہے۔

دُنیا کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر

اسلام نے خواہشاتِ نفس کی غلامی سے آزادی پر اسی لیے بہت زور دیا ہے مگر اس غرض سے وہ اپنے پیروؤں کو نہ تو رہبانیت اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ان کو اچھی اور پاکیزہ چیزوں سے متمتع ہونے سے روکتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کو چھوڑ کر وہ بیچ کی راہِ اعتدال اختیار کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں اس دُنیا میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہ سب انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اسلام انسان کو بتاتا ہے کہ "جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے"۔ اسی لیے لذت پرستی اور خواہشات کی غلامی کو وہ انسان کے مقام سے فروتر سمجھتا ہے۔ دُنیا کا یہ سروسامان انسان کو صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنے بلند مقصدِ تخلیق کو پا سکے۔ انسان کا مقصدِ حیات خدا کے دین کی تبلیغ و ابلاغ ہے اور انسانیت کی تکمیل کی واحد راہ یہی ہے۔

اسلام کے دو نمایاں مقاصد

زندگی میں اسلام کے پیشِ نظر دو اہم اور نمایاں مقاصد ہیں؛ انفرادی زندگی کے دائرے میں وہ ہر فرد کو اتنا کچھ سروسامانِ حیات فراہم کر دینا چاہتا ہے کہ جس کی مدد سے وہ صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گزار سکے اور اجتماعی دائرۂ حیات میں اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجائے جس کی ساری توانائیاں انسانیت کی مجموعی ترقی میں صرف ہوں اور قافلۂ تہذیب اسلام کے نظریۂ حیات کی روشنی میں رواں دواں رہے اور اجزا اور مجموعہ' فرد اور اجتماع کے مابین توازن قائم ہو تاکہ ان میں سے کسی کے حقوق پامال نہ ہوں۔

فکرِ انسانی کی آزادی

انسانی فکر کو آزادی بخشنے میں اسلام کو ایک اہم اور مؤثر قوت کی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام توہمات و خرافات کا ہمیشہ سے شدید ترین مخالف رہا ہے۔ تاریخ میں انسانیت فکر و عمل کی جن مختلف ضلالتوں اور کج رویوں سے دوچار ہوتی رہی ہے' ان میں سے بعض تو انسانوں کے زرخیز تخیل کی پیداوار تھیں اور اس دور کے انسان ان کی اس حیثیت سے بخوبی واقف بھی تھے' لیکن گمراہی کے کچھ سلسلے ایسے بھی موجود تھے' جن کا شجرۂ نسب انسان اپنے خودساختہ دیوتاؤں کی حماقتوں کی نسل سے ملاتے تھے۔ القصہ اسلام کی آمد سے پیشتر فکرِ انسانی یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ اسلام نے آکر اسے بلوغت اور پختگی عطا کی اور ان تمام توہمات و خرافات سے اس کو آزاد کیا' جو اس کی آمد سے پہلے خودساختہ دیومالا' اسرائیلیات اور عیسائیت کے نیم پختہ اور غلط نظریات و افکار کی صورت میں دنیا میں پائے جاتے تھے اور اسے ایک بار پھر اپنے حقیقی دین اور اپنے حقیقی آقا کی بارگاہ میں لا کھڑا کیا۔

اسلام اور سائنسی تحقیقات

اسلام کا ایک اور امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کی زبان اور تعلیم بہت سیدھی سادی اور آسان ہے۔ اس میں کوئی اشکال اور کوئی ایچ پیچ نہیں۔ نہ اس کا سمجھنا مشکل ہے، اور نہ اس کا شعور اور اس پر ایمان وایقان دشوار۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان کو جو صلاحیتیں دی گئی ہیں، وہ ان کا بھرپور استعمال کرکے اپنے گردوپیش پھیلی ہوئی حیات وکائنات کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے اور قدرت کے سربستہ راز معلوم کرے، کیونکہ اسلام عقل انسانی اور مذہب یا بالفاظ دیگر سائنس اور مذہب کے مابین کسی ناقابلِ مصالحت اور جوہری مخاصمت کا قائل نہیں ہے۔ عیسائیت کی طرح وہ انسان کو ناقابلِ فہم اور پیچیدہ عقائد ونظریات پر ایمان لانے کا حکم نہیں دیتا اور نہ ان پر ایمان لانے کو ایمان باللہ کے لیے ناگزیر شرط قرار دیتا ہے۔ اسی طرح وہ انسان کو اس اضطراری کیفیت سے بھی دوچار نہیں کرتا کہ جہاں پر وہ سائنسی حقائق (FACTS) کو خدا کی ہستی کا انکار کیے بغیر تسلیم ہی نہ کر سکے۔ یہی نہیں، بلکہ اسلام انسان کو واضح طور پر یہ بھی بتاتا ہے کہ اس دنیا میں اس کو جو سروسامان حاصل ہے اور جس طرح یہاں کی بے شمار پوشیدہ اور ظاہر قوتیں دن رات اس کی خدمت میں سرگرمِ کار ہیں، یہ سب اس کے رحیم اور رحمٰن پروردگار کی رحمت وشفقت کا عطیہ ہے، لہٰذا اپنی سائنسی تحقیق وتفتیش کے بعد انسان جن نئے نئے خزانوں کا کھوج لگاتا ہے، وہ بھی دراصل اس کے رحیم وشفیق آقا کی بے پایاں رحمت وشفقت ہی کا ایک ظہور ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ اس کا شکرگزار بندہ بن کر رہے اور زیادہ سے زیادہ مستعدی خلوص اور جانفشانی سے اس کی بندگی کرے۔ اسلام علم اور سائنس کو شریا ایمان کے خلاف یا منافی نہیں سمجھتا، بلکہ اسے ایمان باللہ کا جزو لازم قرار دیتا ہے۔

اسلام کی ضرورت

یہ وہ مسائل ہیں جن کے حل کی تلاش میں انسان آج بھی سرگرداں ہے۔ اعلیٰ اور

حقیقی انسانی مقاصد ہنوز شرمندۂ تکمیل ہیں۔ انسان اب بھی گوناگوں حماقتوں اور ابلہ فریبیوں میں مبتلا ہے۔ ڈکیٹیٹروں اور مستبد حکمرانوں کو آج بھی کھلی چھٹی حاصل ہے اور انسانیت ان کے ظلم وستم اور استبداد کی چکی میں بدستور پس رہی ہے۔ ہر جگہ انسانیت پر حیوانیت کا غلبہ ہے۔ کیا ان کی موجودگی اس بات کا ثبوت نہیں کہ دنیا کو اسلام کی ضرورت ہے۔ اسلام کو انسان کی رہنمائی کے لیے ابھی بہت سے درخشاں کارنامے انجام دینے ہیں۔

بُت پرستی کی لعنت

آج دُنیا کی نصف آبادی عہدِ قدیم کی طرح بُت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہے۔ بھارت، چین اور دُنیا کے کئی اور ممالک کی مثال اس سلسلے میں پیش کی جاسکتی ہے۔ رہی باقی دُنیا، تو اس کا غالب حصّہ ایک اور معبودِ باطل کے دامِ تزویر میں گرفتار ہے۔ اس نئے معبودِ باطل نے انسانی افکار و جذبات کی دُنیا میں عہدِ قدیم کی بُت پرستی سے کچھ کم بگاڑ پیدا نہیں کیا۔ آج کے انسان کو سیدھی راہ سے بھٹکانے میں اس کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اس تازہ معبودِ باطل کا اصطلاحی نام ہے : جدید سائنس !

اہلِ مغرب کی تنگ نظری

کائنات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا وسیلہ ہونے کے لحاظ سے سائنس کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے اور اس اعتبار سے اس کے اب تک کے کارناموں کی فہرست بھی بڑی مرعوب کُن ہے، مگر اس کی یہ ساری کامیابیاں اس وقت حسرتوں اور نامرادیوں میں بدل گئیں، جبکہ اہلِ مغرب نے سائنس کو اُلوہیت کے مقام پر بٹھا دیا اور اسے اپنی محبتوں، عقیدتوں اور اطاعتوں کا واحد مرکز بنا لیا۔ اہلِ مغرب کی اس افسوسناک غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے تجرباتی سائنس (EMPIRICAL SCIENCE) کے تجربہ و مشاہدہ کے محدود وسائل کے سوا علم و معلومات کے باقی وسائل سے اپنے آپ کو

محروم کر دیا اور انسانیت اپنی منزلِ مقصود کے قریب آنے کے بجائے اس سے اور دُور ہو گئی۔ انسان کے سامنے ترقی اور سعی و جہد کے جو لامحدود امکانات تھے۔ وہ اہلِ مغرب کی تنگ نظری اور مادی سائنس کی ناگزیر محدودیتوں کی نذر ہو گئے، کیونکہ سائنس جو عقل کے پَروں سے اُڑتی ہے، انسانیت کی بلند پروازی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ وہ عقل اور رُوح دونوں سے مدد حاصل کرتی ہے اور تب کہیں اپنے خالق کا قُرب اور حقیقت نفس الامری کا واضح اور صحیح شعور حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہے۔

سائنس کی مبالغہ آمیز اہمیّت

سائنس کی برتری کے مدعی یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف سائنس ہی انسان پر حیات و کائنات کے سربستہ راز منکشف کر سکتی ہے، اس لیے حقیقت اور صداقت وہ ہے جس کی تائید سائنس کرے۔ باقی سب خرافات اور دفترِ بے معنی ہے۔ اپنے جوشِ بیان میں یہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ اپنے تمام حیرت انگیز کارناموں کے باوجود سائنس ہنوز اپنے ابتدائی دَور میں ہے۔ اب بھی بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں اس کی معلومات ناقص اور ناقابلِ اعتبار ہیں، کیونکہ اس کا دائرۂ اثر محدود ہے، اس کا مشاہدہ سطحی ہے اور اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ حقیقت کی تہہ میں اُتر سکے، لیکن یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی یہ حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ رُوح نام کی کوئی شے سرے سے کوئی وجود ہی نہیں رکھتی۔ ان کے نزدیک اپنے حواس کی حد کو پھلانگ کر کوئی انسان پردۂ غیب میں مستور دُنیا سے اپنا رشتہ استوار ہی نہیں کر سکتا، خواہ یہ رشتہ عالمِ خواب میں ہو یا انتقالِ[۱] خیال (TELEPATHY) اس کا واسطہ بنے۔ جدید دَور میں رُوح کے وجود

---

[۱] انتقالِ خیال (TELEPATHY) کو موجودہ دَور میں ایک واقعہ تسلیم کیا جاتا ہے، مگر بُرا ہو بدظنی اور تعصب کا کہ جدید سائنس دان رُوحِ انسانی سے اس کا کوئی تعلق سرے سے مانتا ہی نہیں؛ چنانچہ وہ اس کو ذہن کی چھٹی، مگر غیر معروف حِس قرار دیتا ہے۔ انتقالِ خیال کی غالباً سب سے نمایاں تاریخی مثال حضرت عمرؓ کی ہے۔ ایک بار خطبۂ جمعہ کے دوران میں آپ نے یک بیک سلسلۂ بیان کو منقطع کر کے سینکڑوں میل دُور اپنے فوجی کمانڈر ساریہؓ سے خطاب کیا اور فرمایا "اے ساریہؓ! پہاڑ کی جانب! اے ساریہ پہاڑ کی جانب! حضرت ساریہؓ نے سینکڑوں میل دُور یہ الفاظ سُنے اور فوراً پہاڑ کی سمت مُڑ گئے اور اس طرح آپ کی فوج دشمن سے محفوظ رہی، جو کمین گاہوں میں چھپا ہُوا تھا۔

سے انکار کی بنیاد کسی تجربے یا مشاہدے پر ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل وجہ تجرباتی سائنس اور اس کے ناکافی اور غیر موزوں آلات کی نارسائی ہے جس کے باعث وہ اسرارِ فطرت کی نقاب کشائی میں بُری طرح ناکام رہی ہے۔ غالباً مشیتِ ایزدی کے نزدیک ان اعلیٰ حقائق کو انسانی ادراک کی براہِ راست گرفت سے باہر رکھنا ہی حکمت و مصلحت کا تقاضا تھا، مگر کم فہموں کے لیے یہی بات ضلالت اور انکار کا باعث بن گئی اور وہ بزعمِ خویش یہ سمجھ بیٹھے کہ دُنیا میں رُوح کا سِرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

دورِ حاضر کی علمی جہالت

الغرض یہ ہے وہ "علمی جہالت" جس میں دورِ جدید کا انسان مبتلا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آج اسلام کی کتنی شدید ضرورت ہے، کیونکہ صرف اسی طرح سے انسان جدید و قدیم خرافات کی دَلدل سے نجات پا سکتا ہے۔ انسانی حماقت پہلے بُت پرستی کی صورت میں ظاہر ہُوئی تھی۔ اب وہی سائنس کی پرستش کی شکل میں موجود ہے۔ انسانی عقل اور رُوح کو اس وقت تک حقیقی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی جب تک وہ قدیم و جدید تمام خرافات سے آزاد نہ ہو۔ اور اس کی راہ صرف ایک ہے ۔ اور وہ ہے اسلام ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام انسانیت کی واحد امید بن کر نمودار ہوتا ہے۔ اسلام ہی مذہب اور سائنس کی مزعومہ کشمکش کو مصالحت میں بدل سکتا ہے اور بالآخر اس مصیبت زدہ دُنیا کو امن و سلامتی سے لا مال کر سکتا ہے جس کو وہ اہلِ مغرب کی حماقتوں کے طفیل کھو چکی ہے۔

یورپ اور قدیم یونان

جدید یورپ قدیم یونان کا تہذیبی وارث ہے۔ یہ تہذیبی ورثہ رومن امپائر کی وساطت سے یورپ تک پہنچا۔ قدیم یونانی تہذیب میں انسان اور اس کے دیوتاؤں کے باہمی تعلقات کی تصویر بڑی بھیانک ہے۔ وہ ایک دوسرے کے مخالف اور دُشمن ہیں۔ ان میں مستقل ٹکراؤ اور کھینچا تانی کی کیفیت نظر آتی ہے؛ چنانچہ قدرت کے سربستہ راز دل

کو افشا کرنے میں انسان کو جو کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں وہ ان کے نزدیک دیوتاؤں کی عاجزی اور بے بسی کی غماز ہیں۔ اور انسان نے بزور چھینا جھپٹی کر کے ان سے حاصل کی ہیں، ورنہ اگر ان حاسد اور بے بس خداؤں کا بس چلتا، تو وہ کبھی انسان کو تحقیق و اکتشاف کے کسی شعبے میں کامیاب نہ ہونے دیتے۔ اور انسان ان ساری آسائشوں اور سہولتوں سے محروم ہو جاتا، جو قدرت کے خزانوں پر دسترس پانے کے نتیجے میں اس کو حاصل ہیں۔ اس یونانی نقطۂ نظر سے سائنس کی ہر نئی کامیابی اپنے حاسد دیوتاؤں کے خلاف انسان کی فتح و کامرانی کا نیا اعلان اور اس کی برتری کا اثبات ہے۔

یورپ کی تہذیبی رُوح

یونانی تہذیب کی یہی وہ خبیث رُوح ہے، جو جدید یورپ کے تحت الشعور میں اب بھی کارفرما ہے۔ اس کا اظہار کہیں تو حقائق و واقعات کی تعبیر و توجیہہ میں ہوتا ہے اور کہیں خدا کے بارے میں یورپی رویّے میں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید یورپی سائنس دان سائنس کی کامرانیوں کو کچھ اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ گویا یہ انسان نے کسی برتر قوت سے لڑ کر حاصل کی ہیں اور ان کے نتیجے میں فطرت کی قوتوں کو اپنا تابع بنا لیا ہے؛ چنانچہ ان دیکھے خدا کے سامنے انسان جس عجز و نیازمندی کا اظہار کرتا چلا آیا ہے، اس کی اصل وجہ اس کے نزدیک انسان کا اپنا احساس عجز ہے، مگر سائنس کو فطرت کے خلاف جو بے پناہ کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں، ان کے نتیجے میں یہ انسانی احساس عجز رفتہ رفتہ خود بخود مٹ جائے گا اور بالآخر وہ دن بھی آ جائے گا جب انسان خود اپنا خدا ہو گا، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو حیات و ممات کے تمام سربستہ راز معلوم ہوں اور وہ تجربہ گاہ میں حیات کی تخلیق پر قادر ہو۔ اسی لیے آج کا سائنس دان تجربہ گاہ میں زندگی کی تخلیق کو اوّلیں اہمیت دیتا ہے، کیونکہ اس کے خیال میں یہ کارنامہ انجام دینے کے بعد اس میں اور ان دیکھے خدا میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا اور وہ اپنے سوا کسی اور کے روبرو جھکنے کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے گا۔

اُمّید کی آخری کِرن

جدید مغربی دُنیا آج جن روحانی امراض میں مبتلا ہے' یہ ان میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس نے انسان کی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ انسانیت کو افتراق و انتشار کے جہنّم میں جھونک رکھا ہے۔ انسان آپس ہی میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ زندگی میں امن' سکون اور اطمینان باقی ہے اور نہ حسن و دلکشی۔ اس حالت میں البتہ اُمید کی ایک آخری کِرن باقی ہے ــــ اسلام! اپنے خدا مغرب کی لائی ہُوئی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے قانونِ خداوندی کی اطاعت کے سوا اب اَور کوئی چارہ باقی نہیں۔ یہ انسان کو زندگی کا ایک صحت مند نقطۂ نظر عطا کرتا ہے۔ اور اس کو بتاتا ہے کہ دُنیا میں تجھے جو علمی' مادی اور رُوحانی کامیابیاں نصیب ہوتی ہیں وہ دراصل تمہارے رحیم و شفیق رب کی مہربانی کا نتیجہ اور اس کا فضل ہیں۔ اپنی ان کامرانیوں کو تم اپنے ابنائے نوع کی خدمت کا ذریعہ بناؤ گے' تو وہ تم سے خوش ہوگا اور تمہیں انعام دے گا۔ تمہارا رب حصولِ عِلم کی لگن یا اسرارِ فطرت کی جستجو سے غضبناک نہیں ہوتا' کیونکہ اس کو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس کی مخلوق میں سے کوئی اپنے عِلم کے بل پر کبھی اس کی خدائی کے لیے خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ اس کا غضب صرف اس وقت بھڑکتا ہے اور ان لوگوں پر بھڑکتا ہے جو اپنے عِلم و فضل اور سائنس کی معلومات کو اپنے ابنائے نوع کی فلاح و بہبود کے بجائے ان کی تباہی اور بربادی میں صرف کرتے ہیں۔

دورِ جدید کے تازہ خدا

اخلاق و اعمال کے لحاظ سے دُنیا آج جس مقام پر کھڑی ہے' آج سے تیرہ صدی پہلے بھی وہ اسی مقام پر کھڑی تھی۔ اس وقت اسلام ہی نے اس کو باطل معبودوں اور جھُوٹے خُداؤں سے نجات دلائی تھی۔ آج کے جھُوٹے خداؤں سے بھی اسلام ہی انسانیت کو چھٹکارا دلا سکتا ہے۔ ان خداؤں نے آج استبداد' شہنشاہیت' سامراج اور سرمایہ داری

کے لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔ ایک طرف سنگدل سرمایہ دار غریب مزدوروں کا خون چوس چوس کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کے نام پر کچھ لوگ اپنی خدائی کے ٹھاٹھ جمائے بیٹھے ہیں۔ یہ لوگ عوامی آزادی کے نام پر لوگوں کی آزادیاں کو پامال کرتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ عوام کی مرضی پوری کر رہے ہیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

ممکن ہے یہ بات سُن کر کہ اسلام انسان کے لیے آزادی کا پیغام ہے، بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اُبھرے کہ پھر اسلام خود مسلمانوں کو ان ظالم اور جابر ڈکٹیٹروں کے تسلط سے کیوں نجات نہیں دلاتا، جنہوں نے آج ساری دُنیا کے اسلام کو آزادی سے محروم کر کے پابہ جولاں رکھا ہے۔ جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کو تذلیل و تحقیر کا تختۂ مشق بنا رہے ہیں۔ ان معترضین کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ آمرین مطلق اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی حکومتوں میں اسلام کو کوئی اختیار یا مقام حاصل نہیں ہے اور نہ ان کی زندگیوں میں یا ان کے گرد و پیش اس کی کوئی جھلک ہی نظر آتی ہے۔ یہ نام نہاد مسلمان اس گروہِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ٥ (۵: ۴۴)	اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی ظالم ہیں۔
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ٥ (۴: ۶۵)	اے محمدؐ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سرتسلیم کر لیں۔

یہ مُسلمان ڈکٹیٹر

جس اسلام کی طرف ہم لوگوں کو بُلاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ اس کو اپنی زندگیوں میں رہنما بنائیں، اس کا اس "اسلام" سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، جس کو مشرق جدید کے یہ مُسلمان حکمران اپنانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان حکمرانوں کے دِلوں میں قانون ربّانی کے لیے کچھ بھی احترام اور لحاظ نہیں پایا جاتا۔ وہ جب چاہتے ہیں، اس کے احکام و فرامین کو پسِ پُشت ڈال کر من مانی کرنے لگتے ہیں۔ اور اس میں انہیں ذرہ بھر حجاب بھی محسوس نہیں ہوتا۔ اپنے معاملاتِ زندگی میں انہیں اس سے روشنی اور ہدایت لینے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، نہ ان کی وفاداریاں صرف اسی کے لیے خاص ہیں۔ وہ جہاں اپنے حسبِ منشا کوئی چیز پاتے ہیں، اس کو اختیار کر لیتے ہیں، خواہ یہ یورپ کے کسی مُلک کے انسانی قوانین ہوں، یا شریعت کے احکام۔ اور جو چیز ان کی خواہشات اور مصلحتوں کے خلاف پڑتی ہے، اس کو اُٹھا کر پرے پھینک دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ انسانوں کے وفادار ہیں، نہ خدا کے۔ وہ انسان اور خدا دونوں سے زیادتی اور گستاخی کے مُجرم ہیں، کیونکہ ان کا معیار ردّ و قبول، حق و صداقت نہیں ہے، بلکہ ذاتی مصلحتیں اور حرص و ہوا ہے۔

ہم جس اسلام سے آشنا ہیں، وہ مغرور بادشاہوں اور خودسر و جابر مستبد حکمرانوں کے وجود کو برداشت ہی نہیں کرتا یا ان کو بھی اسی طرح خدائی قانون کے شکنجے میں کس کر رکھتا ہے جس طرح عام لوگوں کو۔ اور وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں تو انہیں ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیتا ہے، کیونکہ:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ (۱۳:۱۷)	جو جھاگ ہے، وہ اُڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے، وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

اسلام کی حکومت

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہُوا کہ اسلام کی حکومت میں ڈکٹیٹر نہیں ہونگے۔

کیونکہ اسلام خودسری اور آمریت کو برداشت کرنے کا روادار نہیں اور یہ کسی انسان کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں پر خدا اور اس کے رسولؐ کی مرضی چھوڑ کر اپنا بنایا ہوا قانون ٹھونسنے کی کوشش کرے۔ اسلام کی حکومت میں حکمران خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ اس جواب دہی کے فرض کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسانوں میں خدا کے قانون کو جاری کرے۔ اگر وہ اپنے اس فرض میں کوتاہی کرے تو دوسروں پر اس کی حکمرانی کا حق از خود ساقط ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ ان سے قانونی لحاظ سے اپنی اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اسی حقیقت کا اظہار خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ نے اپنے اوّلین خطبہ میں یوں کیا ہے "میری اطاعت کرو جب تک میں خدا کی اطاعت کروں، لیکن اگر میں خدا کی اطاعت کی حدود سے تجاوز کروں تو اس کے بعد میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہوگی"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکمران کو خزانۂ عامرہ اور مُلکی قانون سازی میں اس سے زیادہ کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، جتنا کہ اس کی رعایا کے کسی ادنیٰ ترین فرد کو ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلام کی نگاہ میں کسی فرد کو دوسروں پر حکومت کرنے کا حق اور اختیار صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جبکہ مُسلم معاشرے کے افراد نے اسے اپنی آزاد مرضی سے ایک آزاد، غیر جانبدار اور ہر طرح کی دھاندلیوں سے پاک انتخاب کے ذریعے منتخب کیا ہو اور دورانِ انتخاب ان پر انصاف، نیکی اور شرافت کی معروف پابندیوں کے سوا اور کوئی پابندی نہ ہو۔

عظمت و شوکت کا مذہب

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو نہ صرف اپنے اندر کے جابر اور مستبد حکمرانوں کے شر سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ بیرونی جارحیت سے بھی ان کا دفاع کرتی ہے، خواہ یہ جارحیت سامراجی استحصال کی صورت میں ظاہر ہو یا کوئی اور صورت اختیار کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام خود عظمت و شوکت اور قوت کا مذہب ہے اور وہ یہ برداشت

نہیں کر سکتا کہ انسان اپنے بلند مقام سے گر کر جھوٹے اور باطل خدا ۔ سامراج کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ اسلام انسان کو زندگی کا ایک بہت سیدھا سادا نظام عطا کرتا ہے اور اس کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ اپنے رب کی خوشنودی کے حصول کے لیے دل و جان سے اس کی راہ میں جہاد کرے، اپنی مرضی کو بالکلیہ اس کی بالاتر مرضی کے تابع کر دے۔ اپنے تمام ذرائع و وسائل کو کام میں لا کر استعمار اور استبداد کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔

استعمار سے نجات کی راہ

اس لیے آئیے ہم سب مل کر اسلام کا دامن مضبوطی سے تھام لیں، کیونکہ ہم اس کے جھنڈے تلے جمع ہو کر دنیا سے استعمار کے تمام بچے کھچے آثار مٹا سکتے ہیں۔ انسانیت کو استعمار کے اس دیو سے جواب تک کرۂ ارض کو اپنی چیرہ دستیوں کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہے، نجات دلانے کی اب یہی ایک واحد اُمید باقی رہ گئی ہے۔ یہیں سے حقیقی آزادی کی راہیں پھوٹیں گی۔ اُس کے بعد کوئی کسی کا غلام نہیں ہو گا۔ سب انسانوں کو خیال، عمل، کسب اور مذہب کی کامل آزادی حاصل ہو گی۔ سب کی عزت و آبرو محفوظ ہو گی، کیونکہ حکومت خود ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہو گی صرف اسی طرح ہم صحیح معنوں میں مسلمان اور اپنے رب کے وفادار بندے بن سکتے ہیں ـــ اس رب کے، جس نے اسلام کو ہمارے لیے دین منتخب کیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (۵:۳)	آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

عالمگیر اصلاحی پروگرام

اسلام کی ان انقلابی اصلاحات کا دائرہ صرف مسلمان معاشرے ہی تک محدود

نہیں ہے، بلکہ اپنی فطرت کے لحاظ سے یہ ایک عالمگیر اصلاحی پروگرام ہے۔ اس کا وجود آج کی مصیبت زدہ دُنیا کے لیے، جو باہمی خانہ جنگیوں کی تباہ کاریوں کا شکار ہے اور جس کے سر پر تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے، ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

عالمی استعمار کے دو کیمپ

آج دُنیا دو مخالف کیمپوں ــــ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں بٹی ہوئی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک دُنیا پر اپنا تسلط جمانا چاہتا ہے۔ اور عالمی منڈیوں اور اہم جنگی مقامات پر قبضہ کرنے کا آرزومند ہے، مگر اپنے تمام اختلافات کے باوجود ان دونوں میں ایک قدرِ مشترک پائی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ دونوں کا نقطۂ نظر استعماری ہے اور دونوں یکساں طور پر اقوامِ عالم کو اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں؛ چنانچہ دونوں اس بات کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ انسانی اور مادی ذرائع و وسائل پر قابض ہو جائیں۔ دوسرے انسانوں کی حیثیت ان کی نگاہوں میں بے زبان حیوانوں سے زیادہ نہیں [اپنی اصطلاحی زبان میں یہ لوگ افرادِ انسانی کو عددی قوت (MAN POWER) کہتے ہیں] یا پھر وہ محض آلاتِ کار ہیں جن کی بدولت وہ اپنے ان مذموم مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

ایک تیسرا بلاک

اگر دُنیائے اسلام استعمار کے اس وحشیانہ غلبہ و قہرمانی کے خلاف متحد ہو جائے، تو بین الاقوامی رقابتوں اور حریفانہ کشاکش کی جس سے امنِ عالم کو شدید خطرات ہیں، مؤثر طور پر روک تھام ہو سکتی ہے۔ مُسلمان ممالک اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں، تو وہ بڑی آسانی سے ایک تیسرا ــ مُسلم بلاک ــــ بن سکتے ہیں۔ اگر اس طرح کا کوئی بلاک وجود میں آجائے، تو وہ عالمی سیاست میں مرکزی اہمیت کا حامل بن سکتا ہے، کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے یہ مُسلمان ممالک نئی اور پُرانی دُنیا کے عین وسط میں واقع ہیں۔ اپنی اس جغرافیائی پوزیشن کی بدولت مُسلمان

ممالک اپنے قومی و ملی مفاد کے پیشِ نظر بلا روک ٹوک جس کیمپ کے ساتھ چاہیں گے، ملیں گے۔ اور مشرقی یا مغربی استعمار کا آلہ کار بننے کے بجائے وہ اپنے حقیقی مفادات کے لیے مشترکہ جدوجہد کر سکیں گے۔

مسرت، امن اور خوشگوار زندگی

اسلام، انسانیت کی واحد اُمید ہے۔ اور اسی سے اِس کا مُستقبل وابستہ ہے۔ موجودہ نظریاتی کشمکش میں نظریۂ اسلام کی کامیابی ہی انسان کی نجات کی ضامن بن سکتی ہے، مگر اسلام کی فتح کی اس قدر اہمیت کے باوصف اس کا حصول بھی محض فریبِ نظر یا ناممکن الحصول نہیں۔ آج اسلامی نظام کا قیام اسی طرح ممکن ہے، جس طرح پہلے تھا، بشرطیکہ وہ تمام لوگ جو اس کے دائرے میں داخل ہیں، مگر اب تک محض زبان سے اس کی اطاعت کا دم بھرتے رہے ہیں، آج ہی سے یہ عہد کر لیں کہ وہ اسلام کو دُنیا پر غالب و کامران کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اس کے لیے انہیں کسی بیرُونی طاقت کی مدد کی ضرورت بھی انشاءاللہ نہیں پڑے گی، مگر جدید انسان کے لیے اسلام کی اس فتح کا مطلب ہوگا ہر لحظہ سَر پر منڈلانے والے تیسری عالمگیر جنگ کے خطرے کا خاتمہ، اعصابی عوارض، بیماریوں اور نفسیاتی تناؤ کا سدِباب بالفاظِ دیگر مسرّتوں، خوشیوں اور امن چین سے بھرپُور خوشگوار زندگی۔

مغرب کی ترقّی کی حقیقت

مسئلے کے ایک اور پہلو پر بھی آیئے نظر ڈالتے چلیں۔ جدید مغرب نے سائنس کے میدان میں بے پناہ کامیابیاں حاصل کی ہیں، مگر انسانیت کے میدان میں یہ ہنوز انتہائی پسماندہ اور وحشی ہے۔ سائنس نے اسے مادّی خوشحالی عطا کی ہے، مگر اچھے انسان نہیں دیے۔ انسانیت کا ارتقاء رُک سا گیا ہے۔ دِل اعلیٰ انسانی قدروں کے احترام سے خالی ہیں۔ جدید تہذیب نے رُوح سے زیادہ مادہ پر زور دیا اور رُوحانیت کے مقابلے میں محسوسات کو ترجیح دی، جس کا نتیجہ اب یہ نکلا ہے کہ افراد بلند اجتماعی مقاصد کے بجائے اپنے ذاتی عیش و آرام اور

خود غرضانہ مقاصد کے حصول کو زیادہ اہم سمجھنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید انسان جسمانی لذتوں کی تلاش ہی میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کو انسان کی ترقی یا انسانیت کا ارتقاء نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ انسان کی یا انسانیت کی ترقی کا مطلب صرف مادی اور سائنسی ترقی ہی نہیں ہے، بلکہ محسوسات اور حیوانی خواہشات کے غلبہ سے کامل آزادی بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں اسلام ہماری دستگیری کرتا ہے، کیونکہ صرف وہی انسانیت کو حقیقی ترقی و ارتقاء سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

حقیقی ترقّی کا پیمانہ

تیز رفتار طیاروں، ایٹم بموں، ریڈیو اور روشن برقی قمقموں کو ترقّی نہیں کہتے۔ ان کو ترقّی کے مترادف قرار دینا غلط بینی ہے اور بس، کیونکہ یہ چیزیں ترقّی کو ماپنے کا کوئی انسانی پیمانہ ہمیں دینے سے یکسر قاصر ہیں۔ اگر حقیقی ترقّی کو معلوم کرنا ہے، تو یہ دیکھیے کہ کیا انسان کو اپنی حیوانی خواہشات اور جذبات پر کامل قابو حاصل ہے یا وہ اُن کے ہاتھوں میں ابھی تک کھلونا بنا ہوا ہے؟ اگر انسان اب بھی اپنی خواہشاتِ نفس کے سامنے بے بس اور عاجز ہے۔ اور وہ اُن سے اُوپر اُٹھ کر کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتا، تو سمجھ لیجیے کہ انسان حقیقی ترقّی سے ابھی کوسوں دُور ہے اور بحیثیت انسان اس کی حالت علم و فضل اور سائنس کے میدان میں ان تمام خیرہ کُن کامیابیوں کے باوجود قابلِ رحم ہے۔ کُجا کہ اس کو ترقّی یافتہ اور کامیاب قرار دیا جائے۔

ترقّی کا یہ معیار مذہب اور اخلاقیات کا خود ساختہ اور خانہ ساز معیار نہیں ہے جس کو کہیں باہر سے لا کر انسان پر ٹھونس دیا گیا ہو۔ یہ محض واہمہ بھی نہیں، بلکہ واقعہ ہے۔ اور اس کی صداقت پر خود تاریخ گواہ ہے، جو ہمیں بتاتی ہے کہ اس کی جڑیں فطرتِ انسانی اور حقیقت نفس الامری میں پیوست ہیں؛ چنانچہ یہ ایک اٹل تاریخی حقیقت ہے کہ اس اخلاقی اور انسانی معیار کو چھوڑ کر جب کوئی قوم عیش و عشرت میں مبتلا ہوئی،

تو پھر وہ کبھی اس قابل نہ ہو سکی کہ اپنی سابقہ قوت و عظمت، وقار اور دبدبے کو قائم رکھ سکے اور انسانیت کے مجموعی ارتقاء اور فلاح میں کوئی کارنامہ سرانجام دے سکے۔ قدیم یونان ہو یا ایران اور رومن ایمپائر کی تباہی ہو یا عہد عباسیہ کے آواخر میں خود مسلمانوں کی سطوت و عظمت کا زوال، ان سب میں اسی عیاشی اور لذت کوشی کے تباہ کن اثرات کارفرما نظر آتے ہیں۔ دَورِ جدید کی تاریخ میں عیاش فرانسیسی قوم کے اس شرمناک کردار کو کون بھلا سکتا ہے، جو دوسری جنگِ عظیم میں اس نے پیش کیا؟ دُشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے میں اس قوم نے ذرا بھی تاخیر نہ کی، بلکہ ایک ہی ہلّہ میں اس کے سامنے سرنگوں ہوگئی۔ وہ دُشمن کا ایک وار بھی نہ سہہ سکی، کیونکہ اس کے افراد کو اپنے مُلک و وطن کے دفاع سے کہیں زیادہ اپنی جان و مال اور ذاتی آرام و آسائش کی پڑی ہوئی تھی۔ اپنی قوم کی عظمتِ رفتہ اور اس کی شہرت و نیک نامی سے کہیں زیادہ انہیں اس بات کی فکر کھائے جارہی تھی کہ جس طرح بھی بن سکے، ان کا دارالحکومت پیرس اور اس کے ناچ گھر دُشمن کی بمباری سے بچ جائیں۔

امریکہ کی مثال

بعض ناواقف لوگ اس سلسلہ میں امریکہ کو بھی بطورِ مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہاں کے لوگ دُنیاوی لذات اور محسوسات میں غرق ہیں، مگر اس کے باوجود انہیں دُنیا میں قوت اور شوکت حاصل ہے۔ اور مادی پیداوار کے لحاظ سے ان کا مُلک دُنیا میں بلند ترین مقام پر فائز ہے۔ یقیناً یہ ساری باتیں درست ہیں، مگر ہمارے یہ دوست بھول جاتے ہیں کہ مادی اور رُوحانی لحاظ سے امریکہ اقوامِ عالم کی برادری میں ابھی ایک نوجوان قوت ہے اور جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، جوانی میں اکثر پوشیدہ امراض دبے رہتے ہیں، اور بظاہر ان کی کوئی علامات نظر نہیں آیا کرتیں، کیونکہ معاشرتی نظام میں ابھی اتنی قوتِ مدافعت موجود ہوتی ہے کہ وہ مختلف امراض کی بیرونی علامات کو نمایاں ہونے ہی نہ دے، مگر دیدۂ بینا اس قسم کے کسی معاشرے کی ظاہری صحت مندی اور چمک دمک

سے دھوکا نہیں کھا سکتی اور نہ دلکش اور دلفریب ظاہری پردے میں پنہاں مہلک امراض کے آثار و علامات اس سے اوجھل رہ سکتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ اخلاقی لحاظ سے امریکہ کی حالت مغرب کی دوسری قوموں سے کچھ بھی بہتر نہیں، مندرجہ ذیل دو خبروں سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنی تمام ترقیوں اور کامرانیوں کے باوجود سائنس اب بھی اس قابل نہیں ہے کہ فطرت انسانی میں کوئی بنیادی تغیر و اصلاح رونما کر سکے، کیونکہ خود سائنس بھی خدائی قانون کا ایک جزو ہے۔ وہی خدائی قانون، جو حالات و واقعات سے آزاد اور ان سے برتر ہے:

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ج (۴۳:۳۵)	تو تم اللہ کے دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پاؤ گے۔

دو خبریں

پہلی اخباری اطلاع میں، جو کچھ عرصہ پیشتر اخبارات میں آچکی ہے، بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی وزارتِ خارجہ نے اپنے تینتیس ۳۳ ملازموں کو قابلِ اعتراض اخلاقی چال چلن اور اپنے ملک کے راز دشمنوں پر افشا کرنے کے الزام میں ملازمت سے برطرف کر دیا ہے۔

دوسری خبر کا مفاد یہ ہے کہ اس وقت ایک لاکھ بیس ہزار امریکی فوجی بھگوڑے ہیں۔ امریکی فوج کی مجموعی عددی قوت کو سامنے رکھا جائے، تو بھگوڑوں کی یہ تعداد خاصی بڑی معلوم ہوتی ہے، حالانکہ امریکی قوم ابھی اپنے عالمِ شباب سے گزر رہی ہے۔ اور عالمی قیادت اور بالادستی کے خواب بھی دیکھ رہی ہے۔

مگر یہ تو محض ابتدا ہے، بہرحال اگر امریکی قوم زندگی کے بارے میں اپنی موجودہ مادہ پرستانہ روش سے باز نہ آئی، تو اس کا انجام بھی بالآخر لازماً وہی ہو کر رہے گا، جو اس جیسی پہلی قوموں کا ہو چکا ہے، کیونکہ یہی اٹل قانونِ فطرت ہے۔

امریکی تصویر کا تاریک پہلو

اس گفتگو سے ہمارے سامنے امریکی تصویر کا صرف ایک ہی رُخ نمایاں ہوتا ہے۔

اس کے دوسرے رُخ میں جھانک کر دیکھیں، تو معلوم ہو گا کہ اپنی مادی پیداوار، جوانی اور بے پناہ مادی وسائل و ذرائع کے باوجود امریکی قوم اعلیٰ اخلاقی قدروں اور اصولوں کے میدان میں حیرتناک حد تک بانجھ ثابت ہوئی ہے، کیونکہ من حیث القوم وہ سراسر مادی لذات اور خواہشات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور اب تک خالص حیوانی سطح سے اُوپر اُٹھ کر مسائل کا جائزہ لینے کی توفیق اس کو شاذ و نادر ہی ہوئی ہے۔ سیاہ فام امریکیوں سے جو انسانیت سوز اور وحشیانہ سلوک امریکہ میں روا رکھا جاتا ہے، وہ امریکی قوم کی اسی پست اور قابلِ رحم اخلاقی حالت کا آئینہ دار ہے۔ انسانیت پر حیوانیت کا اس قدر غلبہ کہ انسان بس اسی کی تسکین، بلکہ پرستش میں لگ جائے، انسانیت کی تذلیل ہے جس کی موجودگی میں وہ کبھی ترقی و ارتقاء کی منازل طے نہیں کر سکتی۔

نیکی اور بھلائی کی راہ

آج کی دُنیا کی یہ تصویر بہت تاریک ہے، مگر نجات کی ایک راہ اب بھی باقی ہے اور وہ ہے اسلام کی راہ۔ جس طرح تیرہ صدی پہلے اس نے انسان کو حیوانی خواہشات کے تسلط سے آزادی عطا کی تھی، اسی طرح آج بھی وہی انسانیت کی دستگیری کر سکتا ہے اور اس کو خواہشاتِ نفس کے غلبہ سے چھٹکارا دے کر اس کو اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ اپنی رُوحانی سطح کو بلند سے بلند تر کرنے میں اپنے دل و دماغ کی تمام قوتیں کھپا دے تاکہ زندگی کا دامن نیکیوں اور بھلائیوں سے بھر جائے، اور ہر طرف انہی کا چرچا ہو۔

تحریک احیائے اسلام کا امکان

ممکن ہے یہ باتیں سُن کر بعض لوگ کہہ اُٹھیں کہ اسلام کا احیاء اب ایک امرِ محال ہے اور اس کے لیے کوششیں بے سُود، مگر ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح ماضی میں اسلامی نظام کے عملی قیام سے ثابت ہو چکا ہے، کہ نسلِ انسانی اس کی راہنمائی میں حیوانیت کو شکست دے سکتی ہے۔ اسی طرح اب بھی اس تاریخی حقیقت کا اعادہ ممکن

ہے، کیونکہ فطرت انسانی میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یہ جیسی پہلے تھی اب بھی جوں کی توں ہے۔ اسلام جب آیا تھا، تو دنیا کی اخلاقی اور دینی حالت ویسی ہی پست تھی جیسی کہ اس وقت نظر آتی ہے، قدیم و جدید پستیوں میں سوائے مظاہر کے اور کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ قدیم روما اخلاقی بے راہ روی میں جدید لندن، پیرس اور امریکہ کے شہروں سے کسی طرح بھی پیچھے نہ تھا۔ اسی طرح قدیم ایران جنسی انارکی کا اسی طرح شکار تھا، جس طرح آج کل کے اشتراکی ممالک اس کا شکار ہیں؛ چنانچہ یہی وہ تاریخی پس منظر تھا جس میں اسلام دنیا میں آیا، اس نے آتے ہی اپنے زیر اثر دنیا کی اخلاقی حالت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کو قعر مذلت سے اٹھایا۔ زندگی کو ایک اعلیٰ نصب العین سے روشناس کیا، عمل و حرکت سے سرشار کیا۔ نیکی و صداقت کی راہ میں جہاد کا جذبہ بلند پیدا کیا۔ اور انسانیت کو ترقی و خوشحالی سے ہمکنار کیا اور ایک ایسی علمی اور روحانی تحریک کو جنم دیا جو عرصہ دراز تک مشرق و مغرب پر چھائی رہی۔ اس کے نتیجے میں دنیا ایک عظیم فکری انقلاب سے روشناس ہوئی اور دنیائے اسلام روشنی، ہدایت اور ترقی کا منبع بن گئی، جس سے ایک طویل عرصہ تک انسانیت کسب نور و ہدایت کرتی رہی۔ اپنی عظمت و برتری کے اس طویل دور میں دنیائے اسلام مادی، علمی یا روحانی لحاظ سے کبھی دوسروں سے پیچھے نہیں رہی، کیونکہ اسلام اخلاقی بے راہ روی، جنسی انتشار اور الحاد کی اجازت نہیں دیتا اور نہ انہیں ابھرنے کا موقع دیتا ہے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصہ میں نیکی و شرافت اور انسانی جد و جہد کے تمام دوسرے دوائر میں مسلمانوں کو اقوام عالم کی رہنمائی کا منصب حاصل رہا اور ان کی زندگیاں دوسروں کے لیے نمونے کی زندگیاں بن گئیں، مگر اس کے بعد بتدریج اسلام کے اصولوں سے منحرف ہوتے گئے تا آنکہ ان کی زندگیوں میں اس کے اعلیٰ مقاصد اور اصولوں کی کوئی جھلک باقی نہ رہی اور وہ سفلی خواہشات و جذبات کے بندے بن گئے۔ اس جرم کی پاداش میں خدا کے اٹل قانون کے مطابق انہیں بالآخر اسی دنیا میں سزا بھی مل گئی اور ان کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہو گیا۔

جدید اسلامی تحریک

جدید اسلامی تحریک جو ہر لحظہ رواں دواں ہے، اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے، ماضی سے رُوحانی غذا حاصل کرتی ہے، حال کے تمام پاکیزہ اور جائز ذرائع و وسائل کو کام میں لاتی ہے اور اپنی نظریں دُور مستقبل پر گاڑے اپنی منزلِ مقصود کی جانب گامزن ہے، اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہے اور اس کے ذریعہ وہی معجزہ ایک بار پھر رونما ہو سکتا ہے جو پہلے ظاہر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انسان حیوانی خواہشات کا بندہ نہیں رہے گا، بلکہ دُنیا کے جھنجھٹوں میں پڑنے اور "پا بہ گِل" ہونے کے باوجود وہ آزاد انسان کی طرح سَر اُٹھا کے چل سکے گا، کیونکہ اب اس کا منتہائے مقصود مادی لذتیں نہیں ہوں گی بلکہ اس کی منزل چرخِ نیلی فام سے بھی پرے ہو گی۔

ایک مکمّل نظامِ حیات

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام محض ایک رُوحانی عقیدہ ہے یا صرف اخلاقیات کا نظام ہے، یا زمین و آسمان کے بارے میں محض ایک علمی جُستجو کا نام ہے۔ نہیں بلکہ اسلام زندگی کا ایک عملی نظام ہے اور اس دُنیا کے تمام گوشوں اور جملہ مسائل پر حاوی ہے، اور ان کا کوئی پہلو اس کی گرفت سے آزاد نہیں، وہ انسانی زندگی کے تمام تعلقات و روابط کو منضبط کرتا ہے، خواہ یہ مسائل سیاسی ہوں، اقتصادی ہوں یا معاشرتی۔ اور ان کے لیے موزوں ضابطے اور قواعد مرتب کر کے انہیں عملاً نافذ کرتا ہے۔ اسلام کے اس کارنامے کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ اس طرح سے فرد اور اجتماع، عقل اور وجدان، عمل اور عبادت، زمین اور آسمان اور دُنیا اور آخرت کے درمیان منفرد نوعیت کی ہم آہنگی اور توازن پیدا ہو جاتا ہے اور زندگی کے یہ گوناگوں پہلو، ایک ہی متناسب کُل، کے اجزاء بن جاتے ہیں۔

موجودہ باب میں اسلام کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام پر کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں، ورنہ ہم اس اجمال کی تفصیل قارئین کے سامنے پیش کرتے، البتہ اگلے ابواب میں مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں پر بحث کے دوران میں نظامِ اسلامی کی

بعض نمایاں خصوصیات کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں، بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ یہاں پر اس سلسلے میں چند باتیں قارئینِ کرام کے گوش گزار کرتے چلیں۔

اسلام کی پہلی خصوصیت

پہلی بات تو اسلام کے متعلق یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ خالی خولی نظریہ نہیں ہے، ایک عملی نظامِ حیات ہے جو نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی کی کسی ضرورت کو نظر انداز نہیں کرتا، بلکہ اس کے حصول کی راہیں بھی کھولتا ہے۔

اسلام کی دوسری خصوصیت

دوسری یہ کہ انسان کی حقیقی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے لیے اسلام زندگی میں مکمل عدل اور توازن کو قائم کرنا چاہتا ہے، مگر انسانی فطرت کی محدودیتوں کو وہ کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنی اصلاح کا آغاز "فرد" سے کرتا ہے، اور اس کی زندگی میں جسم اور رُوح اور عقل اور خواہشات کے مختلف النوع تقاضوں کے درمیان اعتدال اور توافق پیدا کرتا ہے تاکہ ان میں سے کوئی اپنی جائز حدود سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ اعلیٰ رُوحانی مدارج کے حصول کے لیے اسلام نہ تو حیوانی جبلت کو دباتا ہے اور نہ لذت پرستی میں انسان کے اس درجہ استغراق کو بنظرِ استحسان دیکھتا ہے کہ جس کی وجہ سے انسان بالکل حیوان بن کر رہ جائے۔ اس کے بجائے اسلام رُوح اور جسم دونوں پر ایک بلند مقام سے نگاہ ڈالتا ہے، ان میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور ان کے جائز مطالبات کو پُورا کرتا ہے۔ رُوح و جسم کے مابین مصالحت سے انسانی شخصیت پارہ پارہ ہونے یا باہم متصادم رجحانات کی رزم گاہ بننے سے بچ جاتی ہے۔ اس طرح جب انفرادی زندگی صحت مند بُنیادوں پر استوار ہو چکتی ہے، تو اسلام فرد اور معاشرے کی ضروریات میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرف متوجّہ ہوتا ہے، چنانچہ یہ کسی فرد کو دوسرے افراد یا معاشرہ کے خلاف کسی زیادتی کے ارتکاب کی اجازت نہیں دیتا اور نہ معاشرے کو اس بات کا

حق دیتا ہے کہ وہ کسی فرد کی حق تلفی کرے۔ اسلام اس بات کا بھی روادار نہیں کہ انسانوں کا کوئی طبقہ یا قوم، دوسرے طبقوں یا قوموں پر اپنی خدائی کا سکہ چلائے۔ الغرض اسلام معاشرتی زندگی میں کارفرما متضاد اور باہم دِگر متصادم، قوتوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ انہیں باہم ٹکرانے سے بچاتا ہے اور ان میں توافق پیدا کر کے انہیں اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ یہ مِل جُل کر انسان اور انسانیت کے اعلیٰ تر مفادات کے لیے کام کر سکیں۔

معاشرتی قوتوں میں توازن

اس کے ساتھ ہی اسلام روحانی اور مادی، معاشرتی اور انسانی قوتوں میں توازن کو اُجاگر کرتا ہے۔ کمیونزم کی مانند اسلام زندگی میں انسانی عوامل پر معاشی عوامل کی فیصلہ کُن برتری اور بالاتری کا قائل نہیں، مگر "روحانیت" یا نظریہ پرستوں کے اس خیال سے بھی وہ متفق نہیں ہے کہ انسانی زندگی کی تنظیم محض روحانی یا اعلیٰ خیالات و نظریات کے بل پر کی جا سکتی ہے، کیونکہ وہ معاشرے کو ان میں سے کسی ایک یا کچھ پہلوؤں کا مترادف نہیں سمجھتا، بلکہ ان تمام کا مجموعہ گردانتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔ اور ان کی ترکیب و ترتیب سے ایک متناسب کُل کو وجود میں لاتا ہے۔

اسلام کی تیسری خصوصیت

تیسری بات یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بحیثیت ایک معاشرتی نظریہ اور اقتصادی نظام کے، اسلام اپنی ایک مستقل اور منفرد شان رکھتا ہے۔ بعض فروعی مسائل اور تفصیلات میں چند ظاہری مشابہتوں کے باوجود یہ نہ کمیونزم سے کوئی تعلق رکھتا ہے، اور نہ سرمایہ دارانہ نظام سے۔ اس میں دونوں نظاموں کی خُوبیاں موجود ہیں، مگر ان کی کمزوریوں اور خامیوں سے اس کا دامن پاک ہے۔ یہ نہ تو فرد کو جدید مغرب کی طرح حد سے زیادہ اہمیت دیتا ہے کہ معاشرہ اس کے مقابلے میں بالکل بے بس ہو کر رہ جائے اور کسی حال میں بھی فرد پر کوئی گرفت کر ہی نہ سکے کہ کہیں اس کی آزادی پامال نہ ہو جائے۔ فرد کی بے حد

سے بڑھی ہوئی آزادی جدید سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہے — اور اسے کھلی چھٹی دیتی ہے کہ وہ دوسرے افراد حتیٰ کہ خود معاشرے کے لیے جس نے اس کو پروان چڑھایا اور اسے انفرادیت عطا کی' خطرہ اور مصیبت بن جائے۔ دوسری طرف معاشرتی زندگی پر بحث کرتے ہوئے اسلام معاشرے کی اہمیت میں بھی غلو نہیں کرتا' جیسا کہ موجودہ زمانے میں مشرقی یورپ کی اشتراکی حکومتوں کا خاصہ بن چکا ہے۔ ان حکومتوں میں اہمیت جو کچھ بھی ہے وہ اجتماع کی ہے۔ وہی زندگی کی اساس ہے۔ فرد کو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت یا اہمیت حاصل نہیں اور نہ معاشرے سے الگ اس کی ہستی کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ نتیجۃً ان ممالک میں قوت اور آزادی کا منبع صرف اجتماع ہے' فرد کو نہ یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاشرے کی بالادستی کو چیلنج کرے' اور نہ اس کو اپنے مطالبات کے حق میں منہ کھولنے کی اجازت ہے۔ اسی نظریے کی کوکھ سے اشتراکیت نے جنم لیا' جس کا دعویٰ ہے کہ افراد کی قسمتوں کی مالک تنہا ریاست ہے' جس کو اپنے افراد پر لامحدود اور کلی اختیارات حاصل ہیں کہ انہیں جس سانچے میں چاہے ڈھالے۔

معاشرتی نظام کی بنیاد

اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کی ان دو انتہاؤں کو چھوڑ کر اسلام اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ یہ فرد اور اجتماع دونوں کو یکساں طور پر اہمیت دیتا ہے' اور ان میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کرتا ہے کہ فرد کو اپنی صلاحیتیں بڑھانے اور انہیں پروان چڑھانے کے لیے ضروری آزادی حاصل رہتی ہے' مگر اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ دوسرے افراد کی حق تلفی کرے یا ان پر ظلم و زیادتی کا مرتکب ہو۔ دوسری طرف اسلام معاشرے کو یا اس کی ہیئت منتظمہ یعنی ریاست کو معاشرتی اور اقتصادی روابط کی تنظیم کے سلسلے میں وسیع اختیارات دیتا ہے تاکہ انسانی زندگی میں ہم آہنگی اور توافق کو برقرار رکھا جاسکے۔ اسلام کے اس معاشرتی نظام کی بنیاد فرد اور اجتماع کا باہمی رشتۂ مؤدت و الفت ہے۔ اشتراکی معاشرے کی طرح یہ نفرت اور طبقاتی کشمکش کی پیداوار نہیں ہے۔

الہامی ضابطۂ حیات

یہاں پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام کا یہ منفرد نظامِ زندگی اقتصادی عوامل یا حالات کا نتیجہ نہیں، اور نہ اس کا وجود مختلف طبقات کے متصادم مفادات کے ٹکراؤ کی پیداوار ہے۔ نہیں، بلکہ یہ ایک الہامی ضابطۂ حیات ہے، جو ایک ایسے دور میں انسان کو ملا تھا جب اس کی زندگی میں نہ اقتصادی عوامل کو کوئی خصوصی اہمیت حاصل تھی، اور نہ وہ معاشرتی انصاف کے موجودہ مفہوم سے آشنا تھا؛ چنانچہ انسان کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی کی اصلاح کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام کے مقابلے میں اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں بہت بعد کے زمانے کی پیداوار ہیں۔ تاریخی لحاظ سے اسلام کو ان دونوں کے مقابلے میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔

بُنیادی ضروریاتِ زندگی

مثال کے طور پر انسان کی بُنیادی ضروریاتِ زندگی ہی کا مسئلہ لیجیے۔ بالعموم کہا جاتا ہے کہ کارل مارکس پہلا انسان تھا، جس نے خوراک، مکان اور جنسی آسودگی کو بنیادی ضروریات قرار دیتے ہُوئے حکومت پر لازم کیا کہ وہ اپنے زیرِ سایہ تمام افراد انسانی کے لیے یہ ضروریات مہیا کرے۔ کارل مارکس کے اس اعلان کو فکرِ انسانی میں بہت بڑا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ کارل مارکس کے پیدا ہونے سے تیرہ صدی پیشتر اسلام کے ذریعے دُنیا اس انقلاب آفرین اعلان سے بخوبی آشنا ہو چکی تھی؛ چنانچہ اس سلسلے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "جو شخص ہمارے (یعنی ریاستِ اسلامی کے) عامل کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہا ہے، اور بیوی سے محروم ہے، اس کی شادی کرائی جائے گی۔ اگر اس کے پاس مکان نہیں، تو رہنے کے لیے مکان دیا جائے گا، اگر خادم نہیں تو اُسے خادم مہیا کیا جائے گا، اور اگر اس کے پاس سواری کے لیے کوئی جانور نہیں ہے، تو اس کے لیے سواری کا بندوبست کیا جائے گا۔" آپؐ کے اس تاریخی اعلان میں نہ صرف وہ بُنیادی انسانی حقوق موجود ہیں جن کا اعلان بعد میں کارل مارکس نے کیا، بلکہ بہت کچھ اور بھی شامل

ہے مگر اشتراکیت کی طرح اسلام ان کی قیمت طبقاتی منافرت، خونی انقلابات اور ان تمام اعلیٰ اقدارِ حیات کی یک قلم نفی کی صورت میں وصول نہیں کرتا، جو خوراک، مکان اور جنس پرستی کے تنگ دائرہ میں بہرحال مقید نہیں کی جاسکتیں۔

دائمی نظامِ حیات

اسلام کے نظامِ حیات کی یہ بعض نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ بحیثیت مذہب اسلام ایسے جامع اور ہمہ گیر قوانین اور اصولوں سے عبارت ہے کہ انسانی زندگی اپنی تمام بوقلمونیوں اور وسعتوں کے ساتھ ان کے دائرے میں جلوہ گر نظر آتی ہے اور اس کا کوئی گوشہ خواہ وہ جذبات کی دنیا سے متعلق ہو، یا خیالات، افعال، عبادات، معاشی معاملات، معاشرتی تعلقات، جبلی محرکات اور روحانی تحریکات سے اس کی گرفت سے آزاد نہیں رہتا، ان مختلف النوع پہلوؤں میں توافق پیدا کر کے اسلام انہیں ایک حسین متناسب اور منفرد نظامِ حیات کی صورت بخشتا ہے۔ کیا ایسا ہمہ گیر، متناسب اور منفرد نظامِ حیات کسی زمانہ میں بھی اپنی افادیت کھو سکتا ہے ؟ کیا انسان واقعی اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے، یقیناً یہ نظامِ زیست کبھی فرسودگی کا شکار نہیں ہو سکتا، نہ اس سے انسان بے نیاز رہ سکتا ہے کیونکہ اپنے مقاصد اور نصب العین کے لحاظ سے یہ خود زندگی کے مترادف ہے، بلکہ خود زندگی ہے، چنانچہ جب تک اس کرۂ ارض پر زندگی پائی جائے گی، یہ نظام بھی موجود اور باقی رہے گا اور ثباتِ دوام کا یہ نقش کبھی مٹایا نہ جا سکے گا!

عصرِ حاضر کی ضرورت

عصرِ حاضر میں جو صورتِ حال پائی جاتی ہے اور اس کو جو مسائل درپیش ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے کسی معقول انسان کے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ جدید انسان کسی عقلی بنیاد پر اسلام سے روگردانی کر سکتا ہے، اور اس کے پیش کردہ نظامِ زیست سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ آج کی بیسویں صدی میں بھی انسانیت ان تمام خرابیوں میں مبتلا ہے، جن کی

وہ اپنے دَورِ وحشت میں شکار تھی۔ ترقی اور روشن خیالی کے اس دَور میں بھی انسانیت نسلی منافرت کی انتہائی مکروہ اور گھناؤنی صورتوں سے دوچار ہے' مثال درکار ہو تو امریکہ اور جنوبی افریقہ ہی پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ اخلاق' تہذیب اور انسانیت کے باب میں بیسویں صدی کے انسان کو ابھی اسلام سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ مُدت ہُوئی کہ جب اسلام نے آکر انسانیت کو تمام نسلی تعصبات اور عصبیتوں سے نجات دلائی تھی' آج بھی صرف اسلام ہی دُنیا کو نفرت کی اس دلدل سے نکال سکتا ہے' کیونکہ اسلام انسانی مساوات کا ایک حسین تصور ہی پیش کر کے نہیں رہ جاتا' بلکہ عمل کی دُنیا میں بھی وہ ایسی مکمل مساوات قائم کر کے دکھا چکا ہے' جس کی تاریخ عالم میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اسلام کے ایک مثالی دَور میں کسی کالے کو گورے پر رنگ یا نسل کی بنا پر کوئی فضیلت حاصل نہ تھی۔ اس کے ہاں فضیلت اور برتری کی واحد بُنیاد انسان کی نیکی اور خدا ترسی تھی؛ چنانچہ اسلام نے غلاموں کو غلامی کی لعنت ہی سے نجات نہیں دلائی' بلکہ انہیں ترقی اور خوشحالی کے وسیع امکانات سے بھی بہرہ ور کیا' حتیٰ کہ غلاموں کے لیے سربراہِ مملکت کے عہدے پر فائز ہونے کے حق کو بھی تسلیم کیا؛ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سُنو اور اپنے امیر کی اطاعت کرو' خواہ یہ امیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو اس کی اطاعت کرو' جب تک وہ تمہیں خدا کی شریعت کے مطابق چلاتا رہے۔"

شہری آزادیوں کا احترام

آج کی دُنیا ایک اَور پہلو سے بھی اسلام کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ استعمار اور استبداد کے ہاتھوں آج انسانیت جس کرب والم میں مبتلا اور جس وحشت و درندگی کی شکار ہے' ان سے بچنے کی کوئی اَور راہ بجز اسلام نظر نہیں آتی۔ اسلام ہی انسانیت کو استعمار اور استبداد کی ان لعنتوں سے چھٹکارا دلا سکتا ہے' کیونکہ یہ سامراج اور سامراجی لُوٹ کھسوٹ کا شدید مخالف ہے۔ اپنے عروج کے زمانے میں مُسلمانوں کا اپنی مفتوح اقوام سے سلوک اتنا فراخ دلانہ' اعلیٰ اور شریفانہ تھا کہ جدید یورپ کے ناٹے قد کے انسان کی نگاہیں اب بھی اس کی بلندیوں کی رمز شناس نہیں ہو سکتیں۔ اس ضمن میں

حضرت عمرؓ بن الخطاب کے مشہور عدالتی فیصلہ کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جس میں ایک قبطی کو بلاوجہ مارنے اور ستانے پر آپ نے مصر کے نامور فاتح اور معزز گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کو کوڑے لگانے کی سزا دی تھی، بلکہ خود باپ کو بھی سزا دینے پر آمادہ ہو گئے تھے! اس ایک مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی مملکت کے شہریوں کو کتنی شہری آزادیاں حاصل تھیں۔

سرمایہ داری کی لعنت

اس وقت سرمایہ دارانہ نظام کی جو لعنت دُنیا پر مسلط ہے، اور جس نے ساری زندگی کو مسموم کر رکھا ہے، اس سے چھٹکارے کی راہ بھی اسلام کے سوا اور کوئی نہیں ہے ــــ سُود خوری اور زر اندوزی، جن کی بُنیادوں پر سرمایہ دارانہ نظام کا سارا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے، اسلام ان دونوں کا شدید مخالف ہے، اور ان کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دُنیا سے سرمایہ داری کی لائی ہُوئی خرابیوں کو صرف اسلام ہی دُور کر سکتا ہے۔

اشتراکیت کا استیصال

اسی طرح مادہ پرست اور بے خدا اشتراکیت کا استیصال بھی صرف اسلام کے ہاتھوں ممکن ہے، کیونکہ وہ نہ صرف مکمل معاشرتی انصاف قائم کرتا اور اسے برقرار رکھتا ہے، بلکہ اعلیٰ انسانی اور رُوحانی قدروں کی حفاظت بھی کرتا ہے، کیونکہ وہ اشتراکیت کی طرح کسی قسم کی تنگ نظری کا شکار نہیں ہے کہ اس کی دُنیا بس محسوسات کے دائرے تک ہی محدود ہو، مگر اپنی ان تمام خوبیوں کے باوصف اسلام دوسروں سے اپنی بات کسی زور زبردستی سے نہیں منواتا، کیونکہ عقیدے اور مذہب کے معاملہ میں وہ کسی سختی کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے کہ اس کو پرولتاری آمریت کے عصائے آہنی کی ضرورت لاحق ہو، اس سلسلے میں اس کا اصول یہ ہے کہ :

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ — دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے (۲:۲۵۶)

اس وقت دُنیا پر تیسری عالمگیر جنگ کے جو تاریک بادل چھائے ہُوئے ہیں ان کے چھٹنے کی بھی کوئی اَور صورت اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ آفتابِ اسلام طلوع ہو مگر یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ بنی نوع انسان اسلام کو اپنی زندگی کا ہادی اور رہبر بنانے اور حقیقی امن وسلامتی کی اس راہ پر چلنے کے لیے آمادہ ہو۔

الغرض اسلام کا دَور ختم نہیں ہو چکا' دراصل اب شروع ہُوا ہے۔ یہ کوئی بے جان نظریہ نہیں ہے' بلکہ ایک انقلاب آفرین نظامِ حیات ہے اور اس کا مستقبل اتنا ہی روشن اور تابناک ہے' جتنا کہ اس کا ماضی شاندار رہے' جب ساری دُنیا اس کے نُور سے جگمگا اُٹھی تھی اور یورپ ابھی تاریخ کے اندھیرے غاروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔

اسلام اور غلامی کا مسئلہ

غلامی کا مسئلہ ان ذلیل ہتھکنڈوں کی بدترین مثال ہے، جو مسلمان نوجوانوں کو اپنے دین سے بیزار اور منحرف کرنے کے لیے کمیونسٹ بالعموم استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اسلام زندگی کے تمام ادوار کے لیے موزوں اور ان کی ضروریات سے ہم آہنگ ہوتا، تو وہ انسانوں کو غلام بنانے کی اجازت نہیں دیتا، اور نہ غلامی کو برداشت کرتا؛ چنانچہ غلامی کے مسئلے کا پایا جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دین تاریخ کے ایک خاص دور کے لیے تھا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، یہ اپنے مشن کی تکمیل کر چکا ہے اور اب فرسودہ ہو چکا ہے، کیونکہ یہ تمام زمانوں اور ادوار کے لیے نہیں تھا۔

شبہات کے گرداب میں

مخلص مسلمان نوجوان بھی شکوک و شبہات کی اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے دلوں میں بھی مختلف شکوک و شبہات ابھرنے لگتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں اسلام نے غلامی کی اجازت کیوں دی ہے؟ بیشک اسلام خدا کا نازل کردہ دین ہے، اور اس کا مقصد ہر زمان و مکان کے افراد انسانی کی فلاح ہے، مگر غلامی کو اس نے کیونکر برداشت کر لیا؟ اسلام نے جس کی بنیاد ہی کامل مساوات انسانی کے اصول پر ہے، اور جو تمام بنی آدم کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد قرار دیتا ہے اور جس نے معاشرتی زندگی کی تشکیل نو مساوات کے اس کامل تصور پر عملاً بھی کر کے دکھا دی تھی، اس نے غلامی کو اپنے معاشرتی نظام میں کیوں جگہ دی اور اس کے لیے مختلف ضابطے اور قوانین مرتب کر ڈالے؟ کیا اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ

نوع انسانی دائمی طور پر آقاؤں اور غلاموں کے دو مستقل طبقوں میں بٹی رہے؟ کیا اس کی مشیت یہی ہے کہ انسانوں میں ایک طبقہ بے زبان حیوانوں کی مانند منڈیوں میں بیچا اور خریدا جاتا رہے، جب کہ خود اس نے اپنی کتاب پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ — اور بیشک ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی (۱۷:۷۰)

اور اگر منشائے الٰہی یہ نہیں تھا، تو اس نے اپنی کتاب میں اس کی صریح ممانعت کا اعلان کیوں نہیں کیا، جیسا کہ شراب، جوئے اور سُود کے بارے میں کیا گیا۔ الغرض آج کا مُسلمان نوجوان یہ تو جانتا ہے کہ اسلام سچّا دِین ہے، مگر حضرت ابراہیمؑ کی مانند وہ اضطراب اور تحیّر کی اس کیفیت سے دوچار ہے۔ جس کا نقشہ قرآنِ پاک کی اس آیت میں کھینچا گیا ہے :

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ

"جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ میرے مالک! مجھے دکھا دے، تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ فرمایا: کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا ایمان تو رکھتا ہوں مگر دِل کا اطمینان درکار ہے۔"

اس کے برعکس استعماری طاقتوں کی شرارتوں اور سازشوں نے جن لوگوں کی عقلیں مار ڈالی ہیں اور جن کے عقائد و نظریات پر پریشان خیالی اور پراگندہ فکری کا غلبہ ہے، وہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، ان میں وہ صبر اور حوصلہ ہی نہیں ہے جو کسی صداقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے؛ چنانچہ یہ لوگ اپنے جذبات اور خواہشات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اسلام قصۂ ماضی بن چکا ہے، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔

اشتراکی فریب کی حقیقت

اشتراکی پرچارک لوگوں کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ وہ سائنٹیفک نظریات کے

حامل ہیں، مگر ان کے ان سائنٹفک نظریات کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کے اپنے ذہنوں کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے غیر ملکی آقاؤں ہی سے مستعار لیے ہیں، اس کے باوجود یہ لوگ اپنے ان مستعار خیالات کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ گویا کوئی بہت بڑی ابدی اور تغیر نا آشنا صداقت ہے جو انہوں نے دریافت کی ہے جس کے بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ جس "صداقت" کی دریافت کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں، وہ جدلی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) کا نظریہ ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسانی زندگی چند مخصوص اور ناگزیر معاشی مراحل میں سے گزرتی ہے، اس کا پہلا مرحلہ اشتراکیت ہے، دوسرا غلامی، جاگیرداری اور سرمایہ داری پر مشتمل ہے تیسرا اور آخری مرحلہ، جو اس نظریے کے نزدیک تاریخ انسانی کا آخری باب ہے، اشتراکیت ثانیہ کا مرحلہ ہے۔ اس نظریے کی رو سے وہ تمام عقائد، نظریات اور نظام ہائے فکر و عمل، جن سے نسل انسانی کو تاریخ میں واسطہ رہا ہے، دراصل اپنے اپنے ادوار کے مخصوص معاشی نظام یا معاشرتی حالات و واقعات کا محض عکس تھے، اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ماضی میں پیدا ہونے والے عقائد، نظریات اور نظام ہائے فلسفہ اپنے اپنے دَور کے لیے خوب تھے، کیونکہ وہ اس زمانے کے معاشی ڈھانچے اور اقتصادی حالات سے پوری طرح ہم آہنگ تھے، مگر وہ بعد کے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ادوار کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے، کیونکہ ہر دَور کے اپنے مخصوص اقتصادی حالات ہوتے ہیں، جن پر اس کے نظامِ افکار کی اساس ہوتی ہے۔ ہر نئے دَور کا نظامِ فکر پچھلے ادوار سے بہتر اور زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ انسانی زندگی کے لیے کوئی ایسا منفرد اور دائمی نظامِ حیات وضع نہیں کیا جا سکتا، جو آنے والے ہر زمانے کے لیے موزوں اور مناسب ہو۔ اسلام ایک ایسے دَور میں آیا تھا، جب غلامی کا دَور خاتمے کے قریب آ لگا تھا، اور دورِ جاگیرداری کا آغاز ہو رہا تھا، اس لیے اس نے ایسے قوانین، عقائد اور زندگی کا نظام پیش کیا، جن میں اس دَور کے مخصوص اقتصادی پس منظر کی واضح جھلک موجود ہے۔ مروجہ غلامی کو سندِ تصدیق عطا کرنے، اور ساتھ ہی ساتھ جاگیردارانہ

نظام کو بھی برقرار رکھنے کی علت یہی ہے، کیونکہ کارل مارکس کے فرمان دلپذیر کے مطابق یہ ممکن ہی نہ تھا کہ آئندہ پیش آنے والے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ معاشی حالات کی عدم موجودگی میں اسلام ان کی ضروریات سے ہم آہنگ قوانین اور دستورِ حیات مرتب کر سکتا۔

اشتراکیت کے اس دعوے کی حقیقت کیا ہے؟ اسے معلوم کرنے کے لیے آئیے غلامی کے مسئلے کا اس کے صحیح تاریخی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟

غلامی کی بھیانک تصویر

آج کا انسان اپنی بیسویں صدی کے ذہنی پس منظر میں جب غلامی کے مسئلے پر نظر ڈالتا ہے۔ اور اس کی تاریخ کو انسانوں کی تجارت اور عہدِ روما کے گھناؤنے جرائم سے داغدار پاتا ہے، تو غلامی کی ایک نہایت مکروہ اور بھیانک تصویر اس کے سامنے آتی ہے۔ اس کے لیے یہ باور کرنا آسان نہیں رہتا کہ کوئی مذہب یا نظامِ زندگی غلامی کو جائز قرار دے سکتا ہے یا اسلام جس کے بیشتر اصول اور قوانین انسان کے لیے غلامی کی ہر نوع سے آزادی کے تصور پر مبنی ہیں، اس کے جواز کا فتویٰ دے سکتا ہے، مگر یہ اندازِ فکر اسلام سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، کیونکہ غلامی کی اس مکروہ تصویر کا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام کا کارنامہ

اس سلسلے میں آئیے ذرا تاریخ کی شہادت بھی لیتے چلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رومی دور کے تاریک اور بھیانک جرائم سے اسلامی تاریخ قطعاً ناآشنا ہے۔ روما کی سلطنت میں غلام جس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے، اس کے بارے میں ہمارے پاس شواہد کوائف کا خاصا وسیع ذخیرہ موجود ہے، اس کی روشنی میں ہمیں اس انقلابِ عظیم کا بخوبی اندازہ

ہو سکتا ہے، جو اسلام کی بدولت غلاموں کی دُنیا میں رونما ہُوا۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تھی، مگر اسلام نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انسانی آزادی کا صحیح تصور پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔

عہدِ روما میں غلامی

رومیوں کے عہدِ حکومت میں غلاموں کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا تھا، بلکہ محض جنسِ تجارت خیال کیا جاتا تھا۔ انہیں کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے، مگر کٹھن فرائض اور ذمہ داریوں سے وہ گرانبار رہتے تھے۔ یہ غلام کہاں سے آتے تھے؟ ان کا سب سے بڑا ذریعہ جنگیں تھیں، جو کسی بڑے نصب العین یا اصولوں کی خاطر نہیں لڑی جاتی تھیں، بلکہ دُوسروں کو غلام بنا کر انہیں اپنے خود غرضانہ مقاصد کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے برپا کی جاتی تھیں؛ چنانچہ ان جنگوں میں جو لوگ پکڑے جاتے، وہ سب کے سب غلام بنا لیے جاتے تھے ——— ان جنگوں کا مقصد اہلِ روما کے لیے عیش و عشرت کے سامان، ٹھنڈے اور گرم حمام، ملبوساتِ فاخرہ، لذیذ کھانے اور دوسرے لذائذِ حیات فراہم کرنا تھا؛ چنانچہ قحبہ گری، میخواری، رقص و سرود کی محفلیں، ثقافتی مجالس اور میلے ٹھیلے ان میں عام تھے۔ مادی آسائش اور عیاشی کے اس سروسامان کو حاصل کرنے کے لیے اہلِ روما دوسری قوموں پر چڑھ دوڑتے تھے، اور انہیں غلام بنا کر بے دردی سے اپنی بوالہوسی اور ہوس ناکی کا شکار بناتے تھے۔ مصر، جس کو اسلام نے آکر رومیوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کیا، رومی عہد میں اسی قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بنا رہا ہے۔ رومی سلطنت کے لیے یہ مُلک محض گندم کی منڈی تھی، یا مادی سازوسامان کی فراہمی کا ایک ذریعہ۔

غلاموں کی حالتِ زار

رومی استعمار کی حرص و ہوس کے لیے سامانِ عیش و عشرت فراہم کرنے کی خاطر غلاموں کے ریوڑ دن بھر کھیتوں میں جُتے رہتے تھے، مگر اس کے باوجود انہیں پیٹ بھر کر

کھانے کو بھی نصیب نہ ہوتا تھا، بلکہ صرف اتنا دیا جاتا کہ جس سے ان کا رشتۂ جسم و روح برقرار رہے اور وہ اپنے آقاؤں کے لیے کام کرتے رہیں۔ بے جان درختوں اور وحشی درندوں سے بھی ان کی حالت گئی گزری تھی۔ دن کو کام کے اوقات میں انہیں بیڑیاں پہنادی جاتی تھیں تاکہ وہ اپنے نگرانوں کی آنکھ بچا کر نکل نہ جائیں۔ ان کی پیٹھوں پر بے تحاشا کوڑے برسائے جاتے، کیونکہ ان کا آقا یا اس کا مقامی کارکن انہیں ستانے اور اذیت دینے میں لذّت محسوس کرتا تھا۔ شام کو جب کام ختم ہو جاتا، تو دس دس پچاس پچاس کی مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر مویشیوں کی طرح انہیں غلیظ، بدبُودار اور چوہوں اور کیڑے مکوڑوں سے پٹے ہُوئے باڑوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں اس حالت میں بھی بیڑیوں سے آزاد نہیں ہوتے تھے۔ مویشیوں کو کھُلے اور وسیع باڑوں میں رکھا جاتا تھا، مگر یہ لوگ زندگی کی اس سہولت سے بھی محروم تھے۔

رومی زندگی کا گھناؤنا پہلو

مگر غلاموں کے بارے میں اہلِ روما کے رویّہ کی مکروہ ترین اور انتہائی گھناؤنی تصویر ہمیں ان کی محبوب اور دِل پسند تفریح میں نظر آتی ہے۔ اس سے اُس وحشت و بربریت اور درندگی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے، جو رومی تہذیب کے مزاج میں رچی بسی تھی اور جو دورِ جدید میں یورپ اور امریکہ نے اپنے جملہ استعماری ذرائع و وسائل کے ساتھ ورثے میں پائی ہے۔

ایک وحشیانہ کھیل

آقاؤں کی ضیافتِ طبع کے لیے کچھ غلاموں کو تلواریں اور نیزے دے کر ایک اکھاڑے میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ اکھاڑے کے چاروں طرف تماشائیوں کے لیے نشستیں بنی ہوتی تھیں۔ جن پر ان غلاموں کے آقا اور بسا اوقات خود شہنشاہِ روم بدنفسِ نفیس اور رونق افروز ہوتا تھا۔ کھیل شروع ہوتا تھا، تو غلام تلواروں اور نیزوں سے ایک دوسرے پر پل پڑتے

تھے۔ یہاں تک کہ بالآخر ان کا قیمہ بن جاتا۔ جو خوش قسمت موت کے اس کھیل سے زندہ بچ جاتے تھے، وہ فاتح سمجھے جاتے تھے۔ انہیں دِل کھول کر داد دی جاتی۔ زور شور سے تالیاں پیٹیں اور خوشی کے نعروں اور قہقہوں سے ان کا استقبال کیا جاتا۔

عہدِ روما میں غلام کی حیثیت

رومی دُنیا میں بس یہی غلام کی معاشرتی حیثیت تھی۔ اس موقع پر ہم رومی قانون کی نگاہ میں غلام کی حیثیت کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے اور نہ آقاؤں کے ان جابرانہ اختیارات کے تذکرے کی کوئی حاجت سمجھتے ہیں، جن کی رُو سے غلام کی زندگی اور موت ان کی مرضی پر منحصر تھی، اور وہ پُوری بے دردی اور بے خوفی سے انہیں اپنے مذموم مقاصد کا آلۂ کار بنا سکتے تھے، کیونکہ غلاموں کو معاشرے کے کسی طبقے کی اخلاقی حمایت حاصل نہیں تھی۔

عام دُنیا میں غلاموں کی حالتِ زار

ایران، ہندوستان اور دُنیا کے دُوسرے مُلکوں کے غلام بھی مظلومی اور بے بسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ رومی غلاموں کے مقابلے میں ان کی حالت بھی کسی لحاظ سے بہتر نہ تھی۔ جزوی اختلافات کے باوجود دُنیا کے مختلف مُلکوں میں غلام کی حیثیت اور اس کے معاشرتی مقام کے بارے میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ اس کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ نہ اس کا قتل کوئی ایسا جُرم تھا جس پر قصاص لازم آتا ہو، غلاموں پر فرائض اور ذمہ داریاں کا کمر شکن بار تھا، مگر ان کے مقابلے میں ان کے حقوق بمنزلۂ صفر تھے۔ دُنیا کے ان تمام ممالک میں غلاموں کے متعلق نہ نقطۂ نظر کا اختلاف تھا اور نہ ان کے معاشرتی حقوق میں کچھ فرق تھا، بلکہ فرق جو کچھ تھا، وہ غلام کے بارے میں ان کے طرزِ عمل کی شناعت اور ظلم کی سنگینی کے درجے میں تھا۔ کہیں وہ ظلم و ستم کے زیادہ گھناؤنے مظاہر سے دوچار تھا اور کہیں ذرا ہلکے اور نسبتاً کم گھناؤنے ہتھکنڈوں کا شکار۔

اسلام کا انقلاب آفریں اعلان

یہ تھے وہ حالات جن میں اسلام کا ظہور ہوا۔ اس نے غلاموں کو ان کی کھوئی ہوئی انسانی عظمت دوبارہ عطا کی، اس نے آقاؤں اور غلاموں دونوں کو مخاطب کر کے صاف صاف کہا:

بَعۡضُكُم مِّنۢ بَعۡضٍ ۚ — تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو۔ (۴:۲۵)

اس نے اعلان کیا کہ "جو ہمارے کسی غلام کو قتل کرے گا، وہ اس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا، جو اس کی ناک کاٹے گا، اس کی ناک کاٹی جائے گی، اور جو اس کی خصی کرے گا اس کے بدلے میں وہ بھی خصی کرا دیا جائے گا۔"[1] اس نے غلاموں اور آقاؤں بالفاظِ دیگر تمام انسانوں کے مشترک نقطۂ آغاز، مشترک جائے قرار اور مشترک انجام کو واضح کیا اور بتایا "تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے تھا۔"[2] چنانچہ اس نے آقا کو غلام پر محض آقائی کے بل پر کوئی فضیلت عطا نہیں کی، بلکہ فضیلت کے لیے محض تقویٰ اور نیکی کو بنیاد قرار دیا: "کسی عرب کو غیر عرب پر، کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت سوائے تقویٰ کے حاصل نہیں ہے۔"[3]

عادلانہ برتاؤ کی تعلیم

اسلام نے آقاؤں کو اپنے غلاموں سے اچھے اور عادلانہ برتاؤ کی تعلیم دی:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ

ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی

---

[1] حدیث صحیحین، ترمذی، نسائی اور ابوداؤد۔

[2] حدیث مسلم و ابوداؤد۔ [3] البخاری۔

الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۙ

رشتہ دار سے، اجنبی ہمسائے سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو۔ یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔

(۴:۳۶)

باہمی تعلق کی اصل بنیاد

اسلام نے یہ حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کی کہ آقا اور غلام کے مابین اصل رشتہ آقائی اور غلامی کا یا حاکم اور محکوم کا نہیں ہے، بلکہ بھائی چارے اور قرابت داری کا ہے، چنانچہ آقاؤں کو اپنی مملوکہ لونڈیوں سے یہ کہہ کر شادی کرنے کی اجازت دی گئی کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔

جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے، اسے چاہیے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے۔ جو تمہارے قبضے میں ہوں اور مومنہ ہوں۔ اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے۔ تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو، لہٰذا ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو اور معروف طریقے سے ان کے مہر ادا کرو۔

(۴:۲۵)

غلام کا انسانی تصوّر

اس نے آقاؤں کو سمجھایا کہ ان کے غلام ان کے بھائی ہیں، چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں، لہٰذا تم میں سے جس کے

قبضے میں اس کا کوئی بھائی ہو اس کو چاہیے کہ وہ اس کو ویسا ہی کھلائے اور پہنائے جیسا وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے اور اس کو کوئی ایسا کام کرنے کو نہ کہے جس کو کرنے کی وہ استطاعت نہ رکھتا ہو اور اگر کبھی اسے ایسا کام کرنے کو کہے تو خود بھی اس میں اس کا ہاتھ بٹائے۔"[1] یہی نہیں بلکہ اسلام نے غلاموں کے جذبات و احساسات تک کا احترام کیا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "تم میں سے کوئی (اپنے غلام کے بارے میں) یہ نہ کہے کہ یہ میرا غلام اور یہ میری لونڈی ہے۔ اس کے بجائے اس کو یوں کہنا چاہیے کہ یہ میرا خادم اور یہ میری خادمہ ہے۔"[2] یہ اسی تعلیم کا اعجاز تھا کہ جب ابوہریرہؓ نے ایک آدمی کو گھوڑے پر سوار اور اس کے غلام کو اس کے پیچھے پیدل جاتے دیکھا تو اس نے گھڑ سوار سے کہا: "اس کو گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھالو، کیونکہ وہ تمہارا بھائی ہے اور وہ بھی ویسی ہی روح رکھتا ہے جیسی تم رکھتے ہو۔"

غلاموں کی فلاح کے لیے اسلام کے کارناموں کی داستان بس یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، وہ بہت طویل ہے مگر آگے بڑھنے سے پیشتر ہم چاہتے ہیں کہ اس عظیم انقلاب کے خدوخال بھی مختصر طور پر واضح کرتے چلیں، جو اسلام کی بدولت اس پہلے مرحلے میں غلام کے معاشرتی مقام و مرتبہ میں نمایاں ہوا۔

اسلامی انقلاب کے بعد

اسلام کی آمد کے بعد غلام کی حالت میں جو تغیر آیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محض جنسِ تجارت نہ رہا، بلکہ پہلی بار پورے انسانیت کے حقوق اور احترام سے بہرہ ور ہوا۔ اسلام سے پہلے اس کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا تھا، بلکہ ایک مختلف اور ادنیٰ درجے کی مخلوق خیال کیا جاتا تھا، جس کا مقصدِ وجود صرف یہ تھا کہ وہ دوسروں کی خدمت

---

[1] البخاری۔

[2] حدیث، روایت حضرت ابوہریرہؓ۔

خدمت کرے اور ان کے ہاتھوں ہر طرح کی ذلت و تحقیر، صبر و شکر سے برداشت کرتا اور سہتا رہے۔ غلام کے بارے میں اسی نقطۂ نظر کا نتیجہ تھا کہ غلاموں کو بے دریغ ہلاک کیا جاتا، وحشیانہ سزاؤں کا تختۂ مشق بنایا جاتا اور انہیں انتہائی غلیظ اور مشکل کام کرنے پر مجبور کیا جاتا، مگر اس کے باوجود کسی ضمیر میں کوئی چبھن محسوس نہ ہوتی تھی۔ اسلام نے غلاموں کو اس پست سطح سے اُٹھا کر آزاد انسانوں کی برادری میں شامل کیا۔ اسلام کے یہ کارنامے محض خوش آئند اعلانات نہیں ہیں، بلکہ تاریخ کے ٹھوس حقائق ہیں، جن پر اس کے صفحات گواہ ہیں۔

یورپ کی شہادت

یورپ کے متعصب مصنفین بھی یہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کے دَورِ اوّل میں غلاموں کو ایک ایسا بلند معاشرتی مقام حاصل تھا جس کی نظیر دُنیا کی کسی اور قوم یا خطے میں نہیں ملتی۔ مسلم معاشرے نے انہیں ایک ایسا باعزّت مقام بخشا کہ بندِ غلامی سے رہائی کے بعد بھی کوئی غلام اپنے سابقہ آقاؤں کے خلاف غداری کا تصوّر تک نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اسے انتہائی مکروہ اور قابلِ نفرت فعل خیال کرتا تھا، اگرچہ آزادی کے بعد سابق آقا سے اس کو نہ کسی قسم کا کوئی خوف تھا، اور نہ وہ پہلے کی طرح اب اس کا محتاج اور دست نگر تھا، بلکہ اسی طرح کا ایک آزاد انسان تھا، جس طرح کا اس کا پُرانا آقا، چنانچہ آزادی کے بعد غلاموں کے اس رویّے کی وجہ خوف یا احتیاج نہیں تھی، بلکہ صرف یہ

ل مثال کے طور پر ہندوستان کے ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ شودر برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ شودر پیدائشی طور پر ذلیل اور حقیر ہیں۔ اور یہ ذلت اور تحقیر ان کی اٹل تقدیر ہے اس لیے ان کے لیے واحد معقول رویّہ یہ ہے کہ وہ صبر و شکر سے ہر طرح کی تذلیل کو محض اس توقع پر برداشت کرتے رہیں کہ موت کے بعد وہ کسی اور بہتر جُون میں جنم لیں گے، بالفاظِ دیگر انہیں اپنے جبر و ظلم کا شکار بنانے والوں نے ان کو صرف جسمانی طور پر ہی غلام بنانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یہ عقیدہ پیدا کر کے ان کو اس غلامانہ نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی خواہش اور ارادے سے بھی محروم کر دیا، جس نے انہیں ہر طرح کی تذلیل اور مصائب کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔

تھی کہ آزاد ہونے کے بعد غلام اپنے آپ کو سابق گھرانے کا فرد سمجھتے تھے۔ اسلام نے انہیں ولایت کے ایک ایسے رشتے میں باہم جوڑ دیا تھا کہ جو خونی رشتے سے کسی طرح بھی کم مضبوط نہ تھا۔

غلام کی جان اور انسانیت کا احترام

مزید برآں ایک غلام کی جان بھی اب ویسے ہی محترم قرار پائی، جیسے کہ کسی آزاد انسان کی، اور خود قانون نے اس کی جان کی حفاظت کا ذمّہ لیا؛ چنانچہ اس کے خلاف قول یا عمل کی ہر زیادتی ممنوع قرار پائی۔ جہاں تک قول کا تعلق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو انہیں غلام کہہ کر پکارنے سے منع کر دیا اور انہیں تعلیم دی کہ وہ انہیں ایسے طریقے سے مخاطب کریں کہ جس سے ان کا ذہنی بُعد ختم ہو اور وہ اپنے آپ کو آقا کے کنبے کا فرد سمجھنے لگیں؛ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک خدا نے تمہیں ان کا آقا بنایا ہے۔ اگر وہ چاہتا، تو وہ تم کو بھی غلام بنا کر ان کے قبضۂ قدرت میں دے سکتا تھا۔"[1] گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا غلام بننا بعض خاص حالات اور واقعات کا نتیجہ تھا، دگرنہ ان میں اور ان کے آقاؤں میں بحیثیت انسان کے کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن اسلام نے ایک طرف آقاؤں کے بے جا فخر کو کم کیا، اور دوسری طرف غلاموں کے معاشرتی رُتبے کو بڑھا کر انہیں خالص انسانی رشتوں میں اپنے آقاؤں سے جوڑ دیا، اس سے آقا اور غلام ایک دوسرے کے قریب آ گئے، ان میں باہمی محبت بڑھی اور یہی محبت آگے چل کر تمام انسانی رشتوں کی اساس ٹھہری۔ جسمانی تکلیف یا نقصان پہنچانے پر آقا اور غلام دونوں کے لیے ایک سی تعزیرات بنائی گئیں، اور اس لحاظ سے ان میں کسی قسم کا کوئی فرق یا امتیاز روا نہ رکھا گیا۔ اسلام کا یہ اصول کہ "جو ہمارے غلام کو قتل کرے گا، وہ ہلاک کیا جائے گا۔" اپنے وسیع دائرۂ اثر کے لحاظ سے بہت واضح ہے۔ یہ خالص انسانی سطح پر آقا اور غلام کے درمیان مکمل مساوات قائم کرنا چاہتا ہے، اور چاہتا ہے

---

[1] حوالہ کے لیے براہِ کرم امام غزالیؒ کی کتاب احیاء العلوم الدین، باب غلاموں کے حقوق ملاحظہ فرمائیے۔

کہ انہیں زندگی میں برابر کے مواقع حاصل ہوں۔

غلاموں کے انسانی حقوق

اسلام نے اپنی تعلیم کے ذریعے یہ حقیقت بھی واشگاف کر دی کہ اپنی موجودہ حالتِ غلامی کی وجہ سے غلام اپنے کسی انسانی حقوق سے محروم نہیں ہو گئے ہیں۔ اسلامی شریعت کے یہ تحفظات نہ صرف غلام کی جان کی حفاظت کے لیے کافی تھے بلکہ اتنے فراخدلانہ اور شریفانہ ہیں کہ اسلام سے قبل اور بعد کی ساری تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس سلسلے میں اسلام اس حد تک جا پہنچا کہ اس نے آقا کو غلام کے چہرے پر چانٹا مارنے سے بھی روک دیا' اور اس کی اجازت صرف ایسی استثنائی حالتوں میں دی' جب کسی غلام کی تادیب مقصود ہو' مگر تادیب کی اس سزا کے لیے بھی بعض خاص حدود اور ضوابط مقرر کر دیے تاکہ کوئی آقا سزا دیتے وقت جائز حدود سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ اس طرح کی سزا کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو بچوں کی شرارتوں پر بڑوں کی طرف سے کی جانے والی تادیبی کارروائی کی ہوتی ہے' مگر یہ سزا اسلام کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد غلام کے لیے آزادی کے حصول کی ایک قانونی وجہ جواز بن گئی۔ اور وہ اس کی بنیاد پر آزادی کے مستحق بھی قرار پائے۔ یہ تھا غلاموں کی آزادی کا پہلا مرحلہ۔ اب آیئے ان کی آزادی کے اگلے مرحلے یعنی حقیقی آزادی پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔

آزادی کا پہلا مرحلہ

اپنی اصلاحی مہم کے پہلے مرحلے میں اسلام نے غلاموں کو ذہنی اور رُوحانی آزادی سے بہرور کیا۔ ان کا کھویا ہُوا مقام انسانیت بحال کیا اور انہیں بتایا کہ ایک ہی مشترک اصل انسانیت سے تعلق رکھنے کی بدولت وہ ویسی ہی قدر و قیمت کے حامل ہیں' جیسا کہ ان کے آقا ہیں۔ اس نے انہیں بتایا کہ آزادی کی نعمت سے محروم ہو کر وہ اپنی انسانیت نہیں کھو بیٹھے اور نہ اس کی تہہ میں ان کی کوئی فطری یا پیدائشی کمزوری کارفرما تھی' بلکہ اس

کا اصل باعث وہ خارجی احوال وظروف تھے، جن کی وجہ سے ان کی آزادی چھن گئی، اور وہ معاشرتی معاملات میں براہِ راست حصہ لینے کے قابل نہ رہے؛ چنانچہ اس خارجی کیفیت۔ "غلامی" کے سوا باقی ہر لحاظ سے وہ دوسرے انسانوں کی طرح ہیں اور اس حیثیت سے ان کو وہ تمام انسانی حقوق حاصل ہیں، جو ان کے آقاؤں کو حاصل ہیں۔

حقیقی آزادی کی جانب

لیکن اسلام نے صرف اسی پر بس نہیں کیا، کیونکہ اس کا بنیادی اصول کامل انسانی مساوات ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہوں۔ اور اپنی اس آزاد حیثیت میں انسانی حقوق میں برابر کے شریک ہوں، اس لیے اسلام نے غلاموں کی واقعی آزادی کی جانب قدم بڑھایا اور اس مقصد کے حصول کے لیے دو طریقے اختیار کیے۔

(۱) اَلعِتق —— یعنی مالکوں کی طرف سے غلاموں کی رضاکارانہ آزادی، اور

(۲) مکاتبت (یعنی آقا اور غلام میں آزادی کا تحریری معاہدہ)

جہاں تک پہلے طریقے یعنی اَلعِتق کا تعلق ہے، شریعتِ اسلامی میں وہ کسی مالک کے اس رضاکارانہ فعل کا نام ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی خوشی سے اپنے کسی غلام کو آزادی بخش دیتا ہے۔ اس طریقہ کو اسلام نے بہت فروغ دیا۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میدان میں بھی اپنے پیروؤں کے سامنے بہترین نمونہ پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام غلاموں کو آزاد کر دیا۔ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی آپ کی پیروی میں اپنے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا؛ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی دولت کا کثیر حصہ غلاموں کو ان کے مشرک مالکوں سے خرید کر آزاد کرنے میں صرف کیا، بیت المال میں بھی اس غرض کے لیے کچھ رقم رکھی جاتی تھی۔ اور اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جاتا تھا؛ چنانچہ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں: "ایک بار حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے مجھ کو صدقات وصول کرنے کے لیے افریقہ بھیجا۔ میں نے صدقات جمع کیے اور مستحقین کی تلاش شروع کر دی تاکہ ان میں صدقات تقسیم کیے جائیں؛ لیکن مجھے کوئی مستحق نہ ملا، جو صدقات سے

اس روپے کو قبول کرتا کیونکہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے لوگوں کو خوشحال بنادیا تھا، چنانچہ میں نے اس رقم سے ایک غلام خریدا اور خرید کر اس کو آزاد کر دیا۔"

گناہوں کا کفّارہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی غلام دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا یا مسلم معاشرے کی ایسی ہی کوئی اور خدمت انجام دیتا، تو آپ اس کو آزاد فرما دیا کرتے تھے۔ اسی طرح قرآن نے بعض گناہوں کا کفّارہ ہی غلاموں کو آزادی عطا کرنا قرار دیا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو بتایا کہ بعض گناہوں کا کفّارہ غلاموں کو آزاد کرنا ہے؛ چنانچہ آپ کی اس ہدایت کی بدولت غلاموں کی کثیر تعداد کو آزادی کی نعمت حاصل ہوئی، کیونکہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان گناہوں سے پاک نہیں، بلکہ ہر انسان سے اس کا صدور ممکن ہے، جیسا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے: "آدم کی اولاد میں سے کوئی گناہوں سے مبرا نہیں"۔ اس موقع پر توضیح مدعا کے لیے ہم کسی مومن کو غلطی سے مار ڈالنے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اس مثال سے غلامی کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر بھی وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ اسلام میں کسی مومن کو غلطی سے ہلاک کرنے کا کفارہ کسی مومن غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے ورثاء کو خون بہا ادا کرنا مقرر کیا گیا ہے؛ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ (۴:۹۲)	اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے، تو اس کا کفّارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے۔

قتلِ مومن کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر

مطلب یہ ہے کہ اسلام کی نگاہ میں مومن کو غلطی سے بھی قتل کر کے قاتل بغیر کسی قانونی جواز کے معاشرے کو اپنے ایک کارکن کی خدمات سے محروم کر دیتا ہے، لہٰذا

وہ حکم دیتا ہے کہ قاتل مقتول کے ورثاء اور معاشرے دونوں کے حقوق پر اس دست درازی کی تلافی کرے۔ ورثاء کو خون بہا کے طور پر ایک معقول رقم ادا کی جائے، اور معاشرے کو ایک اور فرد ___ نو آزاد غلام ___ دیا جائے تاکہ وہ مقتول کی کمی کو پورا کر سکے۔ بالفاظِ دیگر اسلام کی نگاہ میں مقتول کے قتل پر غلام کو آزاد کرنا ایک اور فرد انسانی کو زندگی بخشنے کے مترادف تھا۔ قاتل نے ایک انسان کو ہلاک کر کے معاشرے کو اس کی خدمت سے محروم کر دیا تھا، مگر جب اس نے کفارہ میں غلام آزاد کیا، تو معاشرے کو ایک اور خادم مل گیا اور یوں اس کے نقصان کی تلافی ہو گئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نزدیک ان تمام تحفظات کے باوجود جو اس نے غلاموں کو دیئے ہیں، غلامی موت یا اس سے ملتی جلتی کیفیت کا دوسرا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہر اس موقع سے فائدہ اٹھایا جس کے ذریعے وہ انسانوں کے اس دبے اور پسے ہوئے طبقے کو آزادی کے حیات آفرین جذبے سے بہرہ ور کر کے زندوں میں جگہ دلا سکتا تھا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ العتق کے اس طریقے کے ذریعے غلاموں کی اتنی کثیر تعداد کو آزادی نصیب ہوئی کہ اس کی مثال کسی قدیم یا جدید قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پھر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ مسلمانوں نے غلاموں کی اس کثیر تعداد کو کسی مادی فائدے کی خاطر آزاد نہیں کیا، بلکہ ان کے عمل کا محرک محض رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ تھا۔

مکاتبت

(۲) دوسرا طریقہ جس کے ذریعے اسلام نے غلاموں کو آزادی سے بہرہ ور کیا، وہ مکاتبت یعنی لکھا پڑھی کا طریقہ تھا۔ اگر کوئی غلام اپنے مالک سے آزادی کا مطالبہ کرتا، تو مکاتبت کے اس طریقے کے مطابق مالک کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس سے ایک متعین رقم لے کر اسے آزاد کر دے۔ رقم کا تعین مالک اور غلام کے باہمی مشورے سے کیا جاتا تھا۔ اس طرح کے تحریری معاہدے (مکاتبت) کے بعد اگر غلام مطلوبہ رقم مالک کے حوالے کر دیتا تھا، تو مالک کے لیے اس کو آزاد کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار

نہ رہتا تھا، ورنہ بصورتِ دیگر غلام عدالت سے رجوع کرسکتا تھا، اور عدالت کو پورا اختیار حاصل تھا کہ طے شدہ رقم وصول کرکے پروانۂ آزادی اس کے حوالے کردے۔

مکاتبت کے اس طریقے کے ذریعے اسلام نے ان تمام غلاموں کے لیے آزادی کی راہ ہموار کردی، جو آزادی کے طالب تھے، اور اپنے مالکوں کی فیاضی، نیکی اور تقوے پر بھروسا کرکے بیٹھ رہنے کے روادار نہیں تھے کہ وہ جب مناسب سمجھیں اپنی مرضی سے انہیں بندِ غلامی سے آزاد کریں۔

اسلامی حکومت کی پالیسی

جب کوئی غلام مکاتبت کے ذریعے اپنی آزادی کا مطالبہ کرتا، تو نہ صرف یہ کہ مالک اس کی اس پیش کش کو رد نہیں کرسکتا تھا، بلکہ غلام کو اس کی طرف سے کسی قسم کی انتقامی کارروائی کا خدشہ بھی نہیں ہوتا تھا، کیونکہ خود اسلامی حکومت اس کی پشت پر تھی۔ اور وہ اس بات کی ذمہ دار تھی کہ مکاتبت کے معاہدے کے بعد مالک خدمت کے عوض اپنے اس غلام کو ایک متعیّن رقم بطور اجرت ادا کرے اور اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہو، تو اس کے لیے کہیں اور روزگار کا انتظام کرے تاکہ اپنی آزادی کے حصول کے لیے وہ مطلوبہ رقم پس انداز کرسکے، اور اسے اپنے مالک کے حوالے کرکے آزاد ہوجائے۔ ٹھیک یہی صورتِ حال چودھویں صدی میں — یعنی چند صدی بعد یورپ میں پیش آئی۔ اس وقت تک اسلام اپنی مملکت میں غلامی کی بیخ کنی پوری طرح کرچکا تھا۔

سرکاری خزانے سے اعانت

اس معاملے میں اسلامی مملکت کو ایک اور امتیاز بھی حاصل ہے جس کی مثال کہیں اور تلاش کرنا عبث ہے اور وہ ہے خزانۂ عامرہ سے آزادی کے طالب غلاموں کی مالی اعانت۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلاموں کو آزادی دلانے میں اس کو کس قدر گہری دلبستگی رہی ہے، اور وہ بھی کسی مادی غرض یا فائدے کے لیے نہیں، بلکہ محض پروردگار

کائنات اور مالکِ حقیقی کی خوشنودی کے حصول کے لیے تاکہ انسان اس کا بندہ اور غلام ہونے کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔ زکوٰۃ کے مصارف بیان کرتے ہُوئے قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ	صدقات تو صرف غریبوں محتاجوں
وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ	اور ان کارکنوں کا حق ہے جو اس
عَلَیْھَا	کی وصولی پر مقرر ہیں ......
وَفِی الرِّقَابِ (۹:۶۰)	اور غلاموں کے چھڑانے میں۔

اس آیت میں یہ واضح ہدایت الٰہی موجود ہے کہ زکوٰۃ سے ان غلاموں کی مالی اعانت کی جائے جو اپنی ذاتی کمائی سے آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔

دو انقلابی ادارے

اسلامی نظامِ معاشرت کے یہ دو ادارے — العتق اور مکاتبت — غلامی کی بھیانک تاریخ میں عظیم عملی انقلاب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ باقی دُنیا کو ترقی کے اس مرتبے تک پہنچنے میں کم از کم سات صدی کا عرصہ لگا۔ یہی نہیں بلکہ اسلام نے غلام کو مملکت کی جانب سے تحفظات عطا کر کے دُنیا کو ترقی کے ایک ایسے مفہوم سے آشنا کیا جس کے تصوّر سے عہدِ قدیم تو کجا عہدِ جدید کی تاریخ بھی خالی نظر آتی ہے۔ اسلام نے انسانوں کو غلاموں کے ساتھ جو شریفانہ اور فیاضانہ برتاؤ کرنے کا سبق سکھایا، اور جس طرح اس نے کسی سیاسی یا معاشی نوعیت کے خارجی دباؤ یا تحریص وطمع کے بغیر مسلمانوں میں اپنی مرضی سے غلاموں کے آزاد کرنے کا جذبہ بیدار کیا، اس کی نظیر پیش کرنے سے انسانی تاریخ آج بھی قاصر ہے۔ یورپ میں غلاموں کو بہت بعد میں جو آزادی نصیب ہُوئی وہ بھی اس معاشرتی مرتبے کی ہم سر نہیں جو اسلام نے صدیوں پیشتر غلاموں کو عطا کر دیا تھا۔

اشتراکی جھوٹ کی حقیقت

یہ حقائق کمیونسٹوں کے اس غلط نظریے کے ابطال کے لیے کافی ہیں کہ اسلام انسانی

تاریخ کے ایک مخصوص دَور کے اقتصادی احوال وظروف کی پیداوار تھا اور جدلی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) کے نظریے کے مطابق اپنے دَور کے معاشی اور مادی حالات کا آئینہ دار تھا۔ اور اس لیے کسی اگلے ترقی یافتہ معاشی مرحلے کی ضروریات کا ساتھ دینے سے قاصر ہے' لیکن ان کے اس جھوٹ کی قلعی اسلام نے پوری طرح کھول کر رکھ دی ہے' بلکہ خود اسلام کا وجود ہی اس اشتراکی فریب کی ٹھوس عملی تردید ہے۔ اسلام نے جزیرہ نمائے عرب کے اندر اور اس سے باہر جس طرح قوت وشوکت حاصل کی' اس سے کارل مارکس کے نظریے کا غلط ہونا پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے۔ غلاموں کے ساتھ اسلام کا سلوک ہو یا زندگی کے دوسرے مسائل کے بارے میں اس کا رویہ ۔۔ تقسیم دولت کا مسئلہ ہو یا حاکم ومحکوم اور خادم ومخدوم کے تعلقات کے تعین کا سوال' اسلام کی انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ اسلام نے اپنے پورے معاشرتی اور معاشی نظام کی عمارت ایک ایسی خوش دلانہ اطاعت کی اساس پر استوار کی ہے کہ معاشرتی نظاموں کی تاریخ میں اس کو اب بھی منفرد اور بلندترین مقام حاصل ہے۔

ایک سوال ....

ممکن ہے اس موقع پر بعض حضرات کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اسلام نے جو غلامی کی آزادی کا علمبردار ہے اور جس نے ان کی آزادی کے لیے کسی سیاسی یا معاشی دباؤ کے بغیر اتنے انقلابی اقدامات محض اپنی اندرونی تحریک سے کر ڈالے' اس نے اس کے خلاف آخری اور حتمی اقدام کر کے اس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قلع قمع کیوں نہیں کیا' تاکہ نوعِ انسانی اس کی بے حد وحساب برکات سے متمتع ہوتی اور یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی کہ اسلام واقعی دینِ کامل ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے کہ جس نے بنی نوعِ آدم کو اپنی اکثر مخلوقات پر فضیلت دی ہے' اپنے بندوں کی راہنمائی کے لیے اتارا ہے۔

---

[1] براہ مہربانی اگلا باب بھی ملاحظہ فرمائیں۔

....اور جواب

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں غلامی سے پیدا ہونے والے مختلف معاشرتی، نفسیاتی اور سیاسی مسائل پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے، کیونکہ یہی وہ اسباب تھے جن کے پیشِ نظر اسلام نے غلامی پر آخری ضرب نہیں لگائی، بلکہ کچھ عرصہ بعد تک کے لیے اُسے مؤخر کر دیا۔ مسئلے کے اس پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ غلامی کے قطعی سدِباب میں جو غیر معمولی تاخیر ہوئی، وہ اسلام کے نزدیک نہ تو پسندیدہ تھی اور نہ اسلام کی اپنی فطری پاکیزگی اور اجنبی عناصر کی آمیزش سے پاک صورت میں ممکن تھی۔ تاخیر کے اصل ذمہ دار انحراف اور گمراہی کے وہ رجحانات تھے، جنھوں نے بعد میں اسلام کے چشمۂ صافی کو مکدر کر دیا۔

غلامی کا صحیح تاریخی پس منظر

جب اسلام آیا، تو دُنیا بھر میں غلامی کا دور دَورہ تھا، اور یہ اپنے وقت کے معاشرتی اور معاشی نظام کا ناگزیر جزو بن چکی تھی۔ اس کو زندگی کی ناگزیر ضرورت سمجھا جانے لگا تھا؛ چنانچہ اس صورتِ حال کو بدلنے اور غلامی کے قطعی سدِّباب کے لیے ضروری تھا کہ عرصۂ دراز تک اور ایک خاص تدریج کے ساتھ کام کیا جائے۔ یہی تدریج اور طویل المیعاد پالیسی ہمیں دوسرے اسلامی احکام کے نفاذ میں بھی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر شراب کی حُرمت کا اعلان اچانک اور یک بیک نہیں کیا گیا، بلکہ اس سے پہلے سالہا سال تک ذہنوں کو تیار کیا گیا۔ باوجودیکہ مَیخواری ایک شخصی بُرائی ہے، اور عہدِ جاہلیت میں عربوں کے اندر پہلے سے کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو مَیخواری کو انسانی عزّ و شرف کے منافی سمجھ کر اس سے اجتناب کرتے تھے، لیکن غلامی کے مسئلے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر قطعی مختلف تھا۔ وقت کے معاشرتی ڈھانچے اور ابنائے زمانہ کے مزاج اور نفسیات میں اس کی جڑیں گہری پیوست تھیں، کیونکہ شخصی، سماجی اور اقتصادی زندگی کی بے شمار حقیقتیں اور مصلحتیں ہیں

سے جلوہ نما ہوتی تھیں؛ چنانچہ جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا ہے، غلامی کے بُرا یا ناپسندیدہ ہونے کا تصوّر ہی کسی دِل میں باقی نہیں رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلی خاتمے میں پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مبارک سے، بالفاظِ دیگر ہدایتِ الٰہی کے نزول کے دَور سے کہیں زیادہ طویل عرصہ صرف ہو گیا، تب کہیں جاکر اس کا قلع قمع ہُوا۔ اللہ تعالیٰ جو تمام مخلوقات کا خالق ہے، اور ان کے طبعی خصائص سے کماحقہٗ واقف ہے، خُوب جانتا تھا کہ شراب کی حرمت کا مقصد چند سالوں میں محض زبانی حکم سے پُورا ہو جائے گا؛ چنانچہ جب وہ وقت آیا، تو اس نے اس کی قطعی حرمت کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح اگر غلامی کی حرمت کے لیے حالات سازگار اور موزوں ہوتے، اور محض ایک عام ہدایت دے کر اس کی بُرائی کا سدِّباب کیا جا سکتا، تو اپنی سُنّت کے مطابق خدائے قادر و توانا بغیر مزید تاخیر کے ضرور صاف اور صریح احکام کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی ممانعت کا اعلان فرما دیتا؛ لیکن چونکہ ایسا نہیں تھا، اس لیے ایسا نہیں کیا گیا۔[1]

اسلام کا طریقۂ کار

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام تمام بنی نوعِ انسان کا مذہب ہے اور ہر زمانے اور ہر دَور کے انسان اس کی ہدایت پر عمل پیرا ہو کر پاکیزہ زندگی کے تمام اعلیٰ اور صحت مند اصولوں سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں، تو ہمارا منشا یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اسلام کوئی ایسا جامد نظامِ حیات ہے جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانی زندگی کی تمام جزئیات پہلے سے طے کر دی ہیں۔ نہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے، کیونکہ اس طرح کی تفصیلی ہدایات اس نے صرف

---

[1] شراب اور غلامی میں یہ فرق بھی ہے کہ شراب کسی زمانے میں بھی انسان کی ناگزیر ضرورت نہیں رہی، وہ ایک بُرائی ہے۔ اس کو ترک کرنے سے فرد یا اجتماع کی زندگی میں کوئی خلا پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ایک وجہِ فساد دُور ہوتی ہے، مگر اسلام کے نزول کے وقت غلامی ایک اقتصادی، اجتماعی، معاشرتی اور سیاسی ضرورت بھی۔ اس کو یک قلم منسوخ کرنے سے ایک ایسا خلا واقع ہو جاتا جو بے شمار مفاسد کو پیدا کر دیتا۔ اسلام نے اس کے متعلق وہ تدبیر اختیار کی جس سے غلامی کے مضرّ اثرات بھی زائل ہو گئے اور سوسائٹی میں بھی کوئی خلا واقع نہ ہُوا۔ (مترجم)

ان بنیادی انسانی مسائل کے بارے میں دی ہیں جو تاریخ کے نشیب و فراز سے متاثر ہوئے بغیر ہر دور میں یکساں رہتے ہیں۔ باقی رہے تغیر پذیر حالات، تو اسلام ان کے متعلق چند اصولی ہدایات دے کر انہیں چھوڑ دیتا ہے تاکہ ان کی روشنی میں زندگی کا ارتقاء جاری رہے۔ ٹھیک یہی طریقہ اسلام نے غلامی کے بارے میں اختیار کیا۔ اس نے غلاموں کی آزادی کے لیے نہ صرف ایک ٹھوس بنیاد "العتق یا مکاتبت کی صورت میں فراہم کردی بلکہ اس اُلجھے ہوئے قدیم انسانی مسئلے کو آئندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلجھانے کی خاطر ایک مستقل اور پائیدار حل کی نشاندہی بھی کر دی۔

انسانی فطرت اور اسلام

اسلام انسانی فطرت کو بدلنے کے لیے نہیں آیا تھا، بلکہ اس کی تہذیب کے لیے آیا تھا تاکہ اپنی تمام محدودیتوں کے باوجود اور کسی خارجی جبر اور دباؤ کے بغیر وہ تکمیل انسانیت کے اعلیٰ ترین منصب کو پا سکے؛ چنانچہ جہاں تک افراد کی سیرتوں میں انقلاب لانے کا تعلق ہے، اسلام کو معجزنما کامیابی حاصل ہوئی اور بحیثیت مجموعی انسانی معاشرے کی تہذیب میں بھی شاندار کامیابی نے اس کے قدم چومے، ایسی کامیابی جس کی نظیر انسانی کامرانیوں کی تاریخ میں کہیں اور ملنی محال ہے۔ مگر اپنی ان تمام عظیم الشان کامرانیوں کے باوجود اسلام کا یہ منشا کبھی نہیں رہا کہ وہ انسانوں کی قلب ماہیت کر کے انہیں مثالی تکمیل کے ایک ایسے درجے تک پہنچا دے جہاں تک اپنی موجودہ انسانی نارسائیوں کے ہوتے ہوئے نوع انسانی کے لیے پہنچنا عملاً محال ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو خدا تعالیٰ زمین پر انسانوں کو نہیں، بلکہ فرشتوں کو پیدا کرتا اور ان کو ایسے احکام اور فرامین دیتا، جن پر صرف فرشتے ہی عمل پیرا ہو سکتے ہیں، جن کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے کہ:

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔

"جو حکم دیا جاتا ہے اس میں وہ خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو فوراً بجا لاتے ہیں۔" (۶۶:۵)

مگر خدا کا منشاء انسانوں کو فرشتے بنانا نہیں تھا' بلکہ اچھے انسان بنانا تھا' کیونکہ اس نے زمین پر انسانوں کو پیدا کیا تھا۔ وہ انسانوں کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھا' اور اس کو یہ بھی خوب معلوم تھا کہ ان کی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے کس قدر عرصہ درکار ہے' تاکہ وہ اس کے عطا کردہ احکام و فرامین کو سمجھ کر ان پر کماحقہ' عمل پیرا ہو سکیں' بہرحال اسلام کی عظمت کے ثبوت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ تاریخ میں اس نے پہلی بار غلامی کے خلاف آواز بلند کی' اور ایک ایسی تحریکِ آزادی کو برپا کیا' جس کی مثال باقی دُنیا میں سات صدی بعد تک بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ سات سو سال بعد جا کر کہیں دُنیا اس قابل ہُوئی کہ اس تحریکِ آزادی کو قبول کر کے اپنے ہاں جاری و ساری کر سکے؛ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جدید تحریکِ آزادی سے بہت پہلے اسلام جزیرہ نمائے عرب میں غلامی کا خاتمہ کر چکا تھا۔ اور اگر غلامی کا ایک اور سبب جس کی وجہ سے یہ عرصہ دراز تک لعنت بن کر دُنیا پر مسلط رہی' موجود نہ ہوتا' تو اسلام جزیرہ نمائے عرب کی طرح اپنے زیرِاثر باقی تمام علاقوں سے بھی اس کا قطعی استیصال کر دیتا' مگر اس نئے سبب کی موجودگی میں اسلام کے لیے عملاً ایسا کرنا ممکن نہ رہا' کیونکہ اس کا تعلق جتنا مُسلمانوں سے تھا' اتنا ہی ان کے مخالفین سے بھی تھا' جن پر اسلام کی کوئی گرفت یا اثر نہیں تھا' جس چیز کی وجہ سے غلامی کا کلی استیصال ممکن نہ ہُوا' وہ جنگوں کی موجودگی اور فراوانی تھی۔ یہی جنگیں اس دور میں غلامی کا سب سے بڑا سرچشمہ تھیں۔ اسی باب میں ذرا آگے چل کر ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

آزادی کی لازمی شرط

غلامی کے مسئلے پر گفتگو کرتے وقت ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ آزادی کہیں سے خیرات کے طور پر نہیں ملتی' بلکہ اس کو اپنے دست و بازو کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے؛ چنانچہ کوئی قانون بنا دینے یا فرمان جاری کر دینے سے صدیوں کے غلام خود بخود آزاد نہیں ہو جاتے۔ امریکی قوم نے اس سلسلے میں جو تجربہ کیا ہے وہ اس حقیقت

کا آئینہ دار ہے۔ امریکی صدر ابراہام لنکن نے بیک جنبش قلم غلاموں کی آزادی کا فرمان جاری کر دیا، تو کیا اس سے صدیوں کے غلام فی الواقع آزاد ہو گئے تھے؟ نہیں — کیونکہ ذہنی اور رُوحانی طور پر وہ آزادی کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ چنانچہ اس وقت اس قسم کے مناظر بھی دیکھنے میں آئے کہ قانوناً آزاد ہو جانے کے بعد یہ لوگ اپنے سابق آقاؤں کے پاس جاتے تھے اور ان سے التجائیں کرتے تھے کہ وہ انہیں گھر سے نہ نکالیں، بلکہ حسبِ سابق غلام بنا کر اپنے ہاں رہنے دیں۔

غلامی کی نفسیات

انسانی نفسیات کی روشنی میں اس واقعے کا جائزہ لیا جائے، تو بادیُ النظر میں عجیب غریب نظر آنے کے باوجود کچھ زیادہ تعجب خیز معلوم نہ ہو گا۔ ہر انسان کی زندگی چند مخصوص عادات کی کارفرمائی کی داستان ہوتی ہے۔ وہ جن حالات میں زندگی بسر کرتا ہے، وہ اس کے خیالات، جذبات، بلکہ اس کے پُورے نفسیاتی مزاج کو متاثر کرتے ہیں، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ غلام کی نفسیاتی تربیت اور مزاج آزاد انسان کی ذہنی و عملی کیفیت سے بالکل مختلف ہوتا ہے، لیکن عہدِ قدیم کے لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ آزاد اور غلام انسان کا یہ ذہنی اور جذباتی فرق کسی بنیادی انسانی اور نوعی فرق اور اختلاف کی پیداوار ہے، بلکہ اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ دائمی غلامی کے بندھن میں گرفتار رہنے کے باعث غلام کی نفسیاتی زندگی کا ایک مخصوص مزاج بن جاتا ہے جس میں فرمانبرداری کا جذبہ تو کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوتا ہے، مگر آزادی اور ذمّہ داری کے احساس

---

[1] مادہ پرستوں کے نزدیک، فکرِ انسانی، مادی حالات کی پیداوار ہوتی ہے، مگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ محض ایک مغالطہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مادی حالات صرف اسی صورت میں بروئے کار آتے ہیں جبکہ زندگی میں ان کے لیے ایک نفسیاتی اساس پہلے سے موجود ہو، چنانچہ افکار و خیالات پر مادی حالات اور واقعات کی اثر اندازی تو مسلّم امر ہے، مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ افکار و نظریات خالص مادی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔

سے وہ خالی ہوتا ہے، اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ آزاد معاشرے کے ذمہ دار فرد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں کما حقہٗ بجا لا سکے۔ اپنے طور پر نہ وہ آزادانہ سوچ سکتا ہے اور محض اپنے بل پر کسی قسم کا کوئی اَور اقدام ہی کر سکتا ہے، بلکہ آزادی سے بہرہ ور ہونے کے بعد ایک آزاد انسان جن ذمہ داریوں سے دوچار ہوتا ہے، ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ہی سرے سے کھو بیٹھتا ہے۔

غلام کی زندگی

ایک غلام اپنا کام صرف اسی وقت تک بخوبی انجام دے سکتا ہے، جب تک اس کو سوچنا نہ پڑے، بلکہ اس کا کام اپنے آقا کے احکام و فرامین کی محض اطاعت تک محدود ہو؛ چنانچہ اگر کبھی اس پر بطور خود فیصلے کرنے کی ذمہ داری آن پڑتی ہے، تو اس کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ اس کی قوتِ فیصلہ ماؤف ہو جاتی ہے اور اپنی زندگی کے انتہائی معمولی معاملات میں بھی کوئی فیصلہ کرنے یا اس کے نتائج سے مردانہ وار آنکھیں چار کرنے کی ہمّت اپنے اندر نہیں پاتا۔ اس دون ہمتی کا باعث اس کی کوئی ذہنی یا جسمانی کمزوری نہیں ہوتی، بلکہ نفسیات کی زبان میں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اپنے افعال کے نتائج کا سامنا کرنے کی اخلاقی جرأت سے وہ محروم ہو جاتا ہے۔ وہ موہوم خطرات اور مشکلات سے خوفزدہ رہتا ہے اور خواہ مخواہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ ان پر قابو پانا اس کے بس سے باہر ہے۔ یہ سوچ کر وہ اپنی ذات کے خول میں سمٹ جاتا ہے اور بالآخر اپنی جان بچانے کی کوشش میں کارزارِ حیات سے راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔

مشرق میں غلامی کے آثار

ماضی قریب کے مصر اور دوسرے مشرقی ممالک کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی استعمار کی لائی ہوئی ذہنی اور جسمانی غلامی نے اہلِ مشرق کی زندگیاں کس قدر بے اثر اور بے وقعت بنا دی ہیں۔ مغربی سامراجیوں نے اپنے مذموم مقاصد کے حصول

کے لیے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق یہاں پہ ذہنی اور جسمانی غلامی کا جال پھیلایا، اور جاتے ہُوئے مشرق کو اس کے مضبوط بندھنوں میں کس گئے؛ چنانچہ یہی وہ ذہنی غلامی ہے۔ جس کا اظہار مغربیت زدہ لوگوں کی گفتگوؤں اور تقریروں سے ہوتا ہے؛ چنانچہ جب وہ بعض قوانین کو بیکار اور فرسودہ قرار دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ دَور میں ان کا نفاذ ناممکن ہے، تو اس کی تہہ میں بھی دراصل وہی غلامانہ ذہنیت کارفرما ہوتی ہے، جس کی بدولت ایک غلام اپنی آزاد مرضی سے فیصلے کرنے اور ان کے نتائج کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی انگریز یا امریکی ماہرِ قانون کسی گھناؤنے سے گھناؤنے قانون کی بھی حمایت کر دے، تو یہ لوگ بخوشی اس کے نفاذ پر تیّار ہو جاتے ہیں؛ کیونکہ اس طرح وہ اپنی آزاد مرضی سے آزاد فیصلے کرنے اور اپنے بل بوتے پر ان کے نفاذ کی ذمہ داری قبول کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ مشرقی ممالک میں اس وقت جو دفتری نظام ملتا ہے، وہ بھی اسی عہدِ غلامی کی یادگار ہے۔ ان دفتروں کا بے جان طریقِ کار اور اس کے مرعوب اور ہیبت زدہ عُمّال کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غلامی کا منحوس سایہ کس طرح اب بھی اہلِ مشرق کی رُوحوں پر مسلّط ہے۔ ان عُمّالِ حکومت میں سے کوئی بھی آزاد مرضی سے آزاد فیصلے کرنے کا اہل نظر نہیں آتا۔ اس کو جب تک اپنے حکّامِ بالا سے واضح احکام اور ہدایات نہ ملیں، وہ بطورِ خود کوئی ذمہ دارانہ فیصلے کر ہی نہیں سکتا۔ یہی حال اس کے حکامِ بالا کا بھی ہے۔ اپنے ماتحت عملہ کی طرح وہ بھی قوتِ فیصلہ سے محروم ہیں اور اپنے محکمے کے وزیر کے احکام پر ہی ان کے سارے کاروبار کا دار و مدار ہے۔ اگر ان لوگوں کی ذہنیت غلامانہ نہ ہوتی، تو وہ یُوں بے جان مشینیں بن کر نہ رہ جاتے، اور نہ یُوں بے بس ہو کر دوسروں کے محتاج ہوتے، کیونکہ ان کی مخصوص غلامانہ ذہنیت دوسروں کے احکام بے چون و چرا بجا لانے کے لیے تو بہت خُوب ہے، مگر آزاد فیصلوں کی صلاحیت کے لحاظ سے قطعاً بے کار ہے۔ اس کی موجودگی میں آزادی کے تقاضے بہرحال پُورے نہیں ہو سکتے، اور نہ آزاد زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بظاہر آزاد دکھائی دیتے ہیں، مگر درحقیقت ان کی ماتحت

غلاموں سے کچھ بھی بہتر نہیں ہے۔

غلامی کی اصل وجہ

واقعہ یہ ہے کہ یہی غلامانہ ذہنیت ایک غلام کو غلام بناتی ہے۔ یہ شروع شروع میں تو خارجی حالات کے زیرِ اثر ابھرتی ہے، مگر جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، اس کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے اور بالآخر یہ اپنی مستقل اور آزاد حیثیت پیدا کرلیتی ہے جس طرح کسی درخت کی شاخ کچھ عرصہ زمین پر پڑی رہے، تو آہستہ آہستہ زمین میں جڑیں چھوڑ دیتی ہے، اور اس کا علیحدہ وجود قائم ہو جاتا ہے، اسی طرح کا حال انسانی ذہنیت کا بھی ہے۔

اصلاح کی صحیح تدبیر

اس طرح کی غلامانہ ذہنیت غلامی کے خلاف مجرد احکام کے اجراء سے ختم نہیں کی جا سکتی۔ اس کے خاتمے کے لیے اندرونی انقلاب اور نئے حالات کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ غلام کی نفسیاتی اور مزاجی کیفیت کو ایک بالکل نیا رُخ دیا جا سکے، اور اس کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو بالخصوص اُجاگر کیا جا سکے جو آزاد انسان کی حیثیت سے زندگی میں اپنی ذمہ داریاں بجا لانے کے لیے بہرحال ہر فرد کے لیے ناگزیر ہیں۔

اسلام کا تدریجی طریقۂ کار

چنانچہ اسلام نے ٹھیک انہی خطوط پر کام کیا۔ ابتدا میں اس نے غلاموں سے منصفانہ، شریفانہ اور فیاضانہ برتاؤ کرنے کی تعلیم دی۔ یہ غلاموں کے پراگندہ نفسیاتی توازن کو بحال کرنے اور ان میں انسانی عظمت و وقار کا احساس بیدار کرنے کا بہترین نسخہ تھا، کیونکہ جب انسان ایک بار آزادی اور انسانی عظمت کو پہچان لیتا ہے، تو پھر وہ اس کے تقاضوں اور ذمہ داریوں سے گھبراتا نہیں، اور نہ نو آزاد امریکی غلاموں کی مانند دوبارہ غلامی کی آغوش میں گوشۂ عافیت ڈھونڈتا ہے۔

جہاں تک غلاموں سے حسنِ سلوک اور ان کے انسانی مرتبہ و مقام کو بحال کرنے کا تعلق ہے، اسلام کی تاریخ انتہائی حیران کن اور قابلِ تعریف مثالوں سے لبریز نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم اوپر بعض قرآنی آیات اور احادیثِ نبویؐ کا حوالہ دے چکے ہیں۔ یہاں پر ہم مختصر طور پر صدرِ اوّل کی عملی زندگی سے کچھ اور مثالیں پیش کرتے ہیں۔

غلام آقاؤں کے بھائی بنا دیے گئے

مدینے میں تشریف لانے کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں جو بھائی چارہ قائم کیا، اس میں آپ نے عرب سرداروں کو آزاد کردہ غلاموں کا بھائی بنا دیا۔ بلالؓ بن رباح کو آپ نے خالدؓ بن رویحۃ الخثعمی کا، اور زید کو جو کہ آنحضورؐ کے آزاد کردہ غلام تھے، حضرت حمزہؓ کا، اور خارجہؓ بن زیدؓ کو حضرت ابوبکرؓ کا بھائی بنا دیا۔ اخوت کا یہ رشتہ حقیقی خونی رشتہ سے کسی طرح کم نہ تھا؛ چنانچہ جو لوگ اس طرح آپس میں بھائی بنا دیے گئے تھے، وہ اسی طرح ایک دوسرے کے وارث قرار دیے گئے، جس طرح کہ خونی رشتہ دار ہوتے ہیں۔

غلاموں سے شادی بیاہ

مگر اسلام نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ ایک اور قدم آگے بڑھایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ کو اپنے غلام زیدؓ کے حبالۂ عقد میں دے دیا، مگر چونکہ شادی کا نہایت گہرا تعلق انسان کے، بالخصوص عورت کے لطیف احساسات اور جذبات سے ہے، اس لیے حضورؐ کے ارشاد پر حضرت زینبؓ نے حضرت زیدؓ سے جن کا معاشرتی مقام آپ سے کہیں فروتر تھا شادی تو کرلی، مگر میاں بیوی میں ذہنی موافقت نہ پیدا ہوسکی کیونکہ حضرت زیدؓ دُنیاوی دولت اور مجد و شرف کے اس مقام سے محروم تھے، جو حضرت زینبؓ کے خاندان کا طرۂ امتیاز تھا، مگر حضورؐ کے پیشِ نظر جو مقصد تھا، وہ بہرحال پُورا ہوگیا۔ اپنے خاندان کی ایک لڑکی غلام کے نکاح میں دے کر آپ دراصل یہ بتانا چاہتے تھے کہ غلامی کے اس

قعرِ مذلّت سے، جس میں ظالم انسانوں نے اپنے ہی ایک طبقے کو گرا رکھا ہے، نکل کر ایک غلام بھی عزّت و تکریم کے اس بلند مقام پر فائز ہو سکتا ہے، جو اس زمانے میں صرف قریشی سرداروں کو حاصل تھا، مگر اسلام کے پیشِ نظر جو عظیم مقصد تھا، وہ ابھی بہت دُور تھا۔

لشکرِ اسلامی کی قیادت

اسلام نے غلاموں کو فوجی قیادت اور قومی سیادت کے مناصب بھی عطا کیے، چنانچہ جب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انصار و مہاجرین کے برگزیدہ اصحابؓ پر مشتمل ایک فوج بنائی، تو اس کا قائد اپنے غلام زیدؓ کو بنا دیا۔ زیدؓ کی وفات پر آپؐ نے اس لشکر کی قیادت ان کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو سونپ دی، حالانکہ اس فوج میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے چیدہ اور مسلّمہ سردارانِ عرب بھی موجود تھے، جو آپؐ کی زندگی میں آپؐ کے قابلِ اعتماد مشیر تھے، اور آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشین بنے۔ اس طرح آپؐ نے غلاموں کو آزادوں کے ہم پلہ ہی قرار نہیں دیا، بلکہ آزاد انسانوں کی فوجوں کی قیادت کے بلند مناصب بھی انہیں سونپ دیئے۔ اس معاملے میں حضورؐ نے اس حد تک تاکید کی کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "سُنو اور اپنے امراء کی اطاعت کرو، خواہ تمہارا سردار کسی ایسے حبشی غلام کو بنا دیا جائے جس کا سر منقّیٰ جیسا ہو، اس کی اطاعت کرو جب تک وہ تمہارے درمیان خدا کے احکام کا نفاذ کرے"۔[1] بالفاظِ دیگر اسلام نے ایک غلام کے اس حق کو بھی تسلیم کیا کہ وہ اسلامی مملکت میں اعلیٰ ترین منصب پر بھی فائز ہو سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو جب اپنا جانشین منتخب کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو آپؐ نے فرمایا: "اگر ابوحُذیفہ کے غلام سالمؓ بقیدِ حیات ہوتے، تو میں ان کو خلیفہ مقرر کر دیتا"۔ یہ دراصل پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم کی روایت ہی کی توسیع و توضیح تھی، جو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں یوں بصورتِ عمل جلوہ گر ملتی ہے۔

---

[1] البخاری

حضرت عمرؓ اور حضرت بلالؓ

حضرت عمرؓ کی زندگی کا مطالعہ ایک اَور پہلو سے بھی اسلامی معاشرے میں غلاموں کے بلند مقام پر روشنی ڈالتا ہے۔ "فے" کے مسئلے میں جب حضرت بلالؓ بن رباح (ایک آزاد کردہ غلام) نے حضرت عمرؓ کی رائے سے شدید اختلاف کا اظہار کیا اور حضرت عمرؓ کہ خلیفۂ وقت تھے، حضرت بلالؓ کو مطمئن کرنے میں کسی طرح کامیاب نہ ہوئے، تو آپ نے خدا سے دُعا کی: "اللّٰھم اکفنی بلالًا و اصحابہٗ" "اے اللہ! بلال اور ان کے ساتھیوں کے لیے مجھے کافی بنا دے۔" خلیفۂ وقت کا اپنی رعایا کے ایک فرد — ایک سابق غلام — کی مخالفت کے جواب میں یہ ردّعمل کتنا معنی خیز اور حقیقت افروز ہے۔

غلاموں سے حسنِ سلوک کی اصل وجہ

یہ ان بے شمار مثالوں میں سے محض چند مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے پہلے مرحلے میں غلاموں کو رُوحانی اور ذہنی طور پر آزادی سے بہرہ ور کرنے کے لیے ان سے کتنا فیاضانہ برتاؤ کیا، جس کے نتیجے میں ان میں اپنے انسانی مقام کا شعور بیدار ہوا۔ اور ان کے دلوں میں اپنی کھوئی ہُوئی آزادی پالینے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔ اسلام نے ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ رضا کارانہ طور پر اپنے غلاموں کو آزاد کریں اور دوسری طرف غلاموں کی روحانی اور ذہنی سطح کو بلند کرنے پر پُوری پُوری توجہ دی، اور انہیں اس بات کی ضمانت دی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی کھوئی ہُوئی آزادی کو، اور ان تمام حقوق و مراعات کو حاصل کر سکتے ہیں، جو اس وقت تک صرف ان کے آقاؤں کو حاصل تھیں۔ غلاموں کی اس روحانی اور ذہنی تربیت کا مقصود ان میں آزادی کی خواہش بیدار کرنا، اور انہیں آزادی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آمادہ اور تیار کرنا تھا؛ چنانچہ جب یہ لوگ آزادی کے اہل بن گئے، تو اسلام نے آگے بڑھ کر ان کو عملاً بھی آزاد کر دیا، کیونکہ اب وہ آزادی کے مستحق بھی تھے اور اس کی حفاظت کی صلاحیت بھی ان میں پیدا ہو چکی تھی۔

مغرب پر اسلام کی برتری

اس نظام حیات میں جو انسانوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کرتا ہے ان کے جذبۂ آزادی کو زبان دیتا ہے، اس کے عملی اظہار کے لیے تمام ضروری ذرائع اور تدابیر اختیار کرتا ہے، اور پھر جونہی وہ اس کے لیے تقاضا کرتے ہیں، ان کی آزادی انہیں لوٹا دیتا ہے، اور اس نظام زیست میں غلاموں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلامی کے بندھن میں بندھا دیکھنا چاہتا ہے اور اُن کو اتنا کمزور اور بے بس بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک خارجی دُنیا میں چند در چند اقتصادی اور معاشرتی انقلابات رونما نہ ہوں اور لاکھوں انسان قتل و غارت گری کا لقمہ نہ بن جائیں۔ ان دونوں نظاموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

غلامی کے انسداد کے سلسلے میں اسلام کو دوسرے نظاموں کے مقابلے میں جو برتری حاصل ہے، اس کے مختلف پہلو ہیں۔ اسلام کا مقصود غلاموں کو ظاہری اور باطنی ہر دو لحاظ سے آزاد کرنا تھا۔ ابراہام لنکن کی طرح اس نے غلاموں کو ذہنی طور پر آزادی کے لیے تیار کیے بغیر محض نیک خواہشات پر تکیہ کر کے ایک فرمان کے اجرا ہی کو کافی نہیں سمجھا۔

اسلام کا یہ طریق کار ظاہر کرتا ہے کہ اس کو انسانی نفسیات کا گہرا ادراک حاصل ہے، اور یہ کہ اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کس طرح تمام ممکن ذرائع و وسائل سے بھرپور استفادہ کیا۔ اسلام نے غلاموں کو بس آزاد ہی نہیں کیا، بلکہ تعلیم و تربیت کے ذریعے انہیں اس قابل بھی بنا دیا کہ وہ آزادی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں اور اس کی حفاظت کر سکیں۔ اسلام کی اس تعلیم نے معاشرے میں تعاون، محبت اور خیر سگالی کی رُوح دوڑا دی۔

یورپ کی طرح کہ جب تک اپنے انسانی حقوق کی خاطر وہاں کے غلام مرنے مارنے پر نہیں تل گئے، انہیں آزادی حاصل نہ ہو سکی۔ اسلام نے غلامی کا انسداد کسی مجبوری کے تحت نہیں کیا۔ یورپ میں شدید نفرت انگیز طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں غلام آزادی سے روشناس ہوئے، مگر اسلام نے بطور خود غلامی کے سدِباب کے لیے اقدام کیا اور کبھی اس بات کا انتظار نہ کیا کہ طبقاتی چپقلشیں جنم لیں، تصادم برپا ہوں، اور تلخیاں پیدا ہوں، تب کہیں

جا کر غلاموں کو آزادی نصیب ہو۔ یورپ میں طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں جنم لینے والی تلخی اور نفرت نے انسانیت کے روحانی سوتے خشک کر دیے جس کے نتیجے میں انسان کے روحانی ارتقاء کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ مضمون کے آخر میں ہم چاہتے ہیں کہ اس اہم معاشرتی بنیاد کا بھی جائزہ لیں جو غلاموں کی روحانی تعلیم و تربیت کے بعد اسلامؒ نے ان کی آزادی کی تکمیل کے لیے فراہم کی۔

جنگیں اور غلامی

قبل ازیں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ اسلام نے غلامی کے تمام اسباب کا سوائے ایک سبب یعنی جنگ کے کامیابی سے خاتمہ کر دیا تھا، کیونکہ جنگ کا خاتمہ عملاً اسلام کے لیے ممکن نہ تھا، چنانچہ اسلام کی اس تحریکِ آزادی کے بعد جنگ ہی غلامی کا واحد بڑا ذریعہ رہ گیا تھا۔ اب ہم ذرا تفصیل سے اس پر گفتگو کریں گے۔

ایک قدیم روایت

قدیم ترین زمانے سے دُنیا کی اقوام میں یہ طریقہ رائج تھا کہ میدانِ جنگ میں جس فوج کو شکست ہو جاتی تھی، اس کے تمام افراد کو بلا استثناء یا تو تہ تیغ کر دیا جاتا تھا، یا پھر انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا؛ چنانچہ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ جنگ کی یہ روایت زمانہ قدیم کے انسان کی زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت، اور ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی۔

مُسلمان جنگی قیدی

اس معاشرتی پس منظر میں اسلام کا ظہور ہُوا۔ اور اس کو اپنے مخالفین کے خلاف

لے تاریخی دائرۃ المعارف موسوم بہ (UNIVERSAL HISTORY OF THE WORLD) کے صفحہ ۲۲۰۳ پر درج ہے کہ "۵۹۹ سنہ عیسوی میں رومی شہنشاہ ماریوس (MARIUS) نے لاکھوں قیدیوں کو جنگ میں پکڑا تھا، مگر اس نے انہیں رہا کرنے یا ان کے بدلے میں فدیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان سب کی گردنیں اڑا دیں۔

کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ جو مسلمان ان جنگوں میں گرفتار ہوتے تھے، کفّار انہیں غلام بنالیتے تھے اور ان کے سارے حقوق سلب کر لیے جاتے تھے۔ اور ان کو ان تمام مظالم اور مصائب کا نشانہ بنایا جاتا تھا' جو اس دور میں غلاموں کے لیے مقدر سمجھی جاتی تھیں۔ عورت کی عصمت و آبرو کو بھی کوئی احترام حاصل نہ تھا؛ چنانچہ قیدی عورتوں کی عصمت ریزی میں فاتحین کو کوئی باک نہ ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات تو باپ' بیٹے اور بہت سے دوست واحباب مِل کر ایک ہی عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ ان کی مشترک داشتہ بنتی تھی۔ اور اس سلسلے میں نہ نسائیت کا احترام مانع ہوتا تھا۔ اور نہ اس کا کنوارا یا بیاہا ہونا ہی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا تھا۔ جو بچے جنگوں میں پکڑے جاتے ان کا بھی یہی حشر ہوتا تھا۔

ایک عملی مجبوری

ان حالات میں اسلام کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے تمام قیدیوں کو فی الفور رہا کر دے، کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا' تو یہ مصلحت سے بعید ہوتا' اور اس سے دشمنوں کو مزید شہ ملتی اور وہ کسی جوابی کارروائی کے خطرے سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں کے اعزہ واقربا کو غلام بناتے اور دل کھول کر انہیں اپنے مظالم اور انتقامی کارروائیوں کا تختۂ مشق بناتے رہتے؛ چنانچہ اس صورتِ حال میں اسلام کے لیے واحد معقول راہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ دشمن کے قیدیوں سے کم از کم ویسا ہی سلوک کرے' جیسا کہ وہ اس کے قیدیوں سے روا رکھتا تھا۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی یہ روایت اس وقت تک ختم نہیں کی جا سکتی تھی' جب تک دشمن بھی اس سلسلہ میں اسلام کے ساتھ تعاون نہ کرتا؛ چنانچہ اسلام نے اس کے وجود کو اس وقت تک برداشت کیا جب تک حالات اس کے کلی خاتمے کے لیے سازگار نہ ہو گئے۔ اور ساری دنیا کے لوگ جنگی قیدیوں کے متعلق ایک مشترکہ لائحہ عمل پر متفق نہ ہو گئے۔

جنگوں کی پرانی تاریخ

زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک جنگوں کی تاریخ غداری' مکاری اور ظلم و تشدد کی داستان

رہی ہے۔ یا دوسروں کو غلام بنا کر اپنے جارحانہ مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ۔ ان کے پیچھے مختلف قوموں کی ہوس ملک گیری اور خود غرضی کارفرما ملتی ہے۔ یہ جنگیں بادشاہوں اور فوجی قائدین کی شخصی اغراض، غرور یا جذبۂ انتقام کی پیداوار تھیں؛ چنانچہ ان گھٹیا اور خود غرضانہ مقاصد کے لیے لڑی جانے والی ان جنگوں میں جو قیدی پکڑے جاتے تھے، ان کو غلام بنانے کی وجہ یہ نہیں ہوتی تھی کہ وہ فاتحین سے عقیدہ اور نصب العین کے لحاظ سے گھٹیا انسان ہیں، یا ان سے جسمانی، نفسیاتی یا ذہنی صلاحیتوں میں فروتر ہیں، بلکہ اس کی وجہ ان کا یہ قصور تھا کہ وہ مفتوح قوم سے تعلق رکھتے تھے، جس نے میدانِ جنگ میں فاتحین کے ہاتھوں شکست کھائی تھی، لہٰذا فاتحین کو پورا پورا اختیار حاصل تھا کہ وہ انہیں جس طرح چاہیں ذلیل کریں، ان کی آبروؤں سے کھیلیں، ان کے پُرامن شہروں اور بستیوں کو تباہ و برباد کریں، اور ان کی عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچوں کو تہ تیغ کرتے پھریں۔ کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا، کیونکہ ان کے سامنے نہ کوئی بلند نصب العین تھا، اور نہ کوئی اعلیٰ اصولِ حیات۔

جنگ کے بجائے جہاد

اسلام نے آکر ان تمام خرابیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے خدا کی راہ میں جہاد کے سوا باقی تمام جنگوں کو مذموم قرار دے کر ان کی ممانعت کا اعلان کر دیا۔ اس نے جہاد کو باقی رکھا، کیونکہ اس کا مقصد انسان کو بے انصافی اور ظلم و ستم سے بچانا اور ان مستبد و جابر حکمرانوں کے تسلط سے نجات دلانا تھا جو لوگوں کے قبولِ حق کی راہ میں روڑا بن گئے تھے، اور بندوں کو خدا سے منحرف کر کے خود ان کے خدا بن بیٹھے تھے۔ ان کا خاتمہ بزورِ شمشیر ضروری تھا، تاکہ انسانوں کو حقیقی آزادی نصیب ہو، اور وہ اپنی مرضی سے حق کی صورتِ زیبا دیکھ کر اور اس کی آواز سن کر چاہیں تو اس کو قبول بھی کر سکیں؛ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ط	اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی

اور — وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ج (۳۹:۸)

اور تم ان سے اس وقت تک لڑو جب تک پورا دین اللہ کے لیے نہ ہو جائے۔

اسلام کا پیغام، امن وسلامتی کا پیغام ہے۔ اس سے کوئی انسان بے نیاز نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کی ضرورت سے مستغنی ہو سکتا ہے۔

یہ واقعہ کہ آج بھی دُنیا نے اسلام میں عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک معتدبہ تعداد موجود ہے جو پوری آزادی سے اپنے دین پر قائم ہے، اس حقیقت کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ اسلام دوسروں پر اپنا عقیدہ زبردستی نہیں ٹھونستا، اور نہ اس معاملے میں کسی جبرواکراہ کا قائل ہے۔[1]

غیر مسلموں سے اسلام کا سلوک

اگر کوئی قوم اسلام کے پیغام کو قبول کرلے اور اس کی لائی ہوئی صداقت پر ایمان لے آئے، تو مسلمانوں اور ان کے درمیان تمام دُشمنیاں ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ وہ خود مسلم معاشرے کا ایک جزو بن جاتے ہیں اور انہیں غلام بنانا یا ان کی تحقیر کرنا کسی طرح جائز نہیں رہتا۔ ان کو ویسے ہی حقوق حاصل ہوتے ہیں جیسے دوسرے مسلمانوں کو، کیونکہ مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں کسی قسم کی تفریق اور امتیاز سِرے سے جائز ہی نہیں ہے۔ نہ کسی عرب کو غیر عرب پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔ یہاں فضیلت کی بنا محض آدمی کی نیکی اور تقویٰ ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی قوم اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول نہ کرے، مگر اسلام کے زیرِ سایہ مسلمانوں کے ساتھ امن کے ساتھ رہنا چاہتی ہو، تو اسلام ان لوگوں کو مجبور کر کے اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ ان سے ایک مخصوص ٹیکس وصول کر کے

---

[1] مشہور انگریز مصنف آرنلڈ نے اپنی کتاب (THE PREACHING OF ISLAM) میں اسلام کے اس دعوے کی تصدیق وحمایت کی ہے۔

ان کی حفاظت کا پورا پورا ذمہ لے لیتا ہے۔ اسی ٹیکس کا نام جزیہ ہے۔ اس کی وصولی کے وقت اسلام اہلِ ذمہ سے اس بات کا عہد کرتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کسی بیرونی جارحیت سے ان کی حفاظت نہ کر سکی تو اس ٹیکس کی ساری رقم ان کو لوٹا دی جائے گی[1]۔ دوسرے مذاہب اور پیروؤں کی حفاظت کے ضمن میں یہ بات بھی یاد رہے کہ اپنے عقیدے کے مطابق اسلام دنیا کا بہترین دین ہے، مگر اس کے باوجود وہ دوسرے مذاہب کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے، البتہ اگر کوئی قوم نہ اسلام قبول کرے اور نہ اسلامی مملکت کو جزیہ دینے پر راضی ہو تو اسلام اسے اپنا دشمن قرار دیتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسلام سے اپنی پرخاش ختم کرنا نہیں چاہتے اور نہ اس کے ساتھ کسی قسم کے پُرامن سمجھوتے یا مصالحت پر آمادہ ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہر دور میں حق اور صداقت کی راہ میں چٹان بن کر کھڑے ہوتے رہے ہیں اور ان کے مادی وسائل اور ساری دولت و برتری ہمیشہ حق کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں صرف ہوتی رہی ہے۔ صرف انہی کے خلاف اسلام تلوار اٹھاتا ہے اور صرف اس وقت اٹھاتا ہے جب کہ اصلاحِ احوال کے باقی سارے راستے مسدود ہو جاتے ہیں، مگر اپنے ان دشمنوں کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کرنے سے قبل اسلام انہیں باقاعدہ الٹی میٹم دیتا ہے تاکہ ممکن ہو تو خون ریزی کی نوبت نہ آئے۔

---

[1] اسلامی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے، مگر اس موقع ہم ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ کی کتاب (THE PREACHING OF ISLAM) کے حوالے سے صرف دو کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔ اپنی کتاب کے صفحہ ۵۸ پر مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں: "حیرہ کے گرد و نواح کی بستیوں سے خالدؓ نے جو معاہدہ کیا اس میں تحریر تھا: اگر ہم تمہاری حفاظت کریں تو جزیہ ہمارا حق ہو گا، لیکن اگر ہم تمہاری حفاظت نہ کر سکے، تو ہم اس کے حقدار نہیں ہوں گے۔" آگے چل کر وہ کہتے ہیں: "چنانچہ عرب جرنیل ابو عبیدہؓ نے شام کے مفتوح شہروں کے تمام گورنروں کو تحریری حکم بھیجا کہ وہ جزیہ سے وصول ہونے والی تمام رقم ان شہروں کے باشندوں کو واپس کر دیں۔ اس کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ نے ان شہروں کے باشندوں کو لکھا: ہم تمہاری رقم تمہیں واپس دے رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ایک زبردست فوج ہمارے خلاف چڑھی چلی آ رہی ہے۔ چونکہ معاہدے کے مطابق اس وقت ہم تمہاری حفاظت کرنے سے قاصر ہیں، لہٰذا ہم تم سے وصول کردہ رقم واپس کر رہے ہیں۔ اگر ہم کو فتح ہوئی تو ہمارے اور تمہارے درمیان یہ معاہدہ قائم رہے گا اور ہم اس کی شرائط کے پابند ہوں گے۔"

یہ الٹی میٹم اسلام کی طرف سے صلح کی آخری کوشش ہوتا ہے کیونکہ وہ خون ریزی نہیں چاہتا بلکہ دُنیا کو امن وسلامتی سے ہمکنار دیکھنا چاہتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے :

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ	اور اگر وہ صُلح پر مائل ہوں تو
فَاجْنَحْ لَهَا وَ	تم بھی صلح کی طرف مائل ہو اور
تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط (۸ : ۶۱)	اللہ پر توکل رکھو ۔

جہادِ اسلامی کی اصل رُوح

یہ ہے ان اسلامی جنگوں کی داستان، جن کا محرک اسلام کا جذبہ تھا کہ انسانیت صراطِ مستقیم پر گامزن ہو۔ اس مقصد کے حصول میں پُرامن ذرائع سے کام نہ چلے، تو مجبوراً اسلام قوّت کا استعمال کرتا ہے۔ اسلام کی یہ جنگیں کسی فوجی قائد کی خود غرضی اور ہوسِ مُلک گیری کی پیداوار نہیں تھیں، نہ ان کے پیچھے دوسروں کو غلام بنانے کا جذبہ کار فرما تھا، بلکہ یہ جنگیں محض خدا کے لیے لڑی گئیں اور ان کا اصل مقصود رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ تھا، مگر بات صرف جذبے پر ہی ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اسلام نے ان جنگوں کے لیے باقاعدہ اصول و قوانین بھی مقرر کیے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مُسلمانوں کو ہدایات دیتے ہُوئے فرمایا: "اللہ کا نام لے کر جاؤ اور اس کی راہ میں جاکر لڑو، جو خدا سے بغاوت کرے، اس سے لڑو، مگر عہد شکنی نہ کرنا، نہ لاشوں کا مُثلہ کرنا، اور نہ کسی بچّے کو قتل کرنا۔"[1]

اسی طرح آنحضرتؐ نے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے مسلمانوں کی فوج کے خلاف جنگ میں عملاً حصہ لیا ہو امن پسند لوگوں پر ہتھیار اُٹھانے کی ممانعت کی ہے۔ مال واسباب تباہ وبرباد کرنے یا کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے سے بھی آپؐ نے مسلمانوں کو روک دیا۔ اور انہیں ہدایت کی کہ وہ کسی شر یا فساد کی حوصلہ افزائی کا باعث نہ بنیں، کیونکہ :

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۵ : ۶۴) اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

---

[1] مسلم ۔ ابوداؤد ۔ ترمذی ۔

اسلامی جہاد کی اعلیٰ روایات اور تاریخ

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی تمام جنگوں میں ــــ ان جنگوں میں بھی جو انہیں اپنے مکار صلیبی دشمنوں کے خلاف لڑنا پڑیں ــ اپنی ان اعلیٰ روایات کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ عیسائیوں نے جب یروشلم پر قبضہ کیا، تو انہوں نے وہاں کی مسلمان آبادی کو ہر طرح کے ظلم اور زیادتی کا نشانہ بنایا، ان کی آبروؤں کو پامال کیا، ان کے زن و مرد کو بے دریغ قتل کیا۔ یہاں تک کہ شہر میں مسلمانوں کی عظیم الشان مسجد بھی ان کی دست درازی سے نہ بچی۔ لیکن جب مسلمانوں نے دوبارہ اس شہر کو فتح کر لیا، تو انہوں نے ظالموں سے کوئی بدلہ نہ لیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ظلم و زیادتی کا بدلہ لینے کا پورا پورا حق حاصل تھا:

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ (۲ : ۱۹۴)	جو تم پر دست درازی کرے، تم بھی اس پر اسی طرح دست درازی کرو۔

اس کے بجائے مسلمانوں نے اپنے سابق دشمنوں کے ساتھ ایسا شریفانہ اور فیاضانہ برتاؤ کیا، جس کی نظیر چشم فلک نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔

مسلمانوں کے یہی اعلیٰ جنگی مقاصد اور روایات ہیں، جو ان کو غیر مسلموں سے ممتاز کرتے ہیں، ورنہ اسلام بڑی آسانی سے اس نظریے کو فروغ دے سکتا تھا کہ جو لوگ بُت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہیں اور حق و صداقت کے خلاف سرگرم عمل ہیں، وہ سرے سے انسان ہی نہیں ہیں، بلکہ نیم وحشی لوگ ہیں، اور اس لیے بس اسی قابل ہیں کہ انہیں غلام بنا کر رکھا جائے۔ اگر یہ ذہنی اور انسانی اوصاف میں فروتر نہ ہوتے، تو حق اور نور کے دشمن کیسے ہو سکتے تھے، اور صداقت کے خلاف محاذ کس طرح قائم کر سکتے تھے۔ چونکہ ان کی یہ حرکت ان کے مرتبۂ انسانیت کی نفی ہے، لہٰذا یہ لوگ نہ کسی عزت و احترام کے مستحق ہیں اور نہ اس آزادی میں ان کا کوئی حق ہو سکتا ہے، جو دنیا میں فقط مردانِ حُر کے لیے مخصوص اور مقدر ہے۔

اسلام اگر چاہتا، تو وہ بڑی آسانی سے یہ نقطۂ نظر بھی اختیار کر سکتا تھا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے کبھی یہ نہیں کہا اور نہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ چونکہ جنگی قیدی مرتبۂ انسانیت سے گرے ہوئے نیم وحشی انسان ہیں، لہٰذا ان کو غلام بنالیا جائے۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے جنگی قیدیوں کو بہ امر مجبوری غلام بنایا، کیونکہ ان کا دشمن ان کے بھائیوں کو، جو اس کی قید میں چلے گئے تھے، غلام بنالیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس وقت غلامی کے قطعی خاتمے کا اعلان نہیں کیا، بلکہ اس کے کُلی سدِباب کو اس وقت تک کے لیے مؤخر کر دیا کہ جب دُنیا نے اجتماعی طور پر غلامی کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا، اور یہ طے کر لیا کہ آئندہ متحارب اقوام جنگ میں گرفتار ہونے والے ایک دوسرے کے قیدیوں کو غلام نہیں بنائیں گی، بلکہ اس سے ہٹ کر ان سے کسی اور بنیاد پر معاملہ کریں گی۔ اگر اس وقت اسلام یکطرفہ کارروائی کر کے غلامی کا خاتمہ کر دیتا، تو اس سے مسلمانوں کے دشمن شیر ہو جاتے اور انہیں اس بات کی کُھلی چُھٹی مِل جاتی کہ وہ کسی انتقامی کارروائی کے اندیشے کے بغیر بلا غل وغش اپنی قید میں آئے ہوئے مسلمانوں کو ہر طرح کے مصائب و آلام اور ذلّت کا تختۂ مشق بناتے رہیں۔

غلامی اسلامی نظام کا مستقل جزو نہیں

اس مقام پر ہم سرسری طور پر اس امر کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ قیدیوں سے سلوک کے بارے میں واحد قرآنی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً	پھر اس کے بعد یا تو بطور احسان چھوڑ
حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ	دینا اور یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا،
اَوْزَارَهَا ۚ (۴۷:۴)	جب تک کہ لڑنے والے ہتھیار نہ رکھ دیں۔

اس آیت میں قیدیوں کو غلام بنانے کا کوئی ذکر موجود ہی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا، تو یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسلام کے قانونِ جنگ کا مستقل حصہ بن جاتا ہے۔ جن چیزوں کا اس میں بالصراحت ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ فدیہ لے کر یا بطور احسان بغیر

کسی فدیے کے قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے؛ چنانچہ انہی دو چیزوں نے اسلام کے قانونِ جنگ میں مستقل جگہ پائی اور قیدیوں کے بارے میں قرآنِ پاک کے حکم کے مطابق اب یہ دو طریقے ہی اختیار کیے جا سکتے ہیں، کوئی اور طریقہ اپنایا نہیں جا سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی زمانے میں جب مسلمانوں نے جنگی قیدیوں کو غلام بنایا، تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ غلامی اسلام کے قانونِ جنگ کا جزو تھی، بلکہ یہ اس پالیسی کا ایک حصہ تھی، جو اس وقت مسلمانوں کو مقتضیاتِ وقت کے مطابق اختیار کرنی پڑی۔ یہ محض مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غلامی اسلامی قانون کا جزوِ غیر منفک ہرگز نہیں ہے۔

غلامی پر اسلام نے کبھی اصرار نہیں کیا

لیکن مصلحت کے ان تمام تقاضوں کے باوجود اسلام نے کبھی اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ جنگی قیدیوں کو لازماً غلام بنایا جائے۔ اس کے برعکس اس کا طریقہ یہ تھا کہ اگر امن و امان قائم ہو جاتا، تو کسی کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا۔ خود پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر میں گرفتار ہونے والے سردارانِ مکہ میں سے بعض کو فدیہ لے کر، اور کچھ کو بغیر فدیے کے آزاد کر دیا۔ اسی طرح آپؐ نے نجران کے عیسائی وفد سے جزیہ لینا قبول کر لیا اور اس کے عوض ان کے تمام قیدی چھوڑ دیے۔ اسلام کے یہ روشن کارنامے دیکھ کر ہی انسانیت رفتہ رفتہ اس قابل ہوئی کہ ماضی کے تاریک اثرات سے آزاد ہو، اور جنگی قیدیوں کے مسئلے کا کوئی خالص انسانی حل تلاش کر سکے۔

چنانچہ مختلف جنگوں میں مسلمانوں نے جو قیدی گرفتار کیے، ان سے کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی، اور نہ انہیں کسی طرح کی اذیت اور تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنایا گیا، بلکہ اس کے بجائے ان کی کھوئی ہوئی آزادی بحال کرنے کی راہ نکالی گئی، اور اس کے لیے شرط صرف یہ رکھی گئی کہ وہ آزادی کے بعد اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت رکھتے ہوں؛ چنانچہ اگر ان میں سے کوئی اس معیار پر پورا اترتا، تو اسے بلا تامل آزاد کر دیا جاتا تھا، حالانکہ ان میں سے بعض لوگ تو ایسے تھے، جو مسلمانوں

کی قید میں آنے سے قبل کئی نسلوں سے غلام در غلام چلے آتے تھے۔ یہ لوگ غلاموں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جن کو ایرانی اور رومی سلطنتیں دوسرے ملکوں سے پکڑ لاتی تھیں اور پھر انہیں مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے محاذِ جنگ پر بھیج دیتی تھیں۔

دُشمن کی گرفتار شُدہ عورتیں

جہاں تک عورتوں کا تعلّق ہے، اسلام نے غلامی اور قید کی حالت میں بھی ان کی نسوانیت کا احترام ملحوظ رکھا، حالانکہ وہ دُشمن قوم سے تعلق رکھتی تھیں اور جنگ میں گرفتار ہو کر آتی تھیں۔ اسلام نے کسی مُسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ انہیں بے آبرو کرے اور میدانِ جنگ میں ملنے والے مالِ غنیمت کا جزو سمجھتے ہُوئے ان پر قابض ہو جائے۔ اس نے ان عورتوں کو مشترکہ ملکیت بھی نہیں قرار دیا کہ جو چاہے انہیں ہوس ناکی اور درندگی کا شکار بناتا پھرے اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔ اس کے برعکس اسلام نے ان عورتوں کو صرف ان کے مالکوں کے لیے مخصوص کر دیا اور صرف انہی کو ان سے متمتع ہونے کا حق دیا، جس کے بعد کسی غیر کے لیے ان سے جنسی تعلقات جائز نہ رہے۔ مزید برآں ان کے لیے بھی مکاتبت کے ذریعے آزادی کی راہ کھول دی گئی، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ طے کر دیا گیا کہ اگر کوئی لونڈی اپنے مالک کے صُلب سے بچے کی ماں بن جائے، تو اس کے ساتھ ہی وہ خود بخود آزاد عورت قرار پائے گی اور اس کا بچہ بھی آزاد انسان سمجھا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قیدی عورتوں کے ساتھ قید کے دوران میں اسلام کا برتاؤ کتنا فیاضانہ اور پاکیزہ تھا۔

یہ ہے اسلام میں غلامی کی داستان۔ یہ تاریخِ انسانی کا ایک درخشاں باب ہے۔ اصولی لحاظ سے اسلام نے کبھی غلامی کو پسندیدہ قرار نہیں دیا، بلکہ اپنے تمام وسائل اور ذرائع سے اس کو ہمیشہ مٹانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ وقتی طور پر اسلام نے اس کے وجود کو برداشت کیا بھی، تو محض اس لیے کہ اس کے سامنے اس کے سوا اور کوئی متبادل راہ موجود نہ تھی، کیونکہ اس کے قطعی انسداد

کے لیے صرف مسلمانوں کی رضامندی ہی کافی نہ تھی، بلکہ غیر مسلموں کی حمایت اور تعاون بھی ضروری تھا۔ اسلام اس وقت تک غلامی کا قطعی انسداد نہیں کر سکتا تھا جب تک باقی دنیا بھی جنگی قیدیوں کو غلام بنانے سے اجتناب کرنے کا قطعی فیصلہ نہ کر لیتی۔ بعد میں جب اقوامِ عالم اس سلسلے میں ایک قطعی اور مشترک حل پر رضامند ہو گئیں، تو اسلام نے اس کا خیر مقدم کیا، کیونکہ یہ فیصلہ اس کے نظامِ زیست کے اس بنیادی اور اٹل اصول کا عین منطقی نتیجہ تھا کہ آزادی اور مساوات تمام انسانوں کا بنیادی حق ہے۔

دورِ جدید میں غلامی کا کاروبار

بعد کے ادوار میں غلامی، انسانوں کی خرید و فروخت، اور ان کی تجارت کی جو مثالیں ممالکِ اسلامیہ کی تاریخ میں ملتی ہیں، ان سے اسلام کا کوئی واسطہ نہیں۔ غلامی کی یہ صورتیں کسی اسلامی جہاد کا نتیجہ نہیں تھیں، بلکہ ان کی حیثیت اسلامی تاریخ میں وہی ہے، جو اسلام کے نام پر مختلف جرائم کا ارتکاب کرنے والے موجودہ مسلم حکمرانوں کے جرائم کی ہے۔ جس طرح ان جرائم کو اسلام کی جانب منسوب کرنا صحیح نہیں ہے، اسی طرح غلامی کی ان صورتوں کا اس کی جانب انتساب بھی صحیح نہیں۔

غلامی پر بحث کا خلاصہ

مسئلۂ غلامی پر غور کرتے وقت مندرجہ ذیل حقائق ہمیشہ ہماری نگاہوں میں رہنے چاہئیں:

۱۔ اسلام کے بعد کے ادوار میں مختلف حکومتوں نے غلامی کی پشت پناہی کی اور اس کی مختلف شکلوں کو مختلف طریقوں سے برقرار رکھا، حالانکہ ان ادوار میں ان کو کوئی خاص مجبوری درپیش نہیں تھی۔ ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ ہوسِ ملک گیری اور حرصِ اقتدار تھی، جس کی وجہ سے ہر قوم یا طبقہ دوسری قوموں یا طبقات کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ غلامی کی ایک اور وجہ غربت اور افلاس بھی تھی۔ جو لوگ

غریب گھرانے میں پیدا ہوتے تھے' یا زمینوں پر مزارعین کی حیثیت میں کام کرتے تھے' انہیں حقیر خیال کیا جاتا تھا' اور ان سے غلاموں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔ اسلام غلامی کی ان تمام صورتوں کے قطعی انسداد کا حامی تھا؛ چنانچہ اسلام نے ان سب کو سوائے اس ایک صورت کے' جس کے لیے حالات ابھی تک سازگار نہیں تھے' ختم کر دیا۔

۲۔ یورپ میں ایک عرصۂ دراز تک غلامی بغیر کسی خاص ضرورت کے موجود رہی ہے' یہاں تک کہ بعد میں جب اس کا خاتمہ ہوا بھی' تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اہلِ یورپ دِل سے اس کے خاتمے کے حامی تھے' بلکہ ان کے پیچھے ان کی بعض مجبوریاں تھیں' ورنہ انہوں نے کبھی خوش دِلی سے اس کے خاتمے کو قبول نہیں کیا؛ چنانچہ خود یورپی مصنفین کی تحریریں گواہ ہیں کہ یورپ میں غلامی کے انسداد کی اصل وجہ وہ معاشی حالات تھے' جن کی وجہ سے غلام بجائے اس کے کہ اپنے آقا کی دولت میں اضافے کا باعث بنتے' ان کے لیے الٹا معاشی بوجھ بن گئے تھے' کیونکہ اب ان میں آقاؤں کے لیے نہ محنت کرنے کا جذبہ باقی رہ گیا تھا' نہ ان کے جسموں میں اتنی قوت ہی باقی رہ گئی تھی کہ وہ آقاؤں کی معاشی خوشحالی کا ذریعہ بن سکتے۔ ان کی خوراک اور نگرانی پر جتنا خرچ اُٹھتا تھا' وہ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی سے کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا۔ الغرض یورپ میں غلاموں کی آزادی کی تحریک خالص معاشی اسباب کی پیداوار تھی۔ اور سُود وزیاں کا خالص کاروباری مسئلہ تھا۔ اس کا اور اسلام کے اس بلند اور پاکیزہ نصب العین کا آپس میں کوئی علاقہ نہیں' جس نے دُنیا کو انسانیت کا بلند تصوّر دیا۔ اور اس طرح غلاموں کو آزادی سے بہرہ ور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ اس طرح کے پے در پے خونی معاشرتی انقلابات کے تذکرے سے یکسر خالی ہے' جن سے یورپ کی تحریکِ آزادی کی تاریخ داغدار ہے۔ ان انقلابات کے بعد وہاں کے آقاؤں کے لیے ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ وہ اپنے غلاموں کو غلام بنا کر اپنے قابو میں رکھ سکتے' لہٰذا انہیں بادلِ نخواستہ ان کو آزاد کرنا پڑا۔

مگر ان معاشرتی انقلابات کے باوجود یورپی غلاموں کو اپنی آزادی کے تحفظ کی ضمانت کبھی حاصل نہیں ہوئی' بلکہ ان انقلابات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد ان کی

غلامی اور محتاجی کے بندھن کچھ اور زیادہ مضبوط ہو گئے اور ان کی تقدیر اپنی مزروعہ زمینوں سے بندھ کر رہ گئی، جن کی فروخت پر وہ بھی بِک جاتے تھے۔ ان مزارعین کو اپنی زمین چھوڑ کر کہیں اور جانے کی اجازت نہ تھی، چنانچہ اگر ان میں سے کوئی اس حرکت کا مرتکب ہوتا، تو قانونِ مُلکی کی نگاہ میں وہ بھگوڑا اور مفرور قرار پاتا، اور گرفتار ہونے پر اس کے جسم کو داغا جاتا، اور پھر پابہ جولاں اپنے مالک کی تحویل میں دے دیا جاتا تھا۔ غلامی کی یہ نوع یورپ میں اٹھارویں صدی عیسوی کے انقلابِ فرانس تک موجود رہی ہے۔ گویا یورپ کو غلامی کے خاتمے کی توفیق اسلام کے منشورِ آزادی کے کوئی گیارہ صدی بعد جا کر حاصل ہوئی۔

"چہرہ روشن اندرون تاریک تر"

۲۔ لیکن ٹھہریئے خوبصورت ناموں اور خوشنما الفاظ اور تراکیب سے دھوکا نہ کھائیے۔ کہنے کو تو انقلابِ فرانس کے بعد یورپ میں اور ابراہام لنکن کے فرمان کے بعد امریکہ میں غلامی کی لعنت ختم ہو گئی، اور دُنیا نے اس کے خلاف فیصلہ بھی دے دیا۔ مگر حقیقت اتنی خوشگوار نہیں جتنی کہ ان الفاظ میں نظر آتی ہے، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ غلامی کا وجود اب بھی دُنیا میں موجود ہے، اگر ایسا نہ ہوتا، تو جبر و استبداد کا دیوتا مختلف بہروپ بدل کر یوں دُنیا بھر میں رقصاں نظر نہ آتا۔ اگر غلامی کی لعنت سے فی الواقع دُنیا پاک ہو چکی ہے، تو الجزائر میں فرانسیسیوں کی درندگی اور وحشت کے کارناموں کا عنوان کیا ہوگا؟ اور ان تاریک جرائم کو کس نام سے تعبیر کیا جائے گا، جو امریکی اپنے ہم وطن حبشیوں کے خلاف روا رکھے ہوئے ہیں، نیز جنوبی افریقہ کے رنگ دار باشندوں سے اہلِ یورپ کے ظالمانہ طرزِ عمل کو کیا نام دیا جائے گا؟

غلامی کے نئے نام

آخر غلامی اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو غلام بنا کر اس کو

اس کے تمام انسانی حقوق سے محروم کر دے۔ یہی غلامی کا حقیقی مفہوم ہے' لہٰذا آیئے کہ ہم خوشنما نعروں سے دھوکا نہ کھائیں' بلکہ ان کی اصلیت پہچاننے کی کوشش کریں۔ اور غلامی کی ان مختلف صورتوں پر آزادی' اخوّت اور مساوات کے خوبصورت اور خوشنما لیبل چسپاں نہ کرتے پھریں' کیونکہ خوشنما اور رنگین لیبلوں سے کسی شئے کی خباثت اور بدی' لطافت اور اچھائی میں تبدیل نہیں ہو جاتی اور نہ کسی کے مکروہ اور گھناؤنے جرائم پر اس طرح کے رنگین پردے ڈال کر انہیں چھپایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ نسلِ انسانی کو ان کی تلخیوں کا ایک دو دفعہ نہیں' بلکہ بار بار تجربہ بھی ہو چکا ہو۔

اسلام کی صداقت شعاری

اپنے مدعا اور مؤقف کے اظہار و بیان میں اسلام نے کبھی کسی مداہنت سے کام نہیں لیا' بلکہ ہر موقع پر کھُل کر ان کا اظہار کیا ہے تاکہ اس کے اصل عزائم کسی پر مخفی نہ رہیں۔ اس نے صاف اور واضح الفاظ میں غلامی کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا' اس کے اصل اسباب کی نشاندہی کی' اس کے سدِ باب کے طریقے بتائے اور اس کے کلّی خاتمے کی راہ ہموار کی۔

تہذیبِ جدید کی منافقت

اس کے برعکس تکلّف اور تصنّع کے غازے سے مزیّن تہذیبِ جدید اپنے حقیقی مدعا اور طریقۂ کار دونوں میں ابہام کی شکار ہے۔ یہ نہ تو اپنے حقیقی عزائم کے اظہار میں بے باک ہے اور نہ اس کا طریقِ کار ہی واضح ہے۔ اس کا امتیازی وصف ہے ع

چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

تیونس' الجزائر اور مراکش میں اس تہذیب کے فرزندوں نے ہزاروں افراد کو محض اس جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا کہ وہ آزادی چاہتے تھے اور اپنے لیے احترامِ آدمیت کے طالب تھے۔ اپنے وطن پر غیروں کے بجائے اپنی حکومت چاہتے تھے۔ اپنی زبان میں

گفتگو کے خواہش مند تھے۔ اور چاہتے تھے کہ دُنیا کی دُوسری آزاد قوموں کی طرح ان کا وطن بھی آزاد ہو، جہاں وہ بیرونی مداخلت سے آزاد رہ کر اپنی مرضی سے اپنے دین اور عقیدے کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کر سکیں اور دوسروں سے جس نہج پر چاہیں، اپنے اقتصادی اور سیاسی روابط استوار کریں۔ تہذیب جدید کے علمبرداروں نے ان بے گناہوں کے خُون سے بے دریغ اپنے ہاتھ رنگے، انہیں سڑنے کے لیے غلیظ اور متعفن عذاب گھروں میں محبوس رکھا۔ ان کی آبروؤں کو لُوٹا، ان کی عورتوں کی عصمت دری کی، اور آپس میں شرطیں بد بد کر حاملہ عورتوں کے پیٹ سنگینوں سے چاک کیے۔ بیسویں صدی کی اس دوغلی تہذیب کے علمبرداروں نے ان سب گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا، مگر ہر جگہ زبان سے یہی اعلان کیا کہ وہ دنیا کو آزادی، اخوت اور مساوات کا درس دینے نکلے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ان گھناؤنے اور مکروہ جرائم کو تو روشنی اور ترقی کا نام دیتے ہیں، مگر آج سے تیرہ صدی پیشتر اسلام نے بغیر کسی خارجی دباؤ اور مجبُوری کے محض احترام آدمی کے جذبہ سے سرشار ہو کر غلاموں سے جو فیاضانہ برتاؤ کیا اور صاف صاف اعلان کیا کہ غلامی انسانی زندگی کی کوئی مستقل قدر نہیں ہے، بلکہ محض ایک عارضی حالت ہے، اس کو یہ حضرات وحشت، رجعت پسندی اور تاریک خیالی سے تعبیر کرتے ہیں ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے!

اسی طرح اگر امریکی اپنے ہوٹلوں اور تفریح گاہوں پر "صرف سفید فام لوگوں کے لیے اور کالوں اور کتّوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے" کی طرح کے کتبے آویزاں کرتے ہیں۔ اور جب مہذّب امریکیوں کا کوئی ہجوم رنگدار نسل کے کسی فرد کو اپنی وحشت اور بربریت (LYNCHING) کا شکار بنانے کے بعد اسے سڑک پر اپنے جُوتوں سے اس وقت تک گیند کی طرح اچھالتا پھرتا ہے، جب تک کہ اس کی رُوح قفس عنصری سے پرواز نہ کر جائے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس سارے ہنگامۂ وحشت و بربریت کو پولیس خاموش تماشائی کی طرح کھڑی دیکھتی رہتی ہے اور مظلوم کو غضبناک ہجوم سے بچانے

کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتی، حالانکہ وہ زبان، مذہب اور انسانیت کے لحاظ سے انہی کا ہم جنس اور ہم وطن ہے۔ تہذیبِ جدید کے فرزندوں کا دامن ان تمام گھناؤنے جرائم اور افعال سے داغدار ہے، مگر اس کے باوجود ان کی تہذیب، شرافت اور ترقی پر کوئی آنچ نہیں آتی، اور نہ ان کے ترقی یافتہ اور مہذب ہونے پر کوئی حرف آتا ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں، تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا!

ایک طرف تو فرزندانِ تہذیب کا یہ طرزِ عمل ہے، اور دوسری طرف اسلامی تاریخ کی یہ درخشاں مثال کہ جب خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کو ایک غلام نے قتل کی دھمکی دی، تو باوجود قدرت واختیار رکھنے کے آپ نے اس کو کچھ نہ کہا۔ اسے نہ قید کیا گیا، نہ جلاوطن کیا گیا، اور نہ یہ کہہ کر اس کو جلاد کے حوالے کیا گیا کہ وہ نیم وحشی انسان ہے، جو اپنی آنکھوں سے حق وصداقت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود محض تعصب اور ہٹ دھرمی کی بنا پر باطل اور جھوٹ کی پرستش پر مُصر ہے۔ اس دھمکی کے جواب میں حضرت عمرؓ نے بس اتنا کہا: "اس غلام نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی ہے"۔ اور اس کے بعد اس سے کوئی تعرض نہ کیا، اور نہ اس کی آزادی پر کوئی قدغن عائد کی۔ اس پر خلیفہ کے قتل کا الزام صرف اس وقت عائد کیا گیا، جب کہ وہ عملاً اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کر چکا تھا۔

افریقہ میں انگریزوں کے مظالم

انگریزوں نے افریقہ کے سیاہ فام باشندوں سے جو سلوک روا رکھا ہے، اور بقول برطانوی اخبارات کے، جس طرح ان کا جانوروں کی طرح شکار کھیلا ہے اور انہیں اپنے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کیے رکھا ہے، وہ انگریز کی انصاف پرستی اور تہذیبِ جدید کا نقطۂ کمال ہے۔ یہاں پر ہمیں برطانوی انصاف اور تہذیبِ جدید اپنے حقیقی رُوپ میں جلوہ گر ملتے ہیں۔ اور یہی وہ "اعلیٰ" اور "شاندار" اصولِ حیات ہیں جن کی بنا پر اہلِ مغرب اقوامِ عالم پر اپنی بالادستی اور برتری کے مدعی ہیں۔ اور اسلام کو اس جرم میں کہ اس نے

دشمن کے قیدیوں کو برابر کے سلوک کی بنیاد پر غلامی کو سندِ جواز عطا کیے بغیر وقتی طور پر غلام بنانے کی اجازت دی، سطحی، وحشیانہ اور رجعت پسند قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسلام رجعت پسندانہ دین ہے، کیونکہ اس نے جانوروں کی طرح آدمیوں کے شکار کی اجازت نہیں دی اور محض کالی چمڑی کی وجہ سے کسی کو قتل و غارت گری کے حوالے نہیں کیا، یہی نہیں بلکہ اس کی رجعت پسندی کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے صاف صاف الفاظ میں اعلان کر دیا "سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تمہارا حاکم کوئی ایسا حبشی ہو جس کا سر منقیٰ جیسا ہو"۔

قیدی عورتوں کے مسئلہ کا حل

قیدی عورتوں کے مسئلہ کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ جنگ میں جو غیر مسلم عورتیں گرفتار ہو کر آتی تھیں، اسلام نے ان کے مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ ان کو مسلمانوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ گنجائش ہوتی، تو ایک آدمی کو کئی کئی عورتیں بھی سونپ دی جاتی تھیں، جن پر اس کو مالکانہ حقوق حاصل ہوتے تھے۔ اور صرف وہی مالک اپنی ان مملوکہ لونڈیوں سے جنسی تعلقات قائم کر سکتا تھا، بلکہ اگر وہ چاہتا تو ان میں سے اپنی پسند کی عورتوں سے باقاعدہ شادی بھی کر سکتا تھا۔ جدید یورپ اسلام کے اس طرزِ عمل پر نفرت سے ناک بھوں چڑھاتا ہے، مگر جو مرد و زن اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے لیے آپس میں ناجائز تعلقات قائم کرتے ہیں، اور اس سلسلے میں کسی قانون اور انسانی اصول کو خاطر میں نہیں لاتے، انہیں دیکھ کر اس کے ضمیر میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی۔ آزاد شہوت رانی اس کے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔ دراصل اسلام کا ناقابلِ معافی قصور یہ ہے کہ وہ بدکاری کی اجازت نہیں دیتا، نہ اس کے ان شرمناک مظاہر کو برداشت کرتا ہے، جس کا جدید یورپ عادی ہو چکا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اہلِ یورپ اسلام سے اس قدر ناراض نظر آتے ہیں۔

قیدی عورتوں کی حالتِ زار اور اسلام

دوسری قوموں میں قیدی عورتوں سے انتہائی شرمناک سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ قید

کے بعد وہ قحبہ گری اور بدکاری کی گھناؤنی زندگی گزارنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں پاتی تھیں، کیونکہ معاشرے میں ان کو کوئی عزّت حاصل نہیں تھی، نہ ان کی پُشت پر کوئی اقتدار و قوّت ہی موجود تھی، جو ان کی عصمت و آبرو کی محافظ بنتی۔ ان کے مالک ان کے محافظ بن سکتے تھے، مگر ان کے لیے تو وہ آمدنی کا ذریعہ تھیں؛ چنانچہ بسا اوقات خود مالک اپنی لونڈیوں کو قحبہ گری اور پیشہ کرانے پر مجبور کرتے تھے، مگر جب "رجعت پسند اور ترقی ناآشنا" اسلام کا دَور آیا، تو اس نے بدکاری اور فحاشی کے اس ذریعے کا بھی خاتمہ کر دیا اور یہ قانون بنا دیا کہ لونڈیوں سے صرف وہی لوگ متمتع ہو سکتے ہیں، جو ان کے قانونی مالک ہیں۔ ان کی معاشی کفالت کا بار بھی اس نے مالکوں کے کندھوں پر ڈال دیا تاکہ وہ کسی معاشی اور جنسی مجبوری اور اضطرار کی وجہ سے کسی قسم کی غلط کاری اور بے راہروی کی شکار نہ ہونے پائیں، اور اپنے مالکوں کے تحفّظ میں پاک اور ستھری زندگیاں گزار سکیں۔

آزادیٔ نسواں کی حقیقت

لیکن یورپ کا "حسّاس" ضمیر اس "وحشت و بربریت" کا روادار نہیں۔ اس کے نزدیک اسلام کا یہ طرزِ عمل دورِ وحشت کی یادگار ہے، لہٰذا وہ بدکاری اور عصمت فروشی کو نہ صرف یہ کہ جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس کو قانونی تحفّظ بھی عطا کرتا ہے، اور اپنے مکروہ استعماری عزائم کی تکمیل کی خاطر دنیا بھر کو اس کی گندگی اور وبا میں مبتلا کر دینا چاہتا ہے؛ چنانچہ یہ لعنت اب بھی دُنیا پر مسلّط ہے۔ اگرچہ اس کے نام نئے ہیں، اور اس پر طرح طرح کے خوش رنگ پردے پڑے ہُوئے ہیں۔ آزادیٔ نسواں کے تمام دعوؤں کے باوجود عورت اب بھی مظلوم ہے اور مَردوں کے لیے دِل بہلانے کا سامان بنی ہُوئی ہے۔ دورِ جدید کی بنی ٹھنی طوائف اور پیشہ ور عورت کو کیا کسی لحاظ سے بھی حقیقی معنی میں آزاد عورت قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا آج کی عورت حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہے؟ اسلام نے لونڈیوں اور مالکوں کے درمیان جن انسانی اور روحانی رشتوں کو استوار کیا تھا، ان کی پاکیزگی

اور شرافت اور تہذیبِ جدید کے زیرِ سایہ ہونے والے عصمت فروشی کے اس مکروہ اور گھناؤنے کاروبار میں آخر کیا نسبت ہے؟

قحبہ گری اور تہذیبِ جدید

اسلام اپنے نظریے اور افکار میں بالکل واضح اور روشن ہے، مگر تہذیبِ جدید اس خصوصیت سے محروم اور پریشان خیالی اور ژولیدہ فکری کی شکار ہے۔ اس کی ایک مثال قحبہ گری اور عصمت فروشی کا کاروبار ہے۔ تہذیبِ نو اس کو غلامی کے دَور کی ایک یادگار تسلیم کرتی ہے، مگر اس کے باوجود یہ کہہ کر اس کو باقی رکھنے پر اصرار کرتی ہے کہ یہ ایک ناگزیر "معاشرتی ضرورت" ہے۔

اب ذرا اس "ناگزیر معاشرتی ضرورت" پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلیے، جس کی وجہ سے یورپ قحبہ گری کی اس لعنت کو باقی رکھنے پر مُصر ہے۔

خود غرضی

موجودہ زمانے میں قحبہ گری کی بڑی وجہ تہذیبِ جدید کی خود غرضی ہے، جس کی وجہ سے جدید یورپ کا کوئی مہذّب فرد اپنی ذات کے سوا کسی اَور کی معاشی کفالت کا خواہ وہ اس کی بیوی ہو یا بچے، بار اُٹھانے پر تیار نہیں ہے۔ وہ لذّت کا طالب ہے، مگر کسی قسم کی ذمہ داریاں اپنے سر لینے کے لیے تیار نہیں، چنانچہ اپنی جنسی تسکین کے لیے اس کو عورت کی تلاش ہوتی ہے محض اس کے جسم کی۔

قحبہ گری کی اصل وجہ

یہ ہے وہ "ناگزیر معاشرتی ضرورت" جس کو بنیاد بنا کر موجودہ زمانے کے یہ روشن خیال حضرات عورت کی اس غلامی کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر یہ محض فریبِ نظر ہے، کیونکہ قحبہ گری کی اصل وجہ جدید انسان کی خواہش پرستی اور غلط بینی ہے،

اس لیے جب تک اس کی انسانیت کی سطح بلند نہ ہو گی، قحبہ گری کی اس لعنت کا تدارک بھی ناممکن ہے۔

اس مقام پر یہ بات واضح رہے کہ مغرب کی جن "مہذب" حکومتوں نے بعد کے ادوار میں قحبہ گری پر قدغن عائد کی، ان کا اصل محرک طوائف کی نسائیت یا انسانیت کے احترام کا جذبہ نہیں تھا، اور نہ یہ فعل ان کے کسی اخلاقی، نفسیاتی اور رُوحانی ارتقاء کا مظہر تھا کہ جس کی بدولت ان کے نزدیک قحبہ گری کوئی مردود اور مکروہ شئے بن گئی ہو، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بنی سنوری سوسائٹی گرلز کے میدانِ عمل میں اُتر آنے کے بعد ان طوائفوں کی کوئی خاص معاشرتی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور نہ بدکاری کے جُرم یا گناہ ہونے کا تصور ہی باقی رہ گیا تھا، مگر اس کے باوجود ان لوگوں کی ہٹ دھرمی کا یہ عالم ہے کہ وہ تیرہ صدی پیشتر اسلام کے لونڈیوں کے متعلق طرزِ عمل کی آڑ لے کر اب تک اس پر زبان طعن وتشنیع دراز کرتے رہتے ہیں، حالانکہ اسلام نے لونڈیوں کے مسئلے کا یہ حل عارضی طور پر اختیار کیا تھا، اور اس کو اپناتے وقت تصریح کر دی تھی کہ اس کا منشاء اس صورتِ حال کو دوام بخشنا ہرگز نہیں ہے، مگر اس کے علی الرغم یہ لوگ اسلام کو غلامی کا طعنہ دیتے ہیں اور یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ وہ ان کی بیسویں صدی کی تہذیب سے، جسے وہ بزعمِ خویش معراجِ انسانیت، تغیر نا آشنا اور دائمی قرار دیتے ہیں کہیں زیادہ پاکیزہ، فطری اور کامل و اکمل دین ہے۔

یہ سوسائٹی گرلز

جدید مغربی معاشرت میں لذت پرست اور عیّاشی کی خوگر سوسائٹی گرلز جس بیباکی اور "آزادی" سے اپنے جسموں کو دوسروں کے حوالے کرتی نظر آتی ہیں، اس سے ہمیں دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ یہ آزادی نہیں ہے، بلکہ غلامی کی وہ قسم ہے کہ جس میں غلام برضا و رغبت غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں، مگر اس طرح کے چند غلام فطرت افراد کا وجود اور ان کی اپنی آزاد انسانی حیثیت سے یوں دست برداری نہ تو اسلام کے

نزدیک ان کو دائمی غلامی کی لعنت میں مبتلا رکھنے کے لیے کوئی سندِ جواز فراہم کرتی ہے اور نہ دُنیا کا کوئی اور مذہب یا فلسفۂ حیات اس بنا پر ان کی غلامی کو جائز قرار دے سکتا ہے۔

یورپی تہذیب کا اصل کارنامہ

اس صورتِ حال سے اس نظامِ حیات کی تباہ کاری واضح ہوتی ہے، جو ایک ایسا معاشی، سیاسی، فکری اور روحانی ماحول پیدا کر دیتا ہے جس میں لوگ اتنے مجبور ہو تے ہیں کہ وہ آزادی پر غلامی کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ دراصل یورپی تہذیب اب تک جو کارنامہ سرانجام دے سکی ہے، اس کا طول وعرض بس یہی کچھ ہے۔ ؏

بے کاری و مے خواری و عریانی و افلاس

یورپ میں غلامی کی اصل وجہ

یہ ہے مختصراً یورپ میں غلامی کی داستان۔ اس کی تاریخ مَردوں، عورتوں اور پُوری پُوری قوموں اور طبقات کی غلامی کی تاریخ سے عبارت ہے۔ اس کے وجود میں آنے کے مختلف اسباب تھے، جس کے بعد ایک طویل عرصے تک بغیر کسی خاص معاشرتی ضرورت یا مجبوری کے، اس کو باقی رکھا گیا۔ یورپ کو اس قسم کے حالات بھی درپیش نہیں تھے جن سے تیرہ صدی قبل اسلام کو واسطہ پیش آیا تھا، اور اس نے مجبوراً غلامی کی ایک شکل کو باقی رکھا تھا۔ اس کے برعکس یورپ میں غلامی کا یہ ناجائز استمرار اس کی تہذیب کی گھناؤنی اور غیر انسانی فطرت کا عکس تھا، نہ کہ اس کی کسی خاص ضرورت یا مجبوری کا شاخسانہ!

اشتراکی ممالک

آخر میں ہم چند الفاظ جدید اشتراکی ممالک کے بارے میں بھی کہنا چاہتے ہیں۔ ان ممالک کے باشندوں پر بھی غلامی کی لعنت مسلط ہے، اور وہ اشتراکیت کے دیو استبداد کے پاؤں تلے کراہ رہے ہیں۔ ان مُلکوں میں بس ایک ہی آقا ہوتا ہے، اور وہ ہے حکومت۔

باقی لوگوں کا کام بے چون وچرا اطاعت ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کے شہریوں کو اپنے پیشے اور ملازمت کے انتخاب کی آزادی تک حاصل نہیں ہے' کیونکہ وہ غلام ہیں' اور غلام کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے ان اشتراکی ممالک اور سرمایہ دار ممالک میں کوئی فرق نہیں ہے' ایک میں حکومت اختیار اور قوت کا منبع ہوتی ہے' اور دوسرے میں بڑے بڑے سرمایہ دار قوت واقتدار پر قابض ہوتے ہیں' اور مزدور ان کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔

قارئینِ کرام سے

مضمون کے خاتمے سے قبل ایک بات ہم قارئینِ کرام سے بھی کہنا چاہتے ہیں۔ ان کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے حامی اپنے اپنے نظریۂ زندگی کی تعریف میں رطب اللسان نظر آئیں گے' مگر ہمیں اُمید ہے کہ اگر وہ ہماری ان معروضات کو نگاہ میں رکھیں گے' تو ان لوگوں کے فریب میں نہیں آئیں گے۔ ہماری ان گزارشات سے اُمید ہے قارئین نے یہ حقیقت بھی ذہن نشین کر لی ہوگی کہ باوجود ناموں کے اختلاف کے' اشتراکیت اور سرمایہ داری دراصل قدیم زمانے کی غلامی ہی کی نئی صورتیں ہیں' جو تہذیب اور سماجی ترقی کے پردے میں قائم ودائم ہیں۔ اسلام کی بتائی ہُوئی صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر انسانیت نے ترقی کی ہے' یا وہ بتدریج تنزل اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے؟ اس کا اندازہ بھی اب قارئینِ کرام خود کر سکتے ہیں' اور وہ دیکھ سکتے ہیں کہ آج بھی دنیا اسلام کی رہنمائی کی کس قدر محتاج ہے۔

اسلام اور جاگیرداری

حال ہی میں جب میں نے ایک طالب علم کے متعلق سُنا کہ اس نے ایم اے کی سند کے لیے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں یہ "ثابت" کیا ہے کہ اسلام ایک جاگیرداری نظام ہے، تو مجھے انتہائی حیرت ہوئی۔ طالب علم کو تو اس لحاظ سے معذور بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے اس کا مقصد ہی اسلام کو بدنام کرنا ہو اور وہ اس وجہ سے جان بوجھ کر حقائق سے چشم پوشی کا مرتکب ہوا ہو، یا پھر وہ حقائق سے واقعی بے خبر ہو اور اس بے خبری اور جہالت کے عالم میں اس سے یہ غلطی سرزد ہو گئی ہو، لیکن اس کو سندِ فضیلت دینے والے فاضل اساتذہ کے رویے کی آخر کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے اور اسلام کے معاشرتی اور اقتصادی نظام اور اسلامی تاریخ سے ان کی بے خبری اور بے نیازی کو آخر کیا عنوان دیا جائیگا؟

لیکن دوسرے ہی لمحے جب مجھے یہ یاد آیا کہ یہ فاضل اساتذہ کون ہیں اور کیسے تیار کیے گئے ہیں تو میری ساری حیرت جاتی رہی۔ اساتذہ کی یہ کھیپ ہمارے دانشوروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتی ہے، جس کی نگاہیں غیروں کے پروپیگنڈے سے خیرہ ہیں اور ان کے دل و دماغ پر اوروں کے افکار و نظریات کا غلبہ ہے۔ یہ لوگ غیر ملکی استحصال کی پیداوار ہیں۔ مسٹر ڈنلپ (DUNLOP) کی خصوصی دلچسپیوں کا مرکز یہی لوگ تھے۔ ان لوگوں کو بظاہر تحصیل علومِ جدید کی خاطر سمندر پار بھیجا گیا تھا، لیکن دراصل یہ بھی اس سازش کا ایک حصہ تھا، جس کا مقصد جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی روایات سے بیگانہ بنانا تھا تاکہ وہ اپنے مذہب، اپنی تاریخ اور اپنے عقائد سے متنفر ہو جائیں اور اپنے

لہ مسٹر ڈنلپ وہ انگریز افسر تھا، جو برطانوی سامراج کی طرف سے مصر کی تعلیمی پالیسی کو مرتب کرنے اور چلانے پر مامور تھا۔

مغربی آقاؤں کی نقالی ہی کو باعث افتخار سمجھنے لگیں، اس لیے اگر یہ لوگ تاریخ اور حقائق کو مسخ کرنے کی اس مکروہ سازش میں برابر کے شریک نظر آئیں تو اس میں آخر حیرت کی بات ہی کیا ہے؟

جاگیرداری کی خصوصیات

اصل مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ اگر ہم جاگیرداری کا ایک واضح مفہوم اپنے ذہنوں میں متعین کرلیں اور یہ دیکھیں کہ اس کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟ اس غرض سے ہم ڈاکٹر راشد البراوی کی کتاب "النظام الاشتراکی" (نظام اشتراکیت) سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب حال ہی میں یورپ میں شائع ہوئی ہے۔ فاضل مصنف جاگیرداری نظام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جاگیرداری نظام ایک ایسا پیداواری نظام ہے جس کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مستقل طور پر ایک غلام طبقے کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت زمیندار یا اس کے کارندے پیداوار کا ایک مقررہ حصہ کسان سے وصول کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں انہیں بعض خصوصی معاشی مراعات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ زمیندار کسان سے جس قسم کی خدمت لینا چاہیے اس کے لینے کا اس کو پورا اختیار رہتا ہے۔ وہ چاہے تو کسانوں سے نقد یا جنس کی صورت میں خراج بھی لے سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاگیرداری نظام اپنے زیر سایہ افرادِ معاشرہ کو دو نمایاں طبقات میں تقسیم کر دیتا ہے: (۱) زمیندار اور جاگیردار اور (۲) کسان اور کاشت کار جن کی معاشرتی حیثیت ان کے کام اور فرائض کی نوعیت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مستقل طور پر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ کسان، مزارع اور غلام انہی معاشرتی تبدیلیوں کے مختلف نام ہیں۔ ان میں سے کچھ طبقے مٹ چکے، باقی بتدریج ختم ہو رہے ہیں۔"

بیگار اور مجبوری

"کسان زمین کو بوتے اور فصل اگاتے تھے، اس لیے انہیں زمین کی پیداوار میں سے کچھ حصّہ دے دیا جاتا تھا تاکہ اس سے وہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پال سکیں۔ اسی طرح انہیں کھیتوں میں اپنے لیے جھونپڑے بنانے کے لیے بھی زمین دی جاتی تھی۔ ان سہولتوں کے عوض وہ زمیندار کے کھیتوں میں اپنے آلاتِ زراعت اور مویشیوں کے ساتھ جا کر ہل چلاتے تھے۔ فصل کی کاشت اور کٹائی کے مواقع پر وہ زمیندار کے بے مزد خادم ہوتے تھے۔ نیز گاہے گاہے اس کے حضور حسبِ استطاعت تحفے تحائف پیش کرتے تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ان کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ اپنا غلّہ زمیندار کی چکیوں میں پسوائیں اور انگوروں سے رس نکالنا ہو، تو صرف اسی کی مشینوں پر جا کر نکلوائیں۔"

جاگیرداروں کے عدالتی اور انتظامی اختیارات

"جاگیرداری نظام میں زمیندار کو اپنی جاگیر میں رہنے والے کسانوں پر مکمل انتظامی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ اس نظام میں کسانوں کو جو اصل پیداواری عنصر ہوتے تھے، ان معنوں میں کوئی آزادی حاصل نہیں تھی، جن معنوں میں ہم آج کل یہ لفظ بولتے ہیں۔ جس زمین پر کسان کام کرتا تھا، اس پر اس کو کوئی مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے تھے۔ نہ وہ اسے بیچ سکتا تھا، نہ اس کے بعد یہ زمین اس کی اولاد کو منتقل ہو سکتی تھی اور نہ وہ یہ کسی کو ہبہ کر سکتا تھا۔ اس کا آقا (یعنی زمیندار) جب چاہتا اس سے جبری محنت اور بیگار لے سکتا تھا۔ اس کو اس سے انکار کا کوئی حق حاصل نہ تھا خواہ اس کے نتیجے میں اسے کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ برداشت کرنا پڑتا۔ یہی نہیں بلکہ اظہارِ اطاعت و وفاداری کے طور پر وہ

زمیندار کو بھاری بھاری ٹیکس ادا کرنے پر بھی مجبور تھا۔ جن کی حدود کا تعین سراسر زمیندار کی مرضی اور مصلحت پر منحصر ہوتا تھا۔ اگر زمیندار اپنی زمینیں کسی اَور زمیندار کے ہاتھ بیچ دیتا، تو ان زمینوں پر کام کرنے والے مزارعین بھی بِک جاتے تھے اور نئے زمیندار کی ملکیت قرار پاتے تھے۔ اپنا پیٹ پالنے کے لیے وہ کہیں اَور کام کرنے کے مجاز بھی نہیں تھے اور نہ اپنی مرضی سے وہ اپنے مالک کو چھوڑ کر کسی اَور زمیندار کی ملازمت اختیار کر سکتے تھے۔ جاگیرداری دَور کے کمین طبقے زمانۂ قدیم کے غلاموں اور دَورِ جدید کے مزارعین کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"کسان کو زمین دینا یا نہ دینا زمیندار کا کام تھا۔ وہی تنہا یہ فیصلہ کرنے کا بھی مجاز تھا کہ کس کسان کو کتنا رقبہ دیا جائے۔ کسانوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کا تعین بھی وہی کرتا تھا، مگر ایسے اہم معاملات کو طے کرتے وقت بھی زمیندار کو نہ تو کاشت کاروں کی ضروریات اور حقوق کا کوئی خیال ہوتا تھا، اور نہ اسے اس بات کی پروا تھی کہ اس کے فیصلوں سے اس کے ہمسایہ جاگیرداروں پر کیا اثرات پڑیں گے۔"

کسانوں کا فرار

آگے چل کر مصنف کہتا ہے: "ان عوامل نے تیرھویں صدی عیسوی میں اس عظیم غیر قانونی فرار کی تحریک کو جنم دیا، جو بالآخر زراعتی کارکنوں کے ظہور پر منتج ہوئی۔ یہ تحریک تاریخ میں کسانوں کے فرار" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ زمینداروں نے باہم سمجھوتہ کر لیا۔ جس کی رُو سے ہر زمیندار کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے بھگوڑے مزارعین کی واپسی کا مطالبہ کر کے انہیں واپس لے سکے۔ اس سمجھوتے کے مطابق جاگیرداروں

کو یہ حق بھی مل گیا کہ وہ چاہیں تو اپنی جاگیروں میں گھسنے والے تمام مزارعین کو گرفتار کرلیں لیکن یہ تدابیر بھی کسانوں کے فرار کو روکنے میں نہ صرف ناکام رہیں، بلکہ یہ لے اتنی بڑھی کہ فرار اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت بن گیا، اس لیے زمینداروں کو اپنے کھیتوں کی کاشت کے لیے مجبوراً زیادہ سے زیادہ کرائے کے مزدوروں پر تکیہ کرنا پڑا۔ زمینداروں کے باہمی سمجھوتے بے وقعت ثابت ہوئے۔ جس کا دوسرے الفاظ میں مطلب یہ تھا کہ اب ان میں پہلے کی طرح تعاون کی فضا بھی ختم ہو چکی تھی؛ چنانچہ اس کا ایک اور اہم نتیجہ یہ نکلا کہ اب کھیتوں میں دوسروں سے بیگار لینے کے بجائے زمیندار ان میں کام کرنے والوں کو ان کی اجرت نقدی کی صورت میں دینے لگے"

"اس کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا کسان مالی لحاظ سے خوشحال ہوتے گئے۔ دوسری طرف پرانے دور کے امیروں اور جاگیرداروں نے اپنی ضروریات اتنی بڑھا رکھی تھیں کہ اب ان کے تمام ذرائع و وسائل مل کر بھی انہیں پورا نہ کر سکتے تھے؛ چنانچہ کسانوں نے ان سازگار حالات سے فائدہ اٹھایا اور اپنے سابق آقاؤں کو نقدی کی صورت میں معاوضے ادا کرکے ان سے ہمیشہ کے لیے آزادی حاصل کرلی۔ تیرھویں صدی عیسوی تک جبکہ بالآخر زراعتی کارکنوں کی آزادی کو تسلیم کیا گیا، یہ صورتِ حال برقرار رہی۔ اس کے بعد صورتِ حال میں جو تبدیلی رونما ہوئی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جاگیرداری نظام کی چولیں ہل گئیں تا آنکہ بعد کی صدیوں نے اس کا مکمل خاتمہ کر دیا"[1]

یہ ہے جاگیرداری نظام کی صحیح تصویر۔ ہم نے ان تفصیلی اقتباسات کو اس لیے درج کیا ہے تاکہ قارئینِ کرام جاگیرداری نظام اور اس کی خصوصیات کو اچھی طرح جان لیں اور

---

[1] النظام الاشتراکی صـ ۲۲ تا ۲۳

محض ظاہری مشابہت کی بنا پر وہ اسے دوسرے نظام کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی غلطی سے بچ جائیں۔ سوال یہ ہے کہ اپنی ان خصوصیات اور کارناموں کے ساتھ جاگیرداری نظام تاریخ اسلام کے کس دور میں اور کہاں پایا گیا ہے؟

غلط فہمی کی بنیاد

جس ظاہری مشابہت سے اکثر لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے، اور غلط فہمی میں مبتلا ہو کر وہ موقع پرست اور ابن الوقت قسم کے لوگوں کے لیے اسلام کے خلاف بہتان تراشی کے لیے ایک بہانہ فراہم کرتے رہے ہیں، وہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ابتدائی اسلامی معاشرہ دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا: (۱) زمیندار اور (۲) کسان، جو زمینداروں کی زمینوں پر کام کرتے تھے، لیکن یہ محض ایک سطحی مشابہت ہے جس کی بنیاد پر کسی طرح بھی اسلام کے زرعی نظام کو جاگیردارانہ نظام ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

جاگیرداری نظام کی خصوصیات

اوپر جو اقتباسات دیے گئے ہیں، ان کی روشنی میں جاگیرداری نظام کی خصوصیات کو اجمالاً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱ - دائمی زرعی غلامی۔

۲ - کسان پر فرائض اور ذمہ داریوں کا ناقابلِ برداشت بوجھ۔

چنانچہ ہر کسان کا فرض تھا کہ وہ

(الف) ہفتے میں ایک پورا دن زمیندار کے کھیتوں میں بیگار دے۔

(ب) فصل کی کاشت اور کٹائی جیسے مواقع پر زمیندار کی بلامعاوضہ اور جبری خدمات انجام دے۔

(ج) مذہبی تہواروں اور ایسے ہی دوسرے خوشی کے مواقع پر اپنی غربت و تنگدستی کے باوجود اپنے ہر لحاظ سے خوشحال اور متموّل آقا (یعنی زمیندار) کو قیمتی تحائف دے۔

(د) اپنا غلّہ صرف زمینداروں کی مشینوں پر پسوائے (اس شرط کے دوسرے جزء یعنی انگوروں

سے شراب کشید کرنے کے لیے زمیندار کی مشینوں کے استعمال کی لازمی شرط کو ہم نظر انداز کرتے ہیں، کیونکہ اسلام میں شراب حرام ہے)۔

۳۔ زمیندار کے وسیع اور لامحدود اختیارات جن کی رُو سے وہ ــــــ

(ا) مختلف کسانوں کو جتنا جتنا رقبۂ زمین مناسب سمجھتا تھا اپنی صوابدید سے دیتا تھا۔

(ب) ان فرائض اور ذمہ داریوں کا تعین کرتا تھا، جو کسانوں کو انجام دینا ہوتی تھیں۔

(ج) ان ٹیکسوں کا تقرر کرتا تھا، جو کسانوں کے لیے اسے ادا کرنا لازمی تھے۔

۴۔ زمینداروں کے وہ لامحدود انتظامی اور عدالتی اختیارات جنہیں وہ کسی ملکی قانون کے مطابق نہیں، بلکہ جیسے چاہتا تھا استعمال کرتا تھا۔ اور اس سلسلے میں اس پر کوئی قانونی گرفت نہیں کی جا سکتی تھی۔

۵۔ جاگیرداری نظام کے دورِ انحطاط میں کسانوں کے لیے یہ لازمی شرط کہ اگر وہ آزادی حاصل کرنا چاہیں تو اس کے لیے پہلے لازماً ایک مخصوص رقم زمیندار کو ادا کریں۔

جاگیرداری نظام کی ان خصوصیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام کا ان سے کوئی دُور کا بھی واسطہ ہے؟ اسلامی تاریخ کے کسی دَور میں بھی ان کا وجود نہیں تھا۔

اسلام اور زرعی غلامی[1]

اسلام زرعی غلامی کو قطعاً برداشت نہیں کرتا۔ وہ غلامی کی اُس ایک صورت کے سوا جس کی تاریخ اسلام میں موجودگی اور اسباب و واقعات پر ہم گزشتہ باب میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں، اس کی کسی اور صورت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس کی رو سے زرعی غلامی کا جو مزارعین کو ایک مخصوص رقبۂ زمین کے ساتھ باندھ دیتی ہے، قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ غلاموں کی صرف ایک قسم سے آشنا ہے، جو مختلف جنگوں میں گرفتار ہو کر آنے والے جنگی قیدیوں پر مشتمل تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدائی اسلامی معاشرے میں غلاموں کی

---

[1] زرعی غلامی = SERFDOM

مجموعی تعداد آزاد شہریوں سے بہت کم تھی۔ یہ غلام اپنے مالکوں کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یا تو ان کے مالک اپنی مرضی سے انہیں آزاد کر دیتے تھے۔ یا پھر وہ خود ان سے مکاتبت یعنی لکھا پڑھی کا مطالبہ کر کے اپنی آزادی حاصل کر لیتے تھے۔ مغرب کے جاگیرداری نظام کی تاریخ میں غلاموں کی آزادی کے اس طرح کے کسی طریقے کا سراغ نہیں ملتا، کیونکہ اس نظام کا یہ منشا تھا ہی نہیں کہ کسانوں اور زراعتی کارکنوں کو آزادی کے جذبے سے سرشار کیا جائے۔ اس کے برعکس اس کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ ان کی غلامی کو دوام کی صورت دے دی جائے تاکہ اگر کسان اور زراعت پیشہ طبقے کبھی آزاد بھی ہونا چاہیں، تو آزاد نہ ہو سکیں۔ مغرب میں کسان کو زرعی غلام سمجھا جاتا تھا، جسے زمین کی طرح بیچا اور خریدا جا سکتا تھا؛ چنانچہ اگر زمیندار زمین کا کوئی ٹکڑا فروخت کرتا تھا، تو اس پر کام کرنے والے تمام کسان بھی بک جاتے تھے اور زمین کے نئے مالک کی ملکیت بن جاتے تھے یہ "زرعی غلام" زمین کے جس ٹکڑے پر کام کرتے تھے اس کو چھوڑ کر نہ تو وہ کہیں اور جا سکتے تھے اور نہ زمیندار کی خدمت اور چاکری ہی سے انہیں انکار یا سرتابی کا کوئی حق تھا۔

اسلام اس قسم کی زرعی غلامی کے تصور سے قطعاً ناآشنا ہے۔ سوائے ایک خدا کی غلامی کے، جو موت و حیات کا خالق ہے، وہ غلامی اور اطاعت کی باقی تمام صورتوں کی نفی کرتا ہے۔ ان کا شدید مخالف ہے۔ اس کے نزدیک کسی مخلوق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے جیسی کسی دوسری مخلوق کو اپنا غلام بنا لے، کیونکہ ایسا ہونا غیر فطری ہے۔ اور اس کا باعث ہمیشہ کچھ غیر اسلامی عناصر ہوتے ہیں۔ اسلام اس کو محض ایک عارضی اور عبوری نوعیت کی صورت سمجھتا ہے، جسے وہ باقی نہیں رکھنا چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے تمام ذرائع و وسائل کو کام میں لا کر اس کا کلیتہً خاتمہ کر دے؛ چنانچہ وہ ایک طرف غلاموں میں یہ جذبہ اور حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مطالبہ کریں اور دوسری طرف مملکت پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ بندِ غلامی سے رہائی کے خواہشمند غلاموں کی ہر طرح سے مدد اور اعانت کرے۔

معاشی زندگی کے دائرے میں بھی اسلام انسان کی، اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی

غلامی کو پسند نہیں کرتا۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت اس نے بخوشی نہیں بلکہ مجبوراً دی تھی۔ کیونکہ اس وقت اس مسئلے کا کوئی اور موزوں تر حل موجود نہیں تھا جب یہ حل مل گیا اور غلاموں کے اندر روحانی اور ذہنی لحاظ سے آزاد معاشرے کے آزاد شہریوں کا سلیقہ پیدا ہو گیا تو اسلام نے انہیں آزاد کر دیا۔

اسلام کے معاشی نظام کی بنیادیں

اسلام کے معاشی ڈھانچے کی بنیادیں آزادیٔ عمل، کامل تعاون واشتراک اور ایک دوسرے کی خدمت کے جذبے پر رکھی گئی ہیں؛ چنانچہ اسلامی حکومت اپنے دائرے میں ان تمام معذور افراد کے حقوق اور مفادات کی محافظ اور نگہبان ہوتی ہے، جو معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور معقول زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم ہوتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں کوئی فرد زمیندار ولے کا غلام بن کر رہنے پر مجبور نہیں ہوتا، کیونکہ حکومت اپنے تمام ذرائع و وسائل کے ساتھ اس کی پشتیبان ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت اپنے ہر شہری کو بنیادی ضروریات حیات فراہم کرتی ہے، مگر اس کے بدلے میں وہ نہ تو اسے ذلیل کرتی ہے اور نہ اس کی آزادی، عزتِ نفس اور خودداری پر ڈاکہ ڈالتی ہے۔

اپنی روح اور معاشی نظام دونوں کے اعتبار سے اسلام جاگیرداری نظام کی عین ضد واقع ہوا ہے اور اس نے ایک ایسے دور میں آکر انسانیت کو جاگیرداری نظام کی لوٹ کھسوٹ سے نجات دلائی تھی جب کہ وہ ابھی زرعی غلامی (SERFDOM) کے چنگل میں بھی نہیں پھنسی تھی۔

عہدِ اسلامی میں کسان

جاگیرداری نظام میں کسان پر فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک کمر توڑ بار ہوتا تھا، مگر اسلامی تاریخ میں ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ملتا۔ عہدِ اسلامی میں اگر کوئی کسان خطاوار ثابت ہو جاتا تھا تو اسلام کی رُو سے زمیندار کو یہ حق تو حاصل تھا کہ وہ چاہے تو اپنی زمین اس

سے لے کر کسی اور کسان کے سپرد کر دے، مگر اسے کسان کو کسی طرح کے ظلم وستم یا جور و تعدی کا نشانہ بنانے کا کوئی اختیار نہ تھا، کیونکہ اسلام زمیندار اور اس کے مزارعین کے مابین تعلقات کو آقائی اور غلامی کی اساس پر نہیں، بلکہ آزادی اور مساوات کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔

زمیندار اور کسان کے باہمی تعلق کی صورتیں

اسلام کی نگاہ میں کسان اور زمیندار کے مابین جائز قانونی تعلق کی دو صورتیں ممکن ہیں:

(۱) معاہدۂ باہمی (۲) مزارعت۔ معاہدۂ باہمی کی صورت میں کسان زمین کی کل پیداوار میں سے ایک طے شدہ حصہ زمیندار کو بطورِ زمین کے کرائے کے دینے کا پابند ہوتا ہے۔ اس سے جو پیداوار بچ رہتی ہے، وہ اس کی ملکیت بن جاتی ہے اور اس سے وہ اپنی اور اپنے کنبے کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ یوں اسلامی نظام میں نہ صرف کسان کی آزادی ہر طرح سے محفوظ رہتی تھی، بلکہ وہ زمین اور اس کی کاشت کے سلسلے میں جو طریقہ مناسب سمجھتا اسے بھی اختیار کر سکتا تھا۔

مزارعت

اسی طرح مزارعت کی صورت میں وہ زمین کی پیداوار میں زمیندار کے ساتھ برابر کا شریک ہوتا تھا، مگر زمین کی کاشت وغیرہ پر جو اخراجات اٹھتے تھے، وہ تنہا زمیندار کو برداشت کرنے ہوتے تھے۔ کسان کا کام صرف زمین کو آباد کرنا اور اس کی کاشت اور دیکھ بھال کرنے تک ہی محدود تھا۔

اسلامی نظامِ زراعت کی خصوصیات

معاملے کی ان دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی نہ جبری بیگار کی کوئی گنجائش ہے کہ زمیندار دھونس جما کر کسان سے بے مزد خدمت لیتا رہے اور نہ اس بات کا کوئی خدشہ ہے کہ زمیندار آمرانہ اختیارات اور مراعات حاصل کر کے کسانوں کو فرائض اور پابندیوں کے ایک ایسے ضابطے میں جکڑ دے، جو حقوق اور مراعات سے یکسر خالی ہو، کیونکہ اسلام زمیندار اور کسان

کے تعلقات کی نیو یکساں آزادی، یکساں فرائض اور مراعات اور "کچھ لو اور کچھ دو" کے مساوی اصول پر اُٹھاتا ہے۔

آزادیٔ انتخابِ زمین

اسلامی نظام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسان کو اس بات کی پوری پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ زمین کا جو ٹکڑا چاہے کاشت کے لیے بطورِ خود کرایہ پر لے سکے۔ اسی طرح وہ جس زمیندار کی مزارعت اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے، اور جب چاہے اسے چھوڑ سکتا ہے۔

معاہدے میں مساوات

اس نظام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ زمیندار سے زمین کے بارے میں معاہدہ کرتے وقت اسے زمیندار کے مقابلے میں مساوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ دب کر یا ڈر کر معاملہ کرنے پر مجبور نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اسلامی معاشرے کا ایک آزاد فرد ہوتا ہے اور اس کو اس بات کا پورا حق پہنچتا ہے کہ اگر وہ معاہدے کو اپنے لیے مفید نہ پائے، تو اس کو فسخ کر دے۔ زمیندار اس پر کوئی معاہدہ زبردستی نہیں ٹھونس سکتا اور نہ اس سے انکار کی صورت میں اسے کسی طرح کی انتقامی کارروائی کا نشانہ ہی بنا سکتا ہے۔ مزارع کی حیثیت سے بھی کسان کو زمیندار کے مقابلے میں برابر کے قانونی تحفظات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ برابر کے شریک ہوتے ہیں؛ چنانچہ زمین سے جو پیداوار ہوتی ہے اسے وہ آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔

ناجائز استحصال کے بجائے اعانت و دستگیری

ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ مغرب کے جاگیرداری نظام میں مذہبی اور دوسرے تہواروں کے مواقع پر غریب کسان خوش حال متموّل زمینداروں کو تحفے تحائف دینے پر مجبور تھا، مگر اسلامی نظام میں اس کے بالکل اُلٹ صورتِ حال ملتی ہے۔ یہاں پر غریب کسان زمینداروں کو تحفے دیتا

نہیں تھا، ان سے تحفے تحائف وصول کرتا تھا۔ عہدِ اسلامی میں خوشحال زمیندار عید اور خوشی کی دوسری تقریبات، بالخصوص رمضان المبارک کے مقدس اور مبارک مہینے میں اپنے غریب کسان بھائیوں کی خدمت میں تحفے تحائف بھیجتے تھے۔ ان کی دعوتیں کرتے اور معاشرے کے تمام ضرورت مندوں اور محتاجوں کی اعانت کرتے تھے۔ بالفاظِ دیگر اسلامی نظام میں خوشحال اور مالدار لوگ غریب کسانوں کو مہذب یورپ کی طرح ان سے تحفے تحائف قبول کرنے کے بہانے لوٹنے کے بجائے اپنے مال و دولت کو ان کی فلاح و بہبود پر بے دریغ صرف کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں مغربی جاگیرداری نظام کی طرح کسانوں سے جبری بیگار لینے اور انہیں غیر ضروری فرائض اور ذمہ داریوں کے طوق و سلاسل میں جکڑنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

کسانوں کا ظلم و زیادتی سے تحفظ

رہ گئے یورپی نظامِ جاگیرداری میں زمینداروں کے وہ فرائض جو کسانوں کو ناجائز طور پر اپنا غلام بنائے رکھنے اور ان سے جبری بیگار لینے کے عوض وہ انہیں دوسروں کی زیادتیوں اور دست درازیوں سے بچانے کی صورت میں انجام دیتے تھے، تو واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نظام میں اس لحاظ سے بھی کوئی خلا نہیں پایا گیا، کیونکہ مسلمان امراء بعینہٖ یہی فرائض رضاکارانہ طور پر انجام دیتے تھے۔ اور ان کے عوض وہ کسانوں سے کسی صلے یا معاوضے کے طالب نہ ہوتے تھے۔ ان کے عمل کا محرک محض رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ تھا اور دراصل یہی وہ چیز ہے جو ایک اعلیٰ اور پاکیزہ عقیدے کی اساس پر استوار ہونے والے نظامِ زندگی کو باقی نظام ہائے حیات سے ممتاز کرتی ہے۔ ایک قسم کے نظام میں آدمی اپنے ابنائے نوع کے ساتھ نیکی اور بھلائی عبادت سمجھ کر کرتا ہے۔ اور اس طرح قربِ الٰہی کے حصول کا طالب ہوتا ہے، جبکہ دوسری قسم کے نظامِ حیات میں اپنے بھائیوں سے نیکی اور بھلائی بھی ایک طرح کا تجارتی کاروبار بن جاتی ہے جس میں شریک مختلف لوگوں میں سے ہر ایک کی خواہش اور کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ منافع کا زیادہ سے زیادہ حصہ خود لے اُڑے اور

دوسروں کو بس اتنا اور وہی کچھ دے جو ناگزیر ہو اور جس کے دیئے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، چنانچہ سود و زیاں کی اس دوڑ میں اصل فیصلہ کن چیز مادی وسائل ہوتے ہیں جس کے پاس یہ زیادہ ہوتے ہیں، وہ بازی لے جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ زندگی کے سارے فائدے صرف اپنی ذات کے لیے مخصوص کر لے۔

زمین لینے کی آزادی

جاگیردارانہ نظام کی تیسری خصوصیت یعنی زمیندار کا یہ حق اور اختیار کہ وہ جسے چاہے اور جتنی چاہے اپنی زمین کاشت کے لیے دے اور پھر اپنی مرضی سے ان مزارعین کے لیے فرائض اور بیگار کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کر کے ان کے سر تھوپ دے، سراسر یورپی تصورِ آقائی اور زرعی غلامی کی پیداوار ہے۔ اسلام اس سے کلیتہً نا آشنا ہے کیونکہ وہ سرے سے زرعی غلامی ہی کو تسلیم نہیں کرتا۔

اسلام کے نزدیک پٹے پر زمین لینے کی صورت میں کسان کے اختیارات اور حقوق کو جو چیز محدود کرتی ہے وہ اس کی اپنی مرضی ہوتی ہے یا اس کی مالی حالت۔ زمیندار کو کسان کے مقابلے میں کوئی ترجیحی مراعات حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ صرف یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ پٹہ لیتے وقت کسان نے اس کو جتنی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ رقم اس کو برابر ملتی رہے۔

اسی طرح مزارعت کی صورت میں کوئی کسان کتنی زمین لینے کا حق دار ہے؟ اسلامی نظام میں اس کا انحصار بھی محض زمیندار کی صوابدید پر نہیں ہوتا تھا، بلکہ خود کسان کی اپنی مرضی پر تھا۔ اگر خاندان کے دوسرے افراد بالخصوص بیٹے زمین کی آبادی اور کاشت کے سلسلے میں اس کی مدد کے لیے موجود ہوتے، اور وہ یہ محسوس کرتا کہ وہ زیادہ رقبۂ زمین سنبھال سکتا ہے، تو اس کے حصول کی راہ میں بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ مزارعہ ہونے کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں صرف اس رقبۂ زمین تک محدود ہوتی تھیں، جو اس کے زیرِ کاشت ہوتا تھا۔ اور اس وقت تک اس کی اور زمیندار کی مشترکہ ملکیت سمجھا جاتا تھا جب تک اس سے پیداوار حاصل نہ ہو جائے۔ جہاں تک زمیندار کی باقی زمینوں اور جاگیرداروں کا

تعلق ہے وہ بحیثیت مزارع کے کسان کی ذمہ داری میں شامل نہیں ہوتی تھیں اور نہ وہ یورپی مزارعین کی طرح وہاں جا کر ان میں کاشت کرنے یا کوئی اور خدمات انجام دینے کا پابند تھا۔

زمینداروں کی خدائی کا خاتمہ

اسلام اور جاگیرداری نظام میں امتیاز و اختلاف کا سب سے نمایاں پہلو جاگیرداروں کے وہ انتظامی اور عدالتی اختیارات ہیں، جو جاگیرداری دور میں انہیں کسانوں پر حاصل تھے۔ اپنی جاگیروں کی حدود میں سماجی اور سیاسی زندگی کے تمام معاملات میں انہیں بلند ترین مقام حاصل تھا۔ اور وہ سیاہ و سفید کے مالک تھے، مگر اسلام نے آکر جاگیرداروں کی خداوندی کے اس بت کو پاش پاش کر دیا، کیونکہ وہ اس قسم کی ترجیحی مراعات کا شدید دشمن ہے اور وہ انسانی زندگی کو ان کی آلائشوں سے پاک و صاف رکھنا چاہتا ہے۔

یورپ کا قانونی نظام اور جاگیرداری

اہلِ یورپ کسی ایسے نظام قانون سے بھی محروم تھے جس کی روشنی میں وہ زمیندار اور کسان کے باہمی تعلقات کو منظم کر سکتے۔ رومی قانون نے جو بعد میں تمام مغربی قانون سازی کی اساس بنا، جاگیرداروں کو اتنے وسیع اور لامحدود اختیارات دے رکھے تھے کہ بالآخر وہ اپنی جاگیروں اور علاقوں میں مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھے تھے، جو اپنی رعایا کے لیے نہ صرف قانون بناتے تھے، بلکہ انہیں جیسے چاہتے تھے نافذ بھی کرتے تھے۔ یہ جاگیردار بیک وقت قانون ساز بھی تھے اور انتظامی اور عدالتی سربراہ بھی —— اس طرح ایک لحاظ سے انہوں نے ریاست در ریاست قائم کر رکھی تھی۔ جہاں تک ملکی حکومت کا تعلق تھا، وہ اس وقت تک ان سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں کرتی تھی جب تک وہ حکومت کی ضروریات کے مطابق اپنی تمام فوجی اور مالی ذمہ داریاں نبھاتے رہتے تھے۔

قانون کی حکومت

اسلام اس طرزِ زندگی سے بالکل ناآشنا ہے۔ اسلامی نظام میں ایک ہی مرکزی حکومت ہوتی ہے، جو قانونِ ملکی یعنی شریعتِ اسلامی کو اپنے شہریوں کی زندگیوں میں جاری وساری کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کی نگاہ میں سب شہری یکساں طور پر احترام اور عزت کے مستحق ہوتے ہیں اور کسی شہری کو سزا صرف اسی صورت میں دی جاسکتی ہے، جب کہ اس کا جرم واقعی ثابت ہو جائے۔ بعد میں جب حکومت اسلامی اصولوں سے منحرف ہو کر موروثی بادشاہت کے قالب میں ڈھلی، تو اس وقت بھی اس میں اسلامی حکومت کی بعض صفات موجود تھیں مثلاً وہ اپنے دائرۂ اختیار میں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے ضروریات فراہم کرتی تھی، اور ان کے مفادات کی نگرانی کرتی تھی۔ اسلامی سلطنت کی وسیع و عریض عملداری میں ایک ہی ملکی قانون رائج تھا؛ چنانچہ یہی قانون کی حکومت تھی جس نے کسانوں کو جاگیرداروں کے ظلم و استبداد، لوٹ کھسوٹ اور ان کی خواہشات اور توہمات کا تختۂ مشق بننے سے بچائے رکھا، کیونکہ ان پر جاگیرداروں اور زمینداروں کی نہیں، بلکہ خدائی قانون کی حکومت تھی جس کی نگاہ میں آزاد انسان ہونے کی حیثیت سے نہ صرف زمیندار اور مزارعین آپس میں برابر تھے، بلکہ تمام انسان مساوی اور ایک جیسے سلوک کے مستحق تھے۔

بلاشبہ مسلمانوں کی تاریخ میں اِکا دُکا ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں بعض مسلمان ججوں نے حق و انصاف کے بجائے اربابِ اقتدار کا ساتھ دیا اور جان بوجھ کر ایسے عدالتی احکام صادر کیے جن سے حکام اور جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ مقصود تھا، لیکن اوّل تو ایسی مثالیں اسلامی تاریخِ انصاف میں بہت تھوڑی ہیں اور جیسا کہ خود بعض علمائے یورپ کی تحریریں گواہ ہیں، ان کی حیثیت استثنائی واقعات سے زیادہ نہیں۔ ثانیاً ان گنی چنی مثالوں کے مقابلے میں اسلامی تاریخ ایسی بے شمار روشن مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں قاضیوں نے نہ صرف زمینداروں، بلکہ گورنروں اور وزراء کے خلاف بلکہ خود بھی مقتدر خلیفۂ وقت کے خلاف اور غریبوں اور مزدوروں کے حق میں فیصلے دیے، مگر اس کے باوجود نہ تو کسی

قاضی کو اس کے عہدے سے برطرف کیا گیا اور نہ کسی حاکم نے اس کے خلاف کسی طرح کی کوئی انتقامی کارروائی کی۔

نقل و حرکت کی مکمل آزادی

اسلامی تاریخ میں یورپی کسانوں کے "فرار" کی طرح کی کسی تحریک کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی نظام میں کسانوں کو نہ صرف ایک جاگیر سے دوسری جاگیر، بلکہ مملکت اسلامی کی وسیع و عریض حدود کے اندر ہر کہیں بلا روک ٹوک آنے جانے کی پوری آزادی تھی۔ نقل مکانی کرنے میں کوئی قوت ان کی راہ میں حائل نہیں تھی، البتہ اگر مصری کسانوں کی طرح وہ خود ہی کسی خاص مقام یا جگہ کو نہ چھوڑنا چاہتے تو دوسری بات تھی۔ مصر کو چھوڑ کر اسلامی دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں کے کسانوں نے نقل و حرکت کی اس آزادی سے بھرپور فائدہ اٹھایا کیونکہ وہ نہ تو مصری کسانوں کی طرح کسی خاص خطۂ زمین کی محبت میں گرفتار تھے اور نہ ان کی راہ میں یورپی کسانوں کی طرح کوئی قانونی اور معاشرتی پابندیاں ہی حائل تھیں۔

آزادی کا پیدائشی حق

یورپی نظام جاگیرداری کی تاریخ کے دورِ آخر میں کسانوں کو اپنی آزادی قیمت دیکر خریدنی پڑی، مگر مسلمانوں کی تاریخ میں اس طرح کی کوئی نظیر بھی نہیں ملتی۔ اس کی وجہ سیدھی سادی سی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی تاریخ میں کسانوں کو کبھی زرعی غلام نہیں سمجھا گیا وہ آزاد پیدا ہوئے تھے اور معاشرے میں انہیں بھی ویسے ہی حقوق حاصل تھے۔ جیسے کسی دوسرے طبقے کے افراد کو؛ چنانچہ انہیں یورپی کسانوں کی طرح اس بات کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی کہ قیمت دے کر اپنی آزادی خریدیں۔

مسلمان جاگیرداروں کا فلاحی کردار

ایک اور بات جو جاگیرداری پر گفتگو کرتے وقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے' یہ

ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اسلامی دُنیا میں بہت سی چھوٹی اور بڑی جاگیریں ہمیشہ پائی جاتی رہی ہیں جن کی آمدنی سے جاگیردار نہ صرف اپنی ضروریاتِ حیات پُوری کرتے تھے، بلکہ بری اور بحری تجارت اور بہت سی صنعتوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ گویا ان کا وجود معاشرے کی فلاح و بہبود کا باعث تھا، مگر اس کے برعکس یورپ میں جب جاگیرداری نظام کا ظہور ہُوا، تو اس کا سیلاب ان صنعتوں اور تجارتوں کو بھی بہا لے گیا، جو پہلے سے وہاں پائی جاتی تھیں۔ اس کے بعد یورپ پر روحانی انحطاط اور علمی جمود کی ایک طویل سیاہ رات چھاگئی اور بالآخر اسلام نے آکر اسے اس تاریکی اور جہالت سے باہر نکالا اور علم کی روشنی سے منور کیا۔ اس کا ایک موقعہ تو صلیبی جنگوں نے فراہم کیا جب کہ پہلی بار یورپ دُنیائے اسلام کے قریب آیا۔ دوسرا موقعہ وہ تھا جب سرزمینِ اسپین میں دوبارہ ان دونوں کا آمنا سامنا ہُوا۔ یورپ اور اسلام کے اس ربط سے تحریکِ احیائے علوم نے جنم لیا جس کی بدولت یورپ آہستہ آہستہ صدیوں کے مذہبی اور علمی جمود سے آزاد ہُوا۔

ممالکِ اسلامیہ میں جاگیرداری

الغرض جب تک دُنیائے اسلام میں اسلام ایک غالب قوت کی حیثیت سے کارفرما رہا اس وقت تک کسی مسلم ملک میں جاگیرداری نظام قائم نہیں ہو سکا، کیونکہ اپنے روحانی اور اقتصادی نیز بنیادی عقیدے، اصولوں اور نظریات میں اسلام اور جاگیری دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور جب بھی اسلام کو موقع ملتا ہے وہ ان تمام اسباب و حالات کا سدِّباب کرتا ہے، جو جاگیرداری نظام کے فروغ اور قیام کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے عہدِ حکومت میں جس قسم کا جاگیرداری نظام ملتا ہے، اس کا دائرۂ اثر بہت محدود تھا۔ اس کو کبھی اتنا فروغ یا قبولِ عام حاصل نہیں ہُوا کہ یہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کا مستقل جزء بن جاتا۔

دُنیائے اسلام پر مغربی تہذیب کی یلغار

سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے آخری دَور میں البتہ اسلامی دُنیا پر جاگیرداری نظام کی پرچھائیں پڑتی نظر آتی ہے۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا جب مُسلم عوام کے دِلوں میں عقائدِ اسلامی کمزور پڑ چکے تھے اور ان کے اجتماعی معاملات کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی جو صرف نام کے مُسلمان تھے۔ عین اسی دَور میں جب مغرب کی خدا ناآشنا، مادہ پرست اور جارح تہذیب فاتحانہ شان کے ساتھ دُنیائے اسلام میں دَر آئی، تو صورتِ حال اَور بھی ابتر ہو گئی۔ اس نئی تہذیب نے مسلم ممالک میں فوجی انقلابات برپا کیے۔ ان کی تمام رُوحانی اور اخلاقی اقدار کو پامال کیا، تعاون و اشتراک کے جذبے کو سَرد کر دیا اور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ لُوٹ کھسوٹ کی انتہائی مکروہ صورتوں کو اسلامی ملکوں میں فروغ دیا، جس کے نتیجے میں یہاں کے غریب طبقے ایک ایسی شقاوت اور محرومی میں مبتلا ہو گئے جس کا سلسلہ اب تک ختم ہونے میں نہیں آرہا۔ یہ جاگیرداری نظام جو دراصل یورپ سے درآمد کیا گیا تھا بعض مُسلم ممالک میں اب بھی اپنی ان تمام خصوصیات کے ساتھ موجود ہے، جو اس کے ماخذ یعنی یورپی جاگیرداری نظام کے امتیازی اوصاف گردانے جاتے ہیں۔ موجودہ اسلامی دُنیا میں اس کی موجودگی کے سلسلے میں اسلام پر قطعاً کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، کیونکہ نہ تو وہ اس کی پیدائش کا ذمہ دار ہے اور نہ اس کی بقا اور افزائش میں اس کا کوئی ہاتھ ہے۔ اسلام پر اس کی ذمہ داری صرف اس صورت میں عائد ہو سکتی تھی۔ جبکہ ان مُسلم ممالک میں واقعی اس کی حکومت ہوتی اور اس کو ان کے قانونِ مُلکی کی حیثیت حاصل ہوتی، کیونکہ اس وقت جو مسلم حکمران ان ممالک پر مسلط ہیں، وہ اپنا کاروبارِ حکومت اسلام کے مطابق نہیں چلا رہے، بلکہ ان دساتیر اور قوانین کے تحت دادِ حکمرانی دے رہے ہیں، جو انہوں نے مختلف یورپی اقوام سے مستعار لیے ہیں۔

بحث کے بعض اہم نکات

اس بحث سے بہت سے ایسے حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آگئے ہیں جو جدید

دُنیا کی ساری نظریاتی کشمکش کا محور اور مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل بالخصوص قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ جاگیرداری نظام کے فروغ میں تنہا ذاتی ملکیت ہی مؤثر عامل نہیں ہے کہ اس کے مقابلے میں باقی انسانی کوششوں کی سرے سے کوئی وقعت ہی نہ ہو۔ نہیں، بلکہ جاگیرداری نظام معاشرے میں پائے جانے والے نظامِ ملکیت اور زمینداروں اور زمین سے محرومین کے باہمی تعلقات کی نوعیت کی کوکھ سے اُبھرتا اور فروغ پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ اسلامی میں ذاتی ملکیت کی موجودگی کے باوجود کبھی جاگیرداری نظام کو اُبھرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملا۔ اسلام محض ایک نظریۂ حیات ہی نہیں ہے، بلکہ عملی زندگی کے مختلف گوشوں میں اس کے انطباق کا نام بھی ہے؛ چنانچہ وہ افرادِ معاشرہ کو باہم ایسے رشتوں میں جوڑ دیتا ہے کہ جن کی موجودگی میں جاگیرداری نظام کبھی سر اُٹھا ہی نہیں سکتا۔

۲۔ اگر یورپ جاگیرداری نظام کی لعنت میں گرفتار رہا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ یہ انسانی ارتقاء کی راہ میں کوئی ناگزیر مرحلہ ہے، جس میں سے گزرنے کے سوا بنی نوعِ انسان کے لیے اور کوئی چارۂ کار ہی نہ ہو۔ یورپ کے اس لعنت میں مبتلا ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ کسی ایسے عقیدے اور نظامِ زیست سے یکسر محروم تھا، جس سے اس کو انسانی تعلقات و روابط کی استواری کے سلسلے میں کوئی ٹھوس رہنمائی مل سکتی۔ دُنیائے اسلام کو یہ نعمت حاصل تھی؛ چنانچہ وہ اس لعنت سے بچی رہی۔ اگر یورپ کے پاس اس طرح کا کوئی نظام موجود ہوتا تو وہاں جاگیرداری کو کبھی پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملتا۔

۳۔ اقتصادی ارتقاء کے مختلف مراحل یعنی ابتدائی اشتراکی معاشرہ، غلامی، جاگیرداری، سرمایہ داری اور اشتراکیتِ ثانیہ جو اشتراکیوں کے جدلی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) کے فلسفے کی رو سے انسانی تاریخ کے ناگزیر اجزاء ہیں، دراصل یورپی تاریخ کے صفحات سے باہر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے اور نہ ان میں کوئی حقیقت ہے۔ یورپ سے باہر دُنیا کی کسی قوم کو ان مراحل سے سابقہ پیش نہیں آیا۔ یہی حال دُنیائے اسلام کا ہے۔ اس کی تاریخ میں کبھی جاگیرداری کا دَور نہیں آیا، نہ اشتراکیت کا مرحلہ پیش آیا ہے اور نہ آئندہ کبھی ایسا کوئی مرحلہ پیش آنے کا امکان ہے۔

اسلام اور سرمایہ داری

سرمایہ داری نظام اسلامی دُنیا کی نہیں، یورپ کی پیداوار ہے۔ یہ مشین کی آمد کا نتیجہ تھا جو اتفاق سے یورپ میں ایجاد ہوئی اور وہیں سے دُنیا کے باقی حصّوں میں پھیلی۔

کیا اسلام سرمایہ داری کا حامی ہے؟

دُنیائے اسلام جب سرمایہ داری سے روشناس ہوئی، تو اس وقت تک سرمایہ داری پر یورپ کا مخصوص رنگ پوری طرح چڑھ چکا تھا۔ دوسری طرف اسلامی دُنیا پر ادبار اور زوال کا غلبہ تھا اور اس میں ہر طرف جہالت، غربت اور پسماندگی کے آثار نمایاں تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی درآمد سے اسلامی دُنیا میں کچھ مادی ترقی بھی ہوئی جس نے بعض لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ اسلام سرمایہ داری کا حامی ہے اور اس کی موجودہ صورت میں اس کی تمام خرابیوں سمیت اپنا لینے میں وہ کوئی حرج نہیں سمجھتا، کیونکہ سرمایہ داری اسلام کے کسی بنیادی اصول اور قانون سے متصادم نہیں ہے، بلکہ اسلام میں افراد کو ذاتی ملکیت کا جو حق حاصل ہے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلام سرمایہ داری کے خلاف نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ اسلام پر بہت بڑا بہتان ہے۔ اس کے جواب میں ہم سرمایہ داری کے ان حامیوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام سُودی کاروبار اور اجارہ داری کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، مگر اسلام ان دونوں کے خلاف ہے اور اس نے آج سے ہزاروں برس پیشتر ان کی حرمت اور ممانعت کا صاف صاف اعلان بھی کر دیا تھا۔ صرف یہی بات اسلام اور سرمایہ داری کے گہرے اصولی اور بنیادی اختلاف کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔

اگر اسلامی ممالک میں مشین ایجاد ہوتی

بہرحال آئیے ذرا تفصیل سے اس مسئلے کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ اگر مشین اسلامی دُنیا میں ایجاد ہوتی تو اس کے نتیجے میں جو اقتصادی ترقی اور خوشحالی ہوتی اس کے بارے میں اسلام کا رویہ کیا ہوتا۔ اور محنت اور پیداوار کی تنظیم کی غرض سے کس قسم کے قوانین اور ضابطے وجود میں آتے؟

سرمایہ داری کا ابتدائی دَور

ماہرینِ معاشیات کے درمیان اس بات پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کارل مارکس جیسے سرمایہ داری کے شدید دشمن بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی دَور میں سرمایہ دارانہ نظام سے انسانیت کو بڑا فائدہ پہنچا اور دُنیا اس کی بدولت ترقی کی نئی منزلوں سے آشنا ہُوئی۔ مادی پیداوار میں اضافہ ہُوا، وسائل نقل و حمل بہتر ہوئے اور وسیع پیمانے پر قومی وسائل کا استعمال عام ہُوا اور مزدوروں کا معیارِ زندگی پہلے سے جب کہ ان کا تمام تر دارومدار زراعت پر تھا، کہیں زیادہ بلند ہو گیا۔

خرابیوں کا آغاز

مگر سرمایہ داری کا یہ دَور جلد ہی ختم ہو گیا، کیونکہ اس کے فطری ارتقاء کے نتیجے میں دولت بتدریج سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آ گئی اور غریب اور مزدور اپنی جائیداد اور دولت غرض سب کچھ سے محروم ہو گئے۔ اس سے سرمایہ داروں کو مزدور حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ جن کی محنت کے طفیل ان کی دولت اور تجارت میں بے پناہ اضافہ ہُوا۔ اس کے باوجود انہوں نے مزدور، جو اشتراکیوں کے نزدیک مادی پیداوار میں اضافہ کے اصل ذمہ دار ہوتے ہیں، ان کی اُجرتوں میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ ان کی اجرتیں اب بھی اتنی کم تھیں کہ ان کے لیے

معقول زندگی گزارنا ممکن ہی نہ تھا۔ ان کی محنت سے جو نفع حاصل ہوتا تھا۔ وہ ان کے سرمایہ دار آقا ہتھیا لیتے اور اپنی عیاشیوں اور بدمستیوں میں اڑا دیتے تھے۔

سرمایہ داری کے مہلک نتائج

مزدوروں کے ان قلیل معاوضوں کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ سرمایہ دار ممالک کے باشندوں کی قوتِ خرید گھٹ گئی اور ان کا تیار کردہ ڈھیروں سامان یونہی پڑا رہنے لگا۔ چنانچہ سرمایہ داروں کو اپنا مال فروخت کرنے کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش ہوئی۔ اس تلاش نے نوآبادیاتی نظام نیز منڈیوں اور خام مال کے بارے میں بین الاقوامی رقابت کو جنم دیا اور بالآخر معاملہ اپنے ناگزیر منطقی نتیجے یعنی تباہ کن جنگوں تک جا پہنچا۔

دائمی کساد بازاری

یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ہمیشہ کساد بازاری کے خطرے میں مبتلا رہتا ہے، جو ناکافی اُجرتوں اور بڑھتی ہوئی پیداوار کے مقابلے میں طلب کی کمی کا شاخسانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد سرمایہ دارانہ نظام دائمی طور پر اس صورتِ حال سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔

بعض مادہ پرست مصنفین کا کہنا ہے کہ سرمایہ داری کی یہ ساری خرابیاں سرمائے کی طبعی خرابیاں ہیں۔ جہاں سرمایہ ہوگا وہاں یہ خرابیاں بھی لازماً موجود ہوں گی۔ ان کی موجودگی کا سرمایہ داروں کی بدنیتی یا استحصال بے جا کی خواہش سے کوئی تعلق نہیں، مگر یہ منطق اتنی بودی ہے کہ اس کو مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ خیال وجذبے کی تمام قوتوں سے مسلح ہونے کے باوجود انسان اپنے اقتصادی حالات اور واقعات کا تابع مہمل ہے اور ان کے سامنے مجبورِ محض ہے۔

اسلام کا اصول: مساوی منافع

سرمایہ داری کے ابتدائی دَور میں اس سے انسانیت کو جو فوائد پہنچے اور جو مادی ترقی اور خوشحالی حاصل ہوئی اسلام ان میں سے کسی کی نفی نہیں کرتا اور نہ وہ ان میں سے کسی کے خلاف ہے لیکن اگر دُنیائے اسلام میں سرمایہ داری کا ظہور ہوتا تو اسلام اس کو یونہی آزاد کبھی نہ چھوڑتا بلکہ ایسے قوانین اور اصول مرتب کرتا جن کی موجودگی میں استحصال بے جا کا کوئی خطرہ ہی نہ رہتا، خواہ اس کا باعث سرمایہ داروں کی بدنیتی ہوتی یا سرمائے کی ناگزیر طبعی خصوصیت کے نتیجے میں اس کا ظہور ہوتا؛ چنانچہ اسلام نے اس سلسلے میں ہمیں جو اصول دیا ہے اس کی رو سے سرمایہ دار کے ساتھ مزدور کو بھی منافع میں سے حصہ ملنا چاہیے؛ چنانچہ امام مالکؒ تو مزدور کو مالک کے ساتھ منافع میں مساوی حصے کا مستحق سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کے کمانے میں جتنا سرمایہ دار کے سرمائے کا حصہ ہے اتنا ہی مزدور کی محنت کو بھی دخل حاصل ہے، لہٰذا دونوں کو منافع میں سے مساوی حصہ ملنا چاہیے۔

اسلامی فقہ کے اس اصول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کو معاشرتی انصاف کے قیام سے کس قدر گہری دلچسپی ہے، مگر معاشرتی انصاف کے قیام کا یہ داعیہ اسلام میں کسی مادی ضرورت، مجبوری یا طبقاتی کشمکش (جو کہ بعض لوگوں کے نزدیک معاشی تعلقات و روابط کی ترقی اور بہتری کا واحد مؤثر عامل ہے) کے نتیجے میں نہیں اُبھرا تھا، بلکہ یہ سراسر اس کی اپنی داخلی تحریک کا ثمرہ تھا۔

ابتدائی دَور میں صنعت و حرفت نہایت سیدھی سادی ہوتی تھی اور لوگ زیادہ تر کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ اسلام کے مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں اگر اس وقت محنت اور سرمائے کے باہمی رشتوں کو منضبط کیا جاتا تو ان کو ایک منصفانہ بنیاد مل جاتی اور ان میں وہ خرابیاں پیدا نہ ہوتیں، جو یورپ میں رُونما ہوئیں۔

سُودی بینک اور قرضے

ماہرینِ معاشیات ہمیں بتاتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام جب سے اپنے ابتدائی "دورِ خیر" سے نکل کر اپنے موجودہ "دورِ شر" میں داخل ہوا ہے، قومی قرضوں پر اس کا انحصار بہت بڑھ گیا ہے؛ چنانچہ بینک قائم ہوئے اور انہوں نے اپنا مالی کاروبار اس طرح استوار کیا کہ وہ سُود لے کر حکومتوں کو قرضے مہیا کرنے لگے۔ بینکوں کے کاروبار کی مالی اور فنی پیچیدگیوں میں پڑے بغیر ہم قارئین کے سامنے جو حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں، وہ صرف اتنی ہے کہ یہ قرضے اور بینکوں کا زیادہ تر کاروبار سُود کی اساس پر چل رہا ہے جس کی اسلام نے صاف اور واضح الفاظ میں ممانعت کی ہے۔

سرمایہ داری کی دوسری بنیاد

سرمایہ دارانہ نظام کی دوسری خصوصیت شدید کاروباری مسابقت ہے، جس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے کاروباری ادارے تباہ ہو جاتے ہیں، یا پھر متحد ہو کر وہ بڑے بڑے کاروباری ادارے قائم کر لیتے ہیں تاکہ دوسرے اداروں سے مقابلہ کر سکیں۔ یہیں سے اجارہ داری (MONOPOLY) وجود میں آتی ہے، مگر اسلام اس اجارہ داری کا بھی مخالف ہے؛ چنانچہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من احتکر فھو خاطئ (اجارہ داری قائم کرنے والا گنہگار ہے)

(مسلم وابوداؤد والترمذی)

یہ ہیں سرمایہ داری کی دو بڑی بنیادیں۔ اسلام ان دونوں کا اصولاً مخالف ہے۔ جس کے بعد اسلام کے خلافِ سرمایہ داری ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا، البتہ اگر سرمایہ داری کا ظہور اسلام کے زیرِ سایہ ہوتا تو اس کے موجودہ "دورِ شر" کی خرابیاں رُونما نہ ہوتیں اور نہ سرمایہ داری یوں استحصال بے جا، نوآبادیاتی نظام اور جنگ و تباہی کی ہم معنی بن کر رہ جاتی۔

دنیائے اسلام میں صنعتی انقلاب آتا تو اسلام اس کا خیر مقدم کیسے کرتا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اسلامی دنیا میں صنعتی انقلاب رُونما ہوتا، تو اسلام کو اسے اپنے رنگ میں رنگنے میں ہرگز کوئی الجھن پیش نہ آتی۔ وہ صنعت و حرفت کو چھوٹے چھوٹے کارخانوں تک جن کا منافع مالک اور مزدور آپس میں تقسیم کر لیتے تھے، محدود رکھنے پر اصرار نہ کرتا، بلکہ اس کے زیرِ سایہ پیداوار بڑھ جاتی، مگر مالک اور مزدوروں کے تعلقات کی وہ نوعیت ہرگز نہ ہوتی جو انیسویں اور بیسویں صدی کے یورپ میں نظر آتی ہے۔ اس کے بجائے ان کے باہمی تعلق کی بنیاد اس اصول پر استوار ہوتی، جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں اور جو مالک اور مزدور کو منافع میں ایک دوسرے کے ساتھ برابر کا شریک قرار دیتا ہے۔

اس اسلامی طریقے پر عمل پیرا ہونے کے بعد سُود اور اجارہ داری کا بالکل خاتمہ ہو جاتا۔ اور مزدوروں کو اس بے انصافی، افلاس اور ذلّت سے دوچار نہ ہونا پڑتا، جن سے وہ یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام میں وقتاً فوقتاً دوچار ہوتے رہے ہیں۔

اشتراکی دعاوی کی تردید

اسلام کے متعلق یہ خیال کہ اس طرح کے معاشرتی انصاف کے قیام کے لیے اشتراکیت کی طرح اسے بھی آزمائشوں، طبقاتی کشاکش اور اقتصادی دباؤ سے لازماً دوچار ہونا پڑتا، جس کے بعد اس کے قوانین میں خود بخود کچھ ترمیم و تنسیخ واقع ہو جاتی، ایک احمقانہ تصوّر ہے۔ ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ کس طرح اسلام کو غلامی، جاگیرداری اور ابتدائی سرمایہ داری کے مسائل سلجھانے میں دنیا کے تمام دوسرے نظاموں پر فوقیت حاصل ہے۔ اسلام نے آکر جتنی اصلاحات بھی کیں، ان کا محرک کوئی خارجی دباؤ ہرگز نہیں تھا، بلکہ ان کے پیچھے اسلام کے اپنے ابدی اصولِ حق و انصاف کارفرما تھے، جن کا تمسخر اشتراکی مصنفین اپنی تحریروں میں اڑانے کے عادی ہیں۔ اس کے برعکس یہ واقعہ ہے کہ خود رُوس بھی جس کو مثالی اشتراکی مملکت قرار دیا جاتا ہے، جاگیرداری کے دور سے نکلنے کے بعد اگلے مرحلے یعنی سرمایہ داری کے دور میں

سے گزرے بغیر ہی اشتراکیت کے دور میں داخل ہوگیا۔ گویا یوں رُوس نے جو کارل مارکس کے فلسفے کا پرچارک ہے، خود اپنی عملی مثال سے اس کے اس نظریہ کی تردید کردی ہے کہ ہر انسانی معاشرے کو اپنے ارتقاء کے دوران لازماً کچھ مخصوص ادوار میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

اسلام اور نوآبادیاتی نظام

جہاں تک نوآبادیاتی نظام، جنگوں، دوسری قوموں کے استحصال اور سرمایہ داری کی لائی دوسری عالمگیر برائیوں کا تعلق ہے، اسلام ان سب کے خلاف ہے۔ اپنی نوآبادیات قائم کرنے یا دوسروں کو اپنی اغراض کا آلۂ کار بنانے کی غرض سے ان کے خلاف جنگ کرنا بھی اسلام پسند نہیں کرتا۔ اسلام صرف ایک جنگ کی اجازت دیتا ہے اور وہ ہے ظلم و جارحیت کے خلاف جنگ یا پُرامن ذرائع مسدود ہونے کی صورت میں اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر جہاد!!

ایک بے بنیاد مفروضہ

اشتراکی اور ان کے ہم خیال لوگوں کے نزدیک نوآبادیاتی نظام انسانی ارتقاء کا ایک لازمی مرحلہ ہے۔ اس کا ظہور ایک خالص اقتصادی مسئلہ تھا، جو صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں فاضل پیداوار اور اس کی کھپت کے لیے غیر ملکی منڈیوں کی ضرورت کے احساس کے نتیجہ میں پیدا ہوا، اس لیے یہ انسانی ترقی کا ایک ناگزیر اقتصادی مظہر ہے، جس کو کسی اخلاقی نظریے یا اصول کی مدد سے نہ تو وجود میں آنے سے روکا جاسکتا ہے اور نہ ٹالا ہی جاسکتا ہے۔

ایک سوال

ہمیں یہاں پر یہ حقیقت دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام نوآبادیاتی نظام کے بارے میں یہ مفروضہ ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ یہ انسانی ترقی کا کوئی لازمی اور ناگزیر مرحلہ ہے۔ اشتراکیت کے علمبردار یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ رُوس اپنی فاضل پیداوار کے مسئلے کو اوقاتِ کار میں کمی اور حصولِ پیداوار میں انسانی محنت کی بچت کے ذریعے بالآخر حل کرلے گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اشتراکی روس اپنے اس دریافت کردہ حل کی مدد سے یہ مسئلہ سلجھا سکتا ہے تو دوسرے نظام اس کی مدد

سے کیوں اپنا مسئلہ نہیں سلجھا سکتے؟ اور ان کے لیے نوآبادیاتی نظام کے مرحلے سے گزرنا کیوں ناگزیر ہے؟

ایک قدیم مسئلہ

تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ نوآبادیاتی نظام انسانی فطرت کی ایک بہت پرانی کمزوری رہی ہے۔ اس کا آغاز سرمایہ داری کے زیرِ اثر نہیں ہوا۔ اگرچہ جدید مہلک ہتھیاروں سے مسلح سرمایہ داروں نے آکر اس کی خون آشامی کو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دیا، ورنہ جہاں تک مقہور اور مفتوح اقوام کے استحصال بے جا کا تعلق ہے عہدِ قدیم کا رومی نوآبادیاتی سامراج جدید یورپی سامراج سے کسی لحاظ سے بھی پیچھے نہ تھا۔

اسلام اور استحصالِ بے جا

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جنگوں کے باب میں اسلام دنیا کا سب سے پاکیزہ نظام ہے۔ اسلامی جنگوں کے نتیجے میں کبھی کسی قوم کو استحصال بے جا کا نشانہ نہیں بنایا گیا اور نہ کسی پر غلامی کی لعنت مسلط کی گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر اسلامی دنیا میں صنعتی انقلاب رونما ہوا ہوتا تو فاضل پیداوار (SURPLUS PRODUCTION) کے مسئلے کو اسلام پُرامن طور پر سلجھا لیتا اور اس کو اس غرض کے لیے نہ دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کی ضرورت پیش آتی اور نہ اس پر نوآبادیاتی سامراج کو مسلط کرنے کی۔ واقعہ یہ ہے کہ فاضل پیداوار کا مسئلہ سرمایہ دارانہ نظام کی موجودہ بگڑی ہوئی صورت کا شاخسانہ ہے، بالفاظِ دیگر اگر سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں کو بدل دیا جائے، تو فاضل پیداوار کا یہ مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔

ارتکازِ دولت اور اسلام

سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت ارتکازِ دولت کے معاملے میں بالکل بے بس ہوتی ہے، مگر اسلامی نظام میں حکومت اس معاملے میں یوں بے بس یا غیر جانبدار تماشائی نہیں ہوتی، بلکہ اس بات کی ضامن ہوتی ہے کہ دولت سمٹ کر اس طرح سے صرف چند خاندانوں میں محدود نہ ہو جائے

کہ باقی تمام ملک غربت اور محرومی کا شکار ہو جائے۔ ایسی صورتِ حال کا پیدا ہونا شریعتِ اسلامی کے منشاء کے خلاف ہے کیونکہ وہ چاہتی ہے کہ دولت کی گردش چند لوگوں تک ہی محدود نہ ہو۔ بلکہ اتنی عام ہو کہ تمام انسان اس سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ اسلام میں حکمران کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی پر زیادتی اور ظلم کیے بغیر شریعتِ اسلامی کو نافذ کرے۔ اس غرض کے لیے اس کو خدا کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں تاکہ وہ خدا کے اس قانون کو جاری و ساری کر سکے جس کے نفاذ کے بعد دولت، چند ہاتھوں میں سمٹ کے رہ ہی نہیں سکتی۔

اسلام کا قانونِ وراثت شریعتِ اسلامی کے اسی مزاج کو ظاہر کرتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک نسل اپنے پیچھے جو دولت اور جائیداد چھوڑے، وہ بعد میں آنے والی نسل میں مناسب طور پر تقسیم ہو۔ یہی حال زکوٰۃ کا ہے، جس میں سالانہ آمدنی اور نفع کا دو فیصد حصہ غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ مزید برآں اسلام صاف اور صریح الفاظ میں زر اندوزی کی ممانعت کرتا ہے اور ساتھ ہی سُود کو بھی جو زر اندوزی کا سبب بنتا ہے، حرام قرار دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسلام معاشرے کے مختلف افراد کے باہمی تعلقات کو باہمی استحصال کے بجائے باہمی ذمہ داری کی اساس پر استوار کرتا ہے۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ضمانت

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اسلامی مملکت اپنے عمال کی بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

"جو شخص ہماری (یعنی ریاستِ اسلامی کی) کوئی خدمت انجام دینے پر مامور ہے، اگر وہ غیر شادی شدہ ہے، تو اس کی شادی کرائی جائے گی۔ اگر اس کے پاس رہنے کو مکان نہ ہو، تو مکان دیا جائے گا، خادم نہ ہو، تو خادم دیا جائے گا" اور اگر سواری کے لیے اس کے پاس کوئی جانور نہ ہو، تو اس کی سواری کے لیے جانور بھی مہیا کیا جائے گا"۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی کی یہ ضمانت اسلامی ریاست کے عمال تک ہی محدود نہیں ہے۔

کیونکہ یہ تو ہر انسان کی ضروریاتِ حیات ہیں اور ہر وہ فرد ان کا مستحق ہے، جو اسلامی ریاست یا معاشرے کی کوئی خدمت کسی حیثیت میں بھی انجام دیتا ہے، لہٰذا اگر اسلامی ریاست اپنے عمال کو یہ سہولتیں فراہم کرنے کا ذمہ لیتی ہے تو معاشرے کے تمام دوسرے کارکنوں کو بھی ایسی ہی سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست سرکاری خزانے سے ان تمام افراد کی کفالت کرتی ہے، جو بڑھاپے، بیماری یا کمسنی کی وجہ سے اپنی روزی آپ کمانے کے قابل نہیں ہوتے اس طرح ان لوگوں کو بھی سرکاری خزانے سے مالی اعانت دی جاتی ہے، جن کے ذرائع آمدنی محدود اور ناکافی ہوتے ہیں۔

یہ تمام حقائق ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست اپنی حدود میں رہنے والے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جو طریقۂ کار اختیار کرتی ہے، وہ چنداں اہم نہیں۔ اصل اہمیت اسلامی ریاست کے اس بنیادی اصول کی ہے جو قومی نفع اور نقصان میں قوم کے تمام افراد کو برابر کا شریک قرار دیتا ہے۔ اس سے کارکن اور مزدور نہ صرف دوسروں کے استحصالِ بے جا سے محفوظ ہو جاتے ہیں، بلکہ صاف ستھری زندگیاں بھی گزار سکتے ہیں۔

اسلام کے زیرِ سایہ سرمایہ داری کی وہ مکروہ صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی، جو آج کے "مہذب" مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں نظر آتی ہے۔ شریعتِ اسلامی کا کوئی قانون، خواہ وہ شارع علیہ السلام سے ماخوذ ہو، یا بعد میں حالات کے اقتضا سے حدودِ شریعت میں رہ کر اجتہاد کر کے بنایا گیا ہو، سرمایہ داروں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ محنت کاروں کو اپنی ہوسِ زرگری کی بھینٹ چڑھا دیں۔ اسلام میں سرمایہ داری کی دوسری لعنتیں مثلاً نوآبادیاتی سامراج، جنگیں اور غلامی وغیرہ بھی کبھی سر نہ اٹھا سکیں۔

ایک متوازن نظامِ حیات

معیشت کے سلسلے میں اسلام صرف اچھے اچھے قانون اور ضابطے بنا دینے ہی کو کافی نہیں سمجھتا

بلکہ ان کے ساتھ ساتھ وہ انسان کے ان اخلاقی اور روحانی جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے جنہیں کمیونسٹ صرف اس لیے تمسخر کا نشانہ بناتے رہتے ہیں کہ یورپ کی تاریخ ان کی عملی افادیت کی تمام علامتوں سے خالی ہے، بہرحال اسلام کے نزدیک اخلاقی اور روحانی اقدار انسان کی عملی زندگی سے الگ نہیں ہوتیں۔ اسلام اس لحاظ سے ایک منفرد نظامِ حیات ہے کہ وہ روح کی پاکیزگی اور معاشرے کی تنظیم کو باہم ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ کر دیتا ہے، وہ نہ معاشرے کو نظرانداز کرتا ہے اور نہ فرد کو خلا میں چھوڑتا ہے کہ نظریے اور عمل میں مطابقت پیدا کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہ رہے۔ اسلام کے قوانین کی نیو اخلاقیات پر اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قانون اور اخلاق میں کبھی تضاد پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، پہلو بہ پہلو چلتے ہیں، اور ایک پہلو میں جو کمی رہ جاتی ہے، وہ دوسرے سے پوری ہو جاتی ہے اور ان میں کبھی کوئی کشمکش یا تناقض کی صورت رُونما نہیں ہوتی۔

عیاشی اور اسراف پر پابندی

اسلامی اخلاقیات کی رُو سے عیاشی اور لذت پرستی کی وہ تمام صورتیں جو دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کا لازمی نتیجہ ہیں، سرے سے جائز ہی نہیں ہیں۔ اسلام ان تمام کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی مالکوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنے ملازمین سے بے انصافی کے مرتکب نہ ہوں، اور ان کے جائز معاوضوں میں کوئی کمی نہ کریں، بلکہ انہیں ان کا پورا پورا حق دیں۔ ارتکازِ دولت بھی ملازمین پر ظلم اور زیادتی ہی کی ایک صورت ہے، اس لیے بے انصافی کے خاتمہ کے لیے اس کا سدِّباب بھی ضروری ہے، چنانچہ اسلام اس لیے بھی ارتکازِ دولت کے خلاف ہے۔ اسلام لوگوں کے اندر خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا جذبہ ابھارنا چاہتا ہے، خواہ اس کے لیے انہیں اپنا سبھی کچھ لٹا دینا پڑے۔ جس معاشرے میں خوشحال لوگ اس طرح خدا کی خاطر دوسروں پر خرچ کرتے رہتے ہیں، وہاں غربت اور محرومی باقی رہ ہی نہیں سکتی، کیونکہ یہ دونوں تو خودغرضی کی پیداوار ہیں جس کی وجہ سے معاشرے کے متمول افراد اپنی ساری دولت اپنے ذاتی آرام و آسائش پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔

روحانی سربلندی اور قربِ الٰہی

علاوہ ازیں اسلام انسان کو جس روحانی رفعت سے بہرہ ور کرتا ہے اس سے انہیں خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے اور رضائے الٰہی کے حصول اور آخرت کے اجر کی امید میں وہ بخوشی دنیا کی تمام لذتوں اور فائدوں سے محرومی بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کا انسان جو خدا سے راضی ہوتا ہے اور آخرت اور سزا و جزا پر ایمان رکھتا ہے وہ کبھی زر اندوزی کی بیماری میں مبتلا نہیں ہو سکتا اور نہ کبھی اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر دوسروں کو اپنے ظلم و زیادتی اور استحصالِ بے جا کا نشانہ بنا سکتا ہے۔

رضاکارانہ پابندیٔ قانون

اسلام انسان کو جس روحانی سربلندی سے ہمکنار کرتا ہے وہ ایسے اقتصادی قوانین کے نفاذ کو آسان بنا دیتی ہے جن سے سرمایہ داری کی جملہ خرابیوں کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشرے میں جب عملاً ان قوانین کا نفاذ کیا جاتا ہے تو معاشرے کے افراد ان پر رضا و رغبت عمل کرتے ہیں۔ ان کے اس عمل کا محرک سزا کا کوئی خوف نہیں ہوتا، بلکہ ان کا اپنا اخلاقی احساس ہوتا ہے کیونکہ جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی ہے وہی قانون کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔

آخری بات

آخر میں ہم یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کی وہ مکروہ صورت، جو اس وقت اسلامی دنیا پر مسلط ہے اس کا اسلامی نظام سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہے، اس لیے اس کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کے لیے کسی طرح بھی اسلام کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

○

اسلام اور ذاتی ملکیت

کیا ذاتی ملکیت انسان کا فطری جذبہ ہے؟ کیمونسٹ اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ اور دعوٰی کرتے ہیں کہ ابتدائی دورِ انسانیت میں اشتراکیت کا دور دورہ تھا۔ اس دور کے انسانی معاشرے میں ذاتی ملکیت کا سراغ نہیں ملتا۔ اس وقت تمام چیزیں مشترکہ ملکیت ہوا کرتی تھیں، جن میں سب لوگ برابر کے شریک تھے، ان میں محبت تھی، تعاون تھا، اور وہ بھائیوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے، مگر افسوس کہ یہ "عہدِ زریں" جلد ہی ختم ہوگیا، کیونکہ زراعت کے آغاز کے ساتھ ہی انسانوں میں زرعی زمینوں اور ذرائع پیداوار کی خاطر ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا شروع ہوگیا جس نے آگے بڑھ کر جنگوں کی صورت اختیار کرلی۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے اس صورت حال کا علاج صرف یہ ہے کہ انسان "اشتراکیت اُولیٰ" کی طرف پلٹیں تاکہ ذاتی ملکیت اور اس کے پیدا کیے ہوئے یہ جھگڑے ختم ہوں، سب چیزیں سب لوگوں کی مشترکہ ملکیت ہوں تاکہ وہ سب ان سے مستفید ہوسکیں۔ اشتراکیوں کے نزدیک صرف اسی طرح دُنیا میں امن، محبت اور ہم آہنگی پیدا کی جاسکتی ہے۔

نفسیات اور ذاتی ملکیت کا جذبہ

لیکن فطری اور اکتسابی جذبات، خیالات اور عادات و اطوار میں کیا فرق ہے؟ ماہرین نفسیات اس سوال کے مختلف جوابات دیتے ہیں کیونکہ اس بارہ میں ان میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی حال ذاتی ملکیت کے مسئلے کا بھی ہے۔ بعض ماہرین نفسیات و عمرانیات کے نزدیک یہ انسان کا ایک فطری جذبہ ہے اور محض ماحول کے تابع یا اس کی پیداوار نہیں ہے۔ مگر بعض ماہرین اس کو اکتسابی جذبہ قرار دیتے ہیں۔ جو ماحول کے زیرِ اثر انسان میں پیدا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک بچہ جب اپنے کھلونے کسی کو دینے سے انکار کرتا ہے' تو اس کے اس انکار کے پیچھے دراصل یہ خوف کارفرما ہوتا ہے کہ اس طرح اس کے کھلونے کم ہو جائیں گے یا کوئی اور بچہ اس کے باقی کھلونے بھی ہتھیا لے گا؛ چنانچہ اگر دس بچے ہوں اور کھلونا صرف ایک ہو تو ان میں لڑائی جھگڑا ہونا ناگزیر ہے' لیکن اگر ان میں سے ہر ایک بچے کو ایک ایک کھلونا مل جائے' تو سب خوش ہو جائیں گے اور ان میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا۔

اشتراکیوں اور ان کے ہم خیال ماہرین نفسیات و عمرانیات کے ان دلائل کے جواب میں ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں' وہ مندرجہ ذیل ہے:

ناکافی ثبوت

(۱) اب تک کوئی سائنسدان قطعی طور پر کوئی ایسی ٹھوس دلیل نہیں لا سکا' جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ذاتی ملکیت انسان کی جبلت میں شامل نہیں ہے۔ ذاتی ملکیت کے مخالفین زیادہ سے زیادہ بس یہی کہ سکتے ہیں کہ ان کے پاس ذاتی ملکیت کے جبلتِ انسانی ہونے کا کوئی حتمی ثبوت موجود نہیں ہے۔

بچے اور کھلونے

(۲) بچوں اور ان کے کھلونوں کی مثال سے' جس سے اشتراکی حضرات اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں' وہ نتائج ہرگز نہیں نکلتے جو یہ حضرات نکالنا چاہتے ہیں۔ دس کھلونوں کی موجودگی میں دس بچوں کا آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرنا' انسانی فطرت میں ذاتی ملکیت کے جذبے کی نفی نہیں کرتا' بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحت مند ماحول میں ذاتی ملکیت کی خواہش کامل مساوات کے قیام سے بھی پوری ہو جاتی ہے۔ مثال سے اس انسانی خواہش کا عدم وجود نہیں ثابت ہوتا' بلکہ محض اس کی نوعیت کا اظہار ہوتا ہے' کیونکہ یہ بھی حقیقت ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا' کہ بہت سے بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے کھلونے رکھنے کے باوجود اپنے ساتھیوں کے کھلونے بھی اڑا لیتے ہیں اور جب تک ایسے حالات پیدا نہ ہو جائیں جو انہیں بے بس نہ بنا دیں' وہ اپنی اس حرکت سے باز نہیں آتے۔

یہ عہدِ زرّیں

(۳) جہاں تک اشتراکیوں کے اس "عہدِ زرّیں" کا تعلق ہے، جو بقول ان کے تمام ابتدائی انسانی معاشروں کی خصوصیت تھی، تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے وجود کے بارے میں کوئی ٹھوس شہادت اب بھی موجود نہیں ہے جس سے حتمی طور پر یہ معلوم ہو سکتا ہو کہ کوئی ایسا "عہدِ زرّیں" واقعی ابتدائی انسانیت پر گزرا ہے، بالفرض اگر اس کے وجود کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس عہدِ زرّیں میں ذرائع پیداوار سرے سے موجود ہی نہیں تھے اور جب ذرائع پیداوار اس "عہدِ زرّیں" میں موجود ہی نہ تھے، تو ان کی خاطر انسانوں میں جھگڑے کیوں کر اٹھ کھڑے ہوتے؟ اس دور میں انسان کو اپنی خوراک حاصل کرنے میں کوئی دِقّت نہیں ہوتی تھی، وہ جب چاہتے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھا کر درختوں سے پھل توڑ سکتے تھے، شکار کے لیے نکلتے تو جنگلی درندوں کے خوف سے ٹولیاں بنا کر نکلتے تھے، مگر شکار کیے ہوئے جانوروں کے گوشت کا ذخیرہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ یہ خراب ہو جاتا تھا۔ اور زیادہ دیر تک رکھا ہی نہیں جا سکتا تھا اس لیے وہ شکار کا گوشت سنبھال کر رکھتے نہیں تھے، بلکہ جتنی جلدی ممکن ہوتا اسے استعمال میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔ اب اگر اس دَور کے انسانوں کی زندگی میں کوئی کشمکش نہیں ملتی، تو اس سے ذاتی ملکیت کے فطری جذبے کی تردید بھی نہیں ہوتی، کیونکہ اس دور میں کشمکش کے عدم وجود کا اصل راز یہ تھا کہ اس دَور میں کوئی ایسی شئے تھی ہی نہیں جو انسانوں میں وجہ نزاع بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ زراعت کے دور کے ساتھ ہی کشمکش کا بھی آغاز ہو گیا، زراعت کی دریافت نے انسانوں کے اس خوابیدہ جذبۂ کشمکش کو بیدار کر دیا اور اس سے پہلی بار اس کو تحریک ملی۔

جنس مشترک عدم کشمکش کی دلیل نہیں ہے

(۴) اگر اشتراکیت کے اس نظریے کو مان بھی لیا جائے کہ ابتدائی دور میں عورت سب کی مشترک ملکیت تھی، تب بھی کوئی حتمی طور پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس دَور میں عورت کی خاطر

مردوں میں کشمکش یا زور آزمائی نہیں ہوتی تھی، کیونکہ جنس مشترک ہونے کے باوجود ایک عورت دوسری عورتوں سے زیادہ حسین ہونے کی بنا پر مردوں میں وجہ نزاع بن سکتی ہے۔ یہاں پر یہیں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ اگر معاملہ ایک جیسی اور مساوی اشیاء کا ہو، تو ان کے بارے میں یقیناً کوئی جھگڑا نہیں پیدا ہو سکتا، مگر جہاں چیزوں کی قدر و قیمت اور ان کے متعلق لوگوں کے نقطۂ نظر میں اعلیٰ اور ادنیٰ کے لحاظ سے واضح فرق پایا جاتا ہو، وہاں اختلاف اور کشمکش کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے خواہ "فرشتوں" کا وہ مثالی معاشرہ ہی کیوں نہ ہو، جو اشتراکیوں کے مستقبل کے خوابوں کا مرکز و محور ہے۔

نمایاں ہونے کا جذبہ

(۵) ابتدائی دور ہی سے انسان میں اپنے ہم جنسوں کے مقابلے میں نمایاں اعزاز حاصل کرنے کی خواہش موجود رہی ہے، چنانچہ کچھ لوگ بہادری، جسمانی قوت یا ایسے ہی دوسرے ذرائع سے اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اب بھی بعض قدیم قبائل، جن کی زندگی "اشتراکیت اعلیٰ" کے مثالی دور کی ایک مثال ہے، اپنی لڑکیاں صرف ان نوجوانوں سے بیاہتے ہیں، جو اکتاہٹ یا درد کی کوئی علامت ظاہر کیے بغیر اپنی پیٹھوں پر سو کوڑے کھانے کو تیار ہوں۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیا چیز ان نوجوانوں کو یہ جوکھم مول لینے پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ کسی درد اور تکلیف کی بھی پروا نہیں کرتے۔ ظاہر ہے یہ اپنی شخصیت کے اظہار اور نمایاں ہونے کے جذبہ کا کرشمہ ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے کہ دنیا کی تمام اشیاء میں کامل مساوات کا اصول کارفرما ہے، تو پھر وہ کیا جذبہ ہے، جو ایک انسان کو دوسروں سے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے: "میں تم جیسا نہیں ہوں، بلکہ تم سے افضل اور بہتر ہوں"۔ انسانی فطرت کا یہ پہلو بڑا اہم ہے، کیونکہ اگر بالفرض بقول اشتراکیوں کے ذاتی ملکیت ایک فطری جذبہ نہ ہو، تب بھی اس کا ایک دوسرے فطری جذبے ـــ یعنی امتیاز حاصل کرنے اور نمایاں ہونے کے جذبے ـــ سے گہرا تعلق ہے، جو اس وقت سے انسانی فطرت کا حصہ نظر آتا ہے، جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے۔

٭

ان نظری مباحث سے قطع نظر آئیے اب دیکھیں کہ اسلام میں ذاتی ملکیت کو کیا مقام

حاصل ہے؟

اشتراکیوں کا دعویٰ ہے کہ ذاتی ملکیت اور بے انصافی ہمیشہ لازم وملزوم رہی ہیں، اس لیے اگر انسان ظلم وزیادتی اور بے انصافی سے نجات پانا چاہتا ہے تو اسے ذاتی ملکیت کو بھی ختم کرنا پڑے گا۔

دو اہم حقیقتیں

لیکن یہ حضرات ایسا دعویٰ کرتے وقت دو اہم حقیقتیں فراموش کر جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ انسانی ترقی تمام تر افراد ہی کی کوششوں کی مرہونِ منّت رہی ہے اور دوسرے یہ کہ "اشتراکیت اولیٰ" کے نام نہاد مثالی دور میں انسانی ترقی بمنزلۂ صفر تھی۔ بالفاظِ دیگر انسان نے صرف اس وقت ترقی کرنی شروع کی، جب ذاتی ملکیت کی وجہ سے کشمکش کا آغاز ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی کشمکش انسان کے حق میں محض شر نہیں ہے، بلکہ اگر یہ جائز حدود سے تجاوز نہ کرے تو انسان کی ایک ناگزیر نفسیاتی، سماجی اور معاشی ضرورت ہے۔

بے انصافی کی اصل وجہ

اسلام کے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ دنیا میں ظلم وزیادتی اور بے انصافی کی اصل وجہ ذاتی ملکیت ہے۔ یورپ اور دوسرے غیر مسلم ممالک میں بے انصافی کی جو مثالیں ملتی ہیں، اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ ان ممالک میں حکومت اور قانون سازی کے سارے اختیارات خوشحال طبقے کے ہاتھوں میں تھے۔ جن سے کام لے کر اس نے لامحالہ ایسے قوانین وضع کیے جن کا اصل منشا سرمایہ داروں کے مفاد کا تحفظ تھا خواہ اس کی خاطر دوسرے طبقات کے ساتھ ظلم وزیادتی کرنی پڑے یا ان کا مفاد مجروح ہو۔

اسلام میں مراعات یافتہ طبقہ کا عدم وجود

مگر اسلام کسی حکمران طبقے کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے۔ اسلامی نظام میں قوانین سازی کا کام ایک مخصوص اعلیٰ طبقہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے سارے اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہوتے ہیں جو تمام انسانی طبقات کا خالق ہے اور سارے انسان اس کی نگاہ میں برابر ہیں۔ کوئی انسان یا طبقہ اس کا چہیتا نہیں ہے کہ وہ ان کی خاطر دوسروں سے بے انصافی پر آمادہ ہو۔ اسلامی نظام میں سب مسلمان آزاد

انتخاب کے ذریعے اپنے حکمران کا چناؤ کرتے ہیں تو اسے محض اس بنا پر حکمران نامزد نہیں کر دیا جاتا کہ وہ ایک خاص طبقے یا گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اختیارات حکمرانی سنبھالنے کے بعد بھی ایک مسلمان حکمران اپنے بنائے ہوئے قانون کو نافذ نہیں کرتا، بلکہ خدا کے الہامی قانون کی اطاعت کرتا ہے اور اس کو نافذ کرتا ہے اور مسلمان اس کی اطاعت کے صرف اس وقت تک پابند ہوتے ہیں جب تک کہ وہ ایسا کرتا رہے۔ اس سلسلے میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول کتنا واضح ہے:

أطیعونی ما أطعتُ اللہ فیکم فان عصیت اللہ فلا طاعة لی علیکم۔

میری اطاعت کرو جب تک میں تمہارے بارے میں خدا کی اطاعت کرتا رہوں اگر میں خدا کی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت نہیں ہے۔

اسلام حکمران کو قانون سازی کے اختیارات نہیں دیتا کہ وہ از خود قانون وضع کرے یا کسی دوسرے کو اس کا حق تفویض کر سکے۔ قانونی طور پر حکمران کسی ایک طبقے کو دوسرے طبقے یا طبقوں پر ترجیح دینے کا مجاز بھی نہیں ہوتا اور نہ سرمایہ داروں کے زیرِ اثر اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کوئی ایسی قانون سازی کرے جس کا مقصد ان خوشحال طبقات کو فائدہ پہنچانا اور دوسرے طبقوں کو نقصان پہنچانا اور ان پر زیادتی کرنا ہو۔

یہاں پر یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جب ہم اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں، تو اس سے ہماری مُراد اسلامی تاریخ کا وہ دَور ہوتا ہے جب اسلام کے اصولوں اور تعلیمات کی صحیح معنوں میں حکمرانی تھی۔ اس سے ہماری مراد زوال کا وہ دَور نہیں ہوتا جس میں اسلامی حکومت بادشاہت میں بدل گئی۔ اسلام اس طرح کی بادشاہتوں کو نہ تو تسلیم کرتا ہے اور نہ ان کی غلط کاریوں کا اسے ذمّہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسلامی حکومت کا مثالی دَور بہت مختصر تھا، مگر اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اسلامی نظام محض ایک نظری نظام ہے، جو عملی زندگی کے لیے موزوں نہیں، کیونکہ جس نظام کو ایک بار کامیابی سے اپنایا جا چکا ہے، اس کو دوبارہ اپنایا جانا بھی ممکن ہے بلکہ انسانوں کا فرض ہے کہ وہ اس کے دوبارہ قیام کے لیے مل جل کر جدوجہد کریں۔ آج اسلامی نظام کے لیے فضا جس قدر سازگار

ہے اس قدر شاید کبھی نہ تھی۔

قانونی مساوات

اسلامی نظام میں خوشحال طبقوں کو اپنے حسب منشاء قوانین وضع کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ اسلام کے نزدیک انسانوں میں حقوق کے لحاظ سے کسی قسم کی تفریق کرنا روا نہیں ہے، بلکہ وہ ان سب کے ساتھ قانونِ اسلامی کے مطابق یکساں برتاؤ کرتا ہے۔ اگر قانونِ اسلامی کے بعض پہلوؤں کی تشریح و تعبیر کی ضرورت پڑ جائے تو جیسا کہ دُنیا کے ہر قانون میں ہوتا ہے اسلامی قانون کے ماہرین کی رائے حتمی سمجھی جائے گی۔ اسلامی ماہرینِ قانون کا قابلِ فخر کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خوشحال لوگوں کی خاطر کبھی اسلامی قانون کو مروڑ توڑ کر اس طرح پیش نہیں کیا کہ یہ ان کی اغراض کا اور دوسرے طبقات پر ظلم وستم کا آلۂ کار بن کر رہ جائے۔ اس کے برعکس ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مزدور پیشہ طبقے کی بنیادی ضروریات پر پُوری پُوری توجہ دی جائے۔ حتیٰ کہ بعض فقہا نے تو مزدور اور کسان کو منافع میں مالک کے ساتھ برابر کا شریک قرار دیا ہے۔

انسانی فطرت پست نہیں ہے

اسلام کے نزدیک انسانی فطرت اتنی پست واقع نہیں ہُوئی ہے کہ ذاتی ملکیت کا نتیجہ لازمی طور پر بے انصافی اور ظلم وستم ہی کی صورت میں برآمد ہو۔ جہاں تک انسان کی تعلیم اور تہذیب کا تعلق ہے، اسلام کو اس میں بے نظیر کامیابی حاصل ہُوئی؛ چنانچہ صاحب مال وجائیداد ہوتے ہُوئے بھی مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ:

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔ (الحشر: ۹)	یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کرکے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔

وہ دوسروں کو اپنی دولت میں شریک کرکے خوشی محسوس کرتے تھے، مگر اس سے ان کا مقصود کوئی

دُنیاوی فائدہ حاصل کرنا نہ ہوتا تھا، بلکہ اس کے عوض وہ صرف خدا سے اجر اور مغفرت کے طالب تھے۔

ان اعلیٰ اور پاکیزہ مثالوں کو ہمیں ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ یہ تاریخ میں عام نہیں ملتیں۔ یہ ہمیں وہ روشنی دیتی ہیں جس سے ہمارا مستقبل روشن ہو سکتا ہے اور ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انسانیت کا مرتبہ و مقام کتنا بلند ہے۔

ایک صحت مند معاشرہ

یہاں پر ہمیں یہ بات بھی خوب سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان محض خیالی دُنیا میں مگن رہے، چنانچہ اسلام اجتماعی مفاد کو محض "نیک خواہشات" کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دیتا۔ رُوح کی پاکیزگی کی اس تمام اہمیت کے باوجود جو اسلام کے نزدیک اسے حاصل ہے اسلام زندگی کے عملی مسائل سے کبھی چشم پوشی نہیں کرتا۔ اسلام قانون کے ذریعے اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی تقسیم منصفانہ بُنیادوں پر ہو۔ رُوحانی پاکیزگی سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں عادلانہ قوانین بھی دیتا ہے اور اس طرح ایک صحتمند انسانی معاشرے کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ غالباً یہی وہ حقیقت تھی جس کا اظہار خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ بن عفان نے اپنے اس قول میں کیا ہے:

ان الله یزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن

بیشک اللہ تعالیٰ قوت سے ان چیزوں کا سدِ باب کرتا ہے جن کا سدِ باب قرآن سے نہیں ہو سکتا۔

تاریخ کی گواہی

بہرحال جہاں تک ذاتی ملکیت کا تعلق ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس سے لازماً بے انصافی جنم لیتی ہے، کیونکہ بعض ادوار ایسے بھی ملتے ہیں جن میں اس کی موجودگی کسی بے انصافی کا باعث نہیں بنی۔ اسلام نے زمین کی ملکیت کی اجازت دی، مگر اس کو یورپ کی طرح جاگیرداری کی صورت اختیار نہ کرنے دی۔ اس خطرے کے سدِ باب کے لیے اسلام نے ایسے اقتصادی اور سماجی قوانین وضع کیے، جن کی موجودگی میں جاگیرداری نظام کو فروغ حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ لوگ بھی ایک آبرومندانہ معیار کی زندگی گزار سکتے تھے، جن کی ملکیت میں سرے سے

کوئی زمین تھی ہی نہیں۔ یہی وہ تحفظات تھے جن کی بدولت اسلامی نظام میں خوشحال لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ غریبوں پر کوئی زیادتی کر سکیں۔

ذاتی ملکیت کا حق مطلق نہیں محدود ہے۔

اس کے برعکس اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ اسلام میں سرمایہ داری کا پھلنا پھولنا ممکن تھا، تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام میں سرمایہ داری کا صرف وہی نظام پنپ سکتا ہے جو عوامی مفاد کا خادم ہو۔ ایک طرف تو اسلام انسانی فطرت کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور دوسری طرف ایسے قوانین بناتا ہے، جن کے ہوتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام، استحصال بے جا اور ظلم و زیادتی کی مکروہ صورتیں اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ اگر اسلامی نظام کو کام کرنے کا موقع ملتا، تو وہ اپنے اس طریقِ کار سے مغربی دُنیا کو اس کی موجودہ خرابیوں سے کبھی کا پاک کر چکا ہوتا۔ علاوہ ازیں اسلام میں افراد کو ذاتی ملکیت کی جو اجازت حاصل ہے، وہ بعض پابندیوں کے تحت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اسلام میں یہ اصول ہے کہ عوامی وسائل و ذرائع عوامی ملکیت ہیں، چنانچہ جہاں انصاف و عدل کی خاطر ضروری تھا، اسلام نے ذاتی ملکیت کی اجازت نہیں دی اور جب اجازت دی ہے، تو صرف اس وقت جب اس کی پوری طرح تسلی ہو گئی کہ اس کو دوسروں پر ظلم و زیادتی اور بے انصافی کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔

سکنڈے نیویا کی مثال

اس نکتہ کی وضاحت بعض غیر مسلم ممالک کی مثال سے بخوبی ہوتی ہے۔ انگریز، امریکی اور فرانسیسی جو نسلی اور قومی بنیادوں پر تفریق کے قائل ہیں، سب مانتے ہیں کہ سکنڈے نیویا کے باشندے دُنیا کے انتہائی خلیق اور مہذب لوگ ہیں، مگر واضح رہے کہ سیکنڈے نیویا — یعنی ناروے اور سویڈن — میں ذاتی ملکیت کو اب تک ممنوع نہیں قرار دیا گیا، بلکہ دولت کی منصفانہ تقسیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس غرض کے لیے سماجی تحفظات رکھے گئے ہیں جن کا مقصد مختلف طبقوں کے باہمی فرق کو کم کرنا اور کام اور معاوضوں کی مقدار میں ایک مناسب نسبت کو

برقرار رکھنا ہے۔ سکنڈے نیویا کی ان خصوصیات کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک اسلام کے قانون کے بعض پہلوؤں کو بروئے کار لانے کا تعلق ہے، یہ ممالک باقی دُنیا کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہیں۔

جدید معاشی نظاموں کے اساسی اصول

کسی معاشی نظام کو ان سماجی نظریات سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا، جن پر اس کی عمارت اٹھتی ہے۔ موجودہ دَور میں رائج تین اہم نظاموں ـــــ سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام ـــــ پر ایک نظر ڈالنے سے ہم پر یہ حقیقت بخوبی واضح ہو سکتی ہے کہ ان تینوں میں معاشی نظام اور ملکیت کے بارے میں ان کے نظریے کا ان کے مخصوص سماجی پس منظر سے گہرا تعلق ہے۔

سرمایہ داری

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد اس مفروضے پر قائم ہے کہ فرد کی ذات مقدس ہے اور اس کا تقدس کسی صورت میں بھی مجروح نہیں ہونا چاہیے اور نہ اس پر کسی طرح کی سماجی پابندیاں عائد کی جانی چاہییں۔ اس سے ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام بے قید ذاتی ملکیت کا حامی ہے جس پر وہ کسی قسم کی کوئی قدغن عائد نہیں کرنا چاہتا۔

اشتراکیت

اس کے برعکس اشتراکیت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ "اجتماع" وہ اصل بنیاد ہے، جس سے الگ یا آزاد فرد کا کوئی وجود نہیں۔ چنانچہ اشتراکیت اجتماع کی نمائندہ ہونے کے لحاظ سے تمام حقوق ملکیت ریاست کو سونپ دیتی ہے اور افراد سے ذاتی ملکیت کے تمام حقوق چھین لیتی ہے۔

اسلام

اسلام کا اجتماعی نظریہ اس معاملے میں بالکل مختلف ہے جس کی وجہ سے اس کا معاشی نظام

بھی ان دونوں نظاموں سے بالکل مختلف ہے جہاں تک فرد اور معاشرے کے باہمی حسن کا سوال ہے اسلام کے نزدیک فرد کی بیک وقت دو حیثیتیں ہیں۔ انفرادی حیثیت اور معاشرتی حیثیت جس کے لحاظ سے وہ ایک معاشرے کا رُکن قرار پاتا ہے۔ اسلام فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی دو حیثیتوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔

اسلام کی خوبی

اسلام کا یہ سماجی نظریہ نہ تو فرد کو معاشرے سے جُدا کرتا ہے اور نہ اس کے نزدیک فرد اور معاشرہ دو باہم متضاد قوتوں کے نام ہیں جن میں سے ہر ایک دوسری پر غلبہ پانے کی فکر میں رہتی ہے۔ فرد بیک وقت آزاد بھی ہے اور ایک معاشرے کا رُکن بھی۔ اسلامی قانون ایک طرف تو فرد اور اجتماعی رجحانات اور دوسری طرف فرد اور دوسرے افرادِ معاشرہ کے مفادات کے مابین ہم آہنگی بروئے کار لانا چاہتا ہے مگر اس ہم آہنگی کی خاطر وہ نہ فرد کے مفاد کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ اجتماعی بہبود سے صرفِ نظر کرتا ہے۔ اس کا قانون نہ تو معاشرے کی خاطر فرد کو تباہ کرنے کا روادار ہے اور نہ ایک یا کچھ افراد کو فائدہ پہنچانے کی خاطر معاشرے میں انتشار پھیلانے کی اجازت دیتا ہے وہ ایک طرف فرد کی حفاظت کرتا ہے تو دوسری طرف معاشرے کو انتشار سے بچاتا ہے۔

ایک خوشگوار نقطۂ اعتدال

اسلام کا معاشی نظام توافق و ہم آہنگی کے اس تصور پر قائم ہوتا ہے جو سرمایہ داری اور اشتراکیت کی دو انتہاؤں کے درمیان ایک خوشگوار نقطۂ اعتدال ہے۔ اس میں دونوں نظاموں کی خوبیاں تو موجود ہیں، مگر ان کی غلطیوں اور گمراہیوں سے اس کا دامن پاک ہے۔ یہ اصولی طور پر ذاتی ملکیت کی اجازت دیتا ہے، مگر اس کو ایسی پابندیوں سے محدود کر دیتا ہے، جو اس کو بے ضرر بنا دیتی ہیں۔ دوسری طرف اسلام حکمران اور معاشرے کو اجتماع کا نمائندہ ہونے کی حیثیت میں ذاتی ملکیت کی تنظیم کی خاطر ضروری قوانین بنانے اور معاشرتی بہبود کے

لیے ان میں حسب ضرورت تغیر و تبدل کرنے کا بھی پورا پورا اختیار دیتا ہے۔

خرابیوں کی اصلاح

اسلام ذاتی ملکیت کا حامی ہے، کیونکہ اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی اصلاح کی بھی وہ پوری صلاحیت رکھتا ہے اور اس غرض کے لیے مختلف ذرائع و وسائل اپناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اصولی طور پر ذاتی ملکیت کی اجازت دے کر معاشرے کو اس کی تنظیم و تحدید کے لیے ضروری اختیارات دینا اس کے قطعی خاتمہ سے کہیں زیادہ بہتر اور مناسب صورت ہے، خصوصاً جب کہ اس خاتمے کی بنیاد محض اس مفروضے پر قائم ہو کہ ذاتی ملکیت کا جذبہ انسانی فطرت کا جزو نہیں ہے اور نہ یہ انسانی زندگی کی کوئی اہم ضرورت ہے۔ یہ بات کہ خود روس میں بھی حکومت کو محدود ذاتی ملکیت کی اجازت دینا پڑی، اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ انسانی فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگی فرد اور معاشرے دونوں کے مفاد کے لیے بہتر ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر ذاتی ملکیت کو کیوں ممنوع قرار دیا جائے؟ اور کن وجوہ کی بنا پر اسلام سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اسے حرام قرار دے؟

اشتراکیت کا دعوےٰ ہے کہ لوگوں میں مساوات قائم کرنے کے لیے ذاتی ملکیت کا خاتمہ ناگزیر ہے، کیونکہ صرف اسی طرح انسان کو اپنے جیسے انسانوں کی محکومیت اور غلامی سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ روس میں ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے، مگر کیا اس سے وہ تمام مقاصد حاصل ہو گئے ہیں جو اس کے خاتمہ کے وقت پیشِ نظر تھے؟ یاد رہے کہ اسٹالن کے عہدِ حکومت میں حکومتِ روس کو زائد کام کرانے کے لیے مزدوروں کو زائد اجرتوں کا لالچ دینا پڑا تھا اور اس طرح اس نے مزدوروں کی اجرتوں میں یکسانیت کی خود ہی عملاً نفی کر دی تھی۔

کیا آج روس میں تمام کارکنوں کو ایک جیسے معاوضے دیے جاتے ہیں؟ کیا وہاں کے

ڈاکٹروں اور نرسوں کی تنخواہیں ایک جیسی ہیں؟ خود اشتراکی حضرات ہمیں بتاتے ہیں کہ روس میں انجینئروں اور فنکاروں کی آمدنی سب سے زیادہ ہے، جس سے وہ غیر شعوری طور پر گویا یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ روس میں مختلف طبقات میں اب بھی اجرتوں کا واضح فرق موجود ہے۔ یہ امتیازات صرف مختلف طبقوں کے افراد ہی میں نہیں ملتے، بلکہ ایک ہی طبقے کے افراد میں بھی یہ امتیازات موجود ہیں۔

لمحۂ فکریہ

کیا ذاتی ملکیت کے سدباب سے روس کے لوگوں میں ایک دوسرے سے مسابقت اور ذاتی امتیاز کے حصول کا جذبہ سرد ہو گیا ہے؟ اگر یہ سارے امتیازات ختم ہو گئے ہیں، تو پھر وہاں ٹریڈ یونین کے رہنماؤں، کارخانے کے مینجروں، اعلیٰ منتظمین اور مختلف محکموں کے سربراہوں کا انتخاب کس طرح کیا جاتا ہے؟ اور خود کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم اور ناکارہ ارکان میں فرق آخر کس بنیاد پر کیا جاتا ہے؟

ذاتی ملکیت کے جواز یا عدم جواز کی بحث سے قطع نظر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دوسروں پر برتری اور ان کے مقابلے میں امتیاز کے حصول کا جذبہ انسانی فطرت کا لازمی حصہ ہے؟ اشتراکیت نے ذاتی ملکیت کا خاتمہ کر دیا، مگر اس کے باوجود وہ انسانیت کو اس عظیم خرابی سے پاک نہیں کر سکی، جو اس کے نزدیک صرف ذاتی ملکیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اشتراکیت کی اس ناکامی کے بعد یہ مناسب نہیں کہ ہم اس کی پامال راہ پر چلیں اور وہ فرسودہ طریقہ اختیار کریں، جو فطرت انسانی کی عین ضد واقع ہوا ہے اور ایک ایسے مقصد کی خاطر اپنی قوتوں کو ضائع کریں، جس کا حصول ممکن ہی نہیں۔

کھوکھلی منطق

روس میں جو طبقاتی امتیازات پائے جاتے ہیں ان کے بارے میں بعض اشتراکی حضرات

کہتے ہیں کہ یہ امتیازات اتنے کم ہیں کہ ان کے نتیجے میں نہ تو خوشحال طبقہ بدمست ہو کر عیش وعشرت میں مگن ہو سکتا ہے اور نہ نچلے طبقے محرومی کا شکار ہوتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ذاتی ملکیت کے کلی خاتمے کے بعد بھی یہی کچھ حاصل ہونا ہے، تو اس تکلّف کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ آج سے تیرہ صدی پیشتر، جبکہ ابھی کمیونزم کا دنیا میں کہیں وجود نہ تھا، اسلام نے دنیا کو جن اصولوں کا درس دیا، ان میں سے ایک اہم اصول یہ تھا کہ معاشرے کے افراد کے درمیان پائے جانے والے معاشی تفاوت کو کم سے کم کیا جائے تاکہ کچھ لوگ دوسروں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر کے عیش وعشرت کے ٹھاٹھ نہ جما سکیں، مگر اس مقصد کے حصول کے لیے اسلام نے محض قانون کے ڈنڈے کا سہارا نہیں لیا، بلکہ لوگوں کے دلوں میں اللہ، نیکی اور بنی نوع انسان کی محبت کے جذبے کو بیدار کیا جس کے بعد ان سے قانون کی پابندی کرانے کے لیے کسی بیرونی طاقت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسلام اور طبقاتی نظام

وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ (النحل) — اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے۔

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ (الزخرف ۳۲) — اور ہم نے ایک کو دوسرے پر درجوں کے لحاظ سے رفعت دے رکھی ہے۔

اشتراکی معترضین کہتے ہیں کہ ان آیاتِ قرآنی کی موجودگی میں کون مسلمان اسلام میں طبقاتی نظام کے وجود سے انکار کرسکتا ہے؟

طبقاتی نظام سے مُراد

اس سوال کے جواب کے لیے آئیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ طبقاتی نظام سے مراد کیا ہے؟ اس کے بعد ہی ہم اس کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھ سکیں گے اور یہ جان سکیں گے کہ آیا اسلام کے نزدیک یہ جائز ہے یا ناجائز۔

یورپی معاشرے کے تین قدیم طبقات

عہدِ وسطیٰ کا یورپ تین طبقات میں واضح طور پر بٹا ہُوا تھا: طبقۂ اشراف، پادری اور عوام۔ جہاں تک پادریوں کے گروہ کا تعلق تھا، ان کی امتیازی علامت ان کا لباس تھا۔ قوت اور اقتدار کے لحاظ سے یہ گروہ بڑے بڑے بادشاہوں، بلکہ شہنشاہوں تک کا حریف تھا؛ چنانچہ کلیسا کا سربراہ پوپ بادشاہوں کا تقرر یا تنزل اپنا حق خیال کرتا تھا۔ یہ صورتحال

ان بادشاہوں کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی؛ چنانچہ انہوں نے کلیسا اور پوپ کے اقتدار سے آزاد ہونے کی ہر ممکن کوشش کی۔ کلیسا کے مالی وسائل کا یہ عالم تھا کہ ان کے بل پر وہ اپنی باقاعدہ فوج بھی رکھ سکتا تھا۔

رہ گیا طبقۂ اشراف، تو اس کے افراد کو شرافت و نجابت باپ دادا سے ورثے میں ملتی تھی۔ اس کا کوئی تعلق ان کے ذاتی اعمال یا اخلاق سے نہیں تھا۔ ان کے نزدیک شرفا پیدائشی طور پر شریف ہوتے تھے اور کسی کمینہ سے کمینہ حرکت یا بُرے سے بُرے فعل کے ارتکاب کے بعد بھی وہ شریف رہتے تھے اور اس سے ان کی پیدائشی شرافت پر کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔

قانون سازی پر اجارہ داری

دورِ جاگیرداری میں اس طبقۂ اشراف کو اپنی جاگیروں میں بسنے والوں پر مطلق العنان اختیارات حاصل تھے۔ وہی تمام عدالتی اور انتظامی اختیارات کا مالک تھا اور اس کی خواہشات اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو قانون کا مرتبہ حاصل تھا۔ اس زمانے میں جو نمائندہ مجالس تھیں وہ بھی اسی طبقے کے افراد پر مشتمل ہوتی تھیں، جس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ یہ لوگ جب قانون سازی کرتے تھے، اس میں بھی ان کے پیشِ نظر اپنی ذات، اپنی مراعات اور اپنے مفادات کا تحفظ رہتا تھا جنہیں ان لوگوں نے ایک ایسے تقدس کا رنگ دے رکھا تھا کہ ان کو پامال کرنے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

عوام کی حالتِ زار

جہاں تک عوام کے طبقے کا تعلق تھا، اس کو نہ کوئی مراعات حاصل تھیں اور نہ حقوق ہی سے وہ پوری طرح بہرہ ور تھا، بلکہ افلاس، غلامی اور ذلت باپ دادا سے اسے ورثے میں ملتی تھی اور وہ بھی ورثہ آنے والی نسلوں کو منتقل کرتا چلا آتا تھا۔

بورژوا طبقہ کی پیدائش

بعد میں جو نمایاں اقتصادی ترقی ہوئی، اس کے نتیجے میں بورژوا طبقہ عالمِ وجود میں آیا

اور بتدریج اسی مقام اور اہمیت کا حامل بن گیا، جو زمانۂ قدیم کے طبقۂ اشراف کی خصوصیت تھی۔ اسی طبقے کی قیادت میں عوام نے انقلابِ فرانس برپا کیا جس نے بظاہر طبقاتی تفریق کا خاتمہ کر دیا اور دُنیا کو حریت، اخوت اور مساوات کے نعرے عطا کیے۔

دورِ جدید کے سرمایہ دار

دورِ جدید میں پُرانے طبقۂ اشراف کی جگہ اب سرمایہ داروں کے طبقے نے لے لی ہے۔ یہ تبدیلی ایک غیر محسوس طریقے سے آئی اور اپنے ساتھ اقتصادی ترقی کے نتیجے میں رونما ہونے والی بہت سی اور تبدیلیاں بھی لائی، لیکن اس ساری اکھاڑ پچھاڑ میں بنیادی اصول میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی؛ چنانچہ اب بھی مال و دولت، قوت اور اقتدار سب کچھ سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں ہے اور وہ جیسے چاہتا ہے حکومت کی مشینری کو استعمال کرتا ہے۔ جمہوری ممالک کے انتخابات میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو پوری پوری آزادی حاصل ہے، مگر یہاں بھی بعض چور دروازے ایسے ہیں جن کے ذریعے سرمایہ دار پارلیمنٹوں اور حکومت کے دفاتر پر قابض ہو کر ہر جائز و ناجائز ذریعے سے اپنے مذموم مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔

برطانیہ

اس سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ دورِ جدید میں جمہوریت کے سب سے بڑے سرپرست خود برطانیہ میں ابھی تک دارالاُمراء کے نام سے ایک ایوانِ بالا موجود ہے۔ وہاں اب بھی زمانۂ قدیم کا ایک ایسا جاگیر دارانہ قانون رائج ہے جس کی رو سے ایک جاگیردار کی وفات کے بعد اس کی ساری جائیداد اس کے بڑے بیٹے کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ اس قانون کا واضح مقصد جاگیر اور جائیداد کو چند مخصوص ہاتھوں تک محدود رکھنا ہے تاکہ خاندان کی جائیداد اور دولت ایک ہی جگہ مرکوز رہے اور عہدِ وسطیٰ میں جاگیرداروں کو جو معاشرتی مقام حاصل تھا، وہ خاندان میں قائم رہے۔

طبقاتی نظام کی بنیاد

طبقاتی نظام کی بنیاد دراصل اس غلط مفروضے پر قائم ہے کہ دولت ہی دراصل قوت ہے' اس لیے جس طبقے کے پاس دولت ہوتی ہے' لازماً وہی سیاسی قوت کا بھی مالک ہوتا ہے۔ ملک کی قانون سازی میں اسی کا عمل دخل ہوتا ہے' اور وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ایسے قوانین بناتا ہے' جن کا منشاء خود اس کے اپنے مفادات کا تحفظ اور دوسرے طبقات کو ان کے تمام قانونی حقوق سے محروم کر کے اپنے تابع رکھنا ہوتا ہے۔

طبقاتی نظام کی اس تعریف کی روشنی میں پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں اس طرح کے کسی طبقاتی نظام کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ کبھی ایسا طبقاتی نظام اسلامی تاریخ میں پایا گیا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت مندرجہ ذیل حقائق سے بھی ہوتی ہے:

ارتکازِ دولت کا انسداد

اسلامی قوانین میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس کا مقصد مال و دولت کو چند مخصوص افراد تک محدود رکھنا ہو۔ قرآنِ حکیم میں صاف اور واضح الفاظ میں ارشاد موجود ہے کہ:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ	تاکہ دولت تمہارے دولتمندوں میں
الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ	ہی گردش نہ کرتی رہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جو قوانینِ حیات وضع کیے' ان کا مقصد یہ ہے کہ دولت کو مسلسل تقسیم اور گردش میں رکھا جائے۔ اسلام کے قانونِ وراثت کے مطابق ہر مرنے والے کا ترکہ اس کے تمام ورثاء میں خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو' تقسیم ہونا چاہیے۔

اسلام میں وراثت کا حقدار کوئی ایک فرد نہیں ہوتا' سوائے ان استثنائی حالات کے جبکہ مرنے والے کا اور کوئی بھائی بہن یا رشتہ دار موجود نہ ہو' مگر ان استثنائی حالات میں بھی اسلام نے اس امر کا انتظام کیا ہے کہ ساری دولت اور جائیداد کا مالک ایک ہی شخص

نہ بن بیٹھے، بلکہ اس میں دوسرے مستحقین کے لیے بھی کچھ حصّہ نکالا جائے، جو مرنے والے سے کسی قسم کی قرابت داری کا تعلق نہیں رکھتے۔ موجودہ زمانے میں جو وراثت ٹیکس پایا جاتا ہے، یہ اسی کی ایک ابتدائی شکل ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى	اور جب (وارثوں میں ترکہ کی) تقسیم کے
وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ	وقت (دور کے) رشتہ دار آ موجود ہوں اور
وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا	یتیم اور غریب لوگ تو ان کو بھی اس (ترکہ)
(النساء: ۸)	میں سے کچھ دے دو اور ان کے ساتھ بھلائی کی بات کرو۔

یوں اسلام نے ارتکازِ دولت سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا۔ اسلام کے قانونِ وراثت کی رُو سے جائیداد کسی خاص طبقے کو ورثے میں نہیں ملتی، بلکہ میّت کے ورثاء میں تقسیم ہوتی ہے اور ان کے بعد یہی دولت اور جائیداد آگے ان کے ورثاء میں تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے؛ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں دولت کبھی چند افراد کے پاس محدود نہیں رہی، بلکہ پُورے معاشرے میں مسلسل گردش کرتی رہی ہے۔

قانونی ترجیحات کا خاتمہ

اسلام کا یہ مزاج اس کی ایک اور اہم خصوصیت کی جانب ہماری رہنمائی کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں قانون سازی کا حق محض ایک خاص طبقے تک ہی محدود نہیں ہے۔ اسلامی نظام میں کوئی شخص اپنی مرضی سے کوئی قانون بنانے کا حق نہیں رکھتا، کیونکہ اسلام سب انسانوں کو ایک ہی الہامی قانون کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ جو خدا کا نازل کردہ ہے اور جو انسانوں میں کسی قسم کی تفریق کا روادار نہیں۔

غیر طبقاتی معاشرہ

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک غیر طبقاتی معاشرہ ہوتا ہے، کیونکہ طبقات

کی موجودگی اور قانونی ترجیحات کا آپس میں گہرا تعلق ہے، جہاں قانونی ترجیحات موجود نہ ہوں اور کوئی طبقہ اپنے حسب منشاء قانون سازی کر کے اپنے مفادات کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچانے پر قادر نہ ہو، وہاں طبقاتی امتیازات بھی نہیں ہوتے۔

آیاتِ قرآنی کا صحیح مفہوم

اب آیئے ذرا ان دو آیات کا صحیح مطلب سمجھنے کی کوشش کریں جو اس باب کے آغاز میں درج ہیں، اور جن کا سرسری مطالعہ بعض ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ۔	اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے۔
وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ۔	اور ہم نے ایک کو دوسرے پر درجات میں رفعت دے رکھی ہے۔

ان میں محض ایک واقعہ بیان ہوا ہے

ان آیات میں محض ایک امر واقعہ بیان کیا گیا ہے، جو کسی بھی اسلامی یا غیر اسلامی نظام میں پیش آسکتا ہے۔ ان میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ صرف اتنا ہے کہ انسانوں میں رزق اور رتبے کے لحاظ سے امتیازات موجود ہیں۔ روس ہی کی مثال لیجیے۔ کیا وہاں پر سب لوگوں کو ایک جیسی اُجرتیں دی جاتی ہیں یا کچھ لوگوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اُجرتیں ملتی ہیں؟ کیا فوج میں بھرتی ہونے والے سبھی فوجیوں کو ایک جیسے عہدے دیے جاتے ہیں یا بعض کو دوسروں پر برتری حاصل ہوتی ہے؟ اگر یہ فرقِ مراتب وہاں بھی موجود ہے، تو اس کی وجہ انسانوں میں پائے جانے والے ناگزیر امتیازات کے سوا اور کیا ہے؟ اُوپر کی آیات میں ان امتیازات کی موجودگی کی کوئی خاص وجہ نہیں بتائی گئی اور نہ یہ بتایا گیا کہ ان کی اساس دولت ہے، اشتراکیت ہے یا اسلام ہے۔ اس طرح یہ اس بارے

میں بھی خاموش ہیں کہ یہ ترجیحات (یا امتیازات) اسلامی معیار کے لحاظ سے منصفانہ ہیں یا غیر منصفانہ۔ اس سے قطع نظر ان آیات میں یہ بات صرف امر واقعہ کے طور پر بیان کی گئی ہے کہ اس طرح کے امتیازات دُنیا میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، خدا کو اس کا بخوبی علم ہے۔

ایک اہم فرق

اب تک یہ حقیقت واضح ہو جانی چاہیے کہ اسلامی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں طبقات نہیں پائے جاتے اور نہ قانونی امتیازات ہی اس میں ملتے ہیں۔ مال و دولت کے لحاظ سے لوگوں میں جو فرق پایا جاتا ہے اُسے طبقاتی نظام کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جب تک دُنیاوی سازوسامان اور جائیداد کا یہ فرق کسی قانونی یا انفرادی ترجیحات کی صورت میں ظاہر نہ ہو، اس وقت تک اس کے نتیجے میں کوئی طبقات وجود پذیر نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر قانون کی نگاہ میں سب انسان نظریاتی طور پر نہیں، بلکہ واقعاتی دُنیا میں بھی برابر ہوں، تو مال و دولت کا یہ فرق بھی طبقاتی امتیازات کی صورت میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔

یہاں پر یہ امر بھی واضح رہے کہ اسلام نے افراد کو زمین کی ملکیت کا جو حق دیا ہے اس کے نتیجے میں زمین کے مالکوں کو ایسے خصوصی حقوق یا مراعات حاصل نہیں ہوتیں، جن کے بل پر وہ دوسروں کو غلام بنائیں یا انہیں اپنے مقاصد کا آلۂ کار بنا سکیں۔ اگر صحیح اسلامی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام کا ظہور ہوتا، تو وہاں بھی یہی صورتِ حال پیش آتی، کیونکہ اسلام میں حکمران کے اختیاراتِ حکمرانی سرمایہ دار طبقے کی حمایت کے مرہونِ منت نہیں ہوتے، بلکہ پوری قوم کی حمایت اور انتخاب کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور اسلامی حکمران کا فرض احکامِ ربانی کو بجا لانا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دُنیا میں کوئی ایسا معاشرہ موجود نہیں ہے، جس کے سارے افراد دولت کے لحاظ سے آپس میں برابر ہوں۔ اشتراکی معاشرے میں بھی یہ مساوات مفقود ہے۔ اگرچہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے سارے

طبقات کو مٹا دیا ہے۔ اس کا سارا کارنامہ بس اتنا ہے کہ اس نے چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو ختم کر کے حکمرانوں کے ایک نئے طبقے کو پیدا کر دیا ہے' جس نے دوسرے تمام طبقات کو نیست و نابود کر دیا ہے۔

اسلام اور صدقات

اشتراکی اور سامراج زدہ اصحاب اسلام پر ایک یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ وہ عوام کو امیروں کی خیرات پر جینا سکھاتا ہے' اور ان سے خود اپنی قوتِ بازو کے سہارے جینے کا حوصلہ چھین لیتا ہے۔ اسلام پر ان لوگوں کی اس تہمت کی وجہ ان کی غلط فہمی ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ زکوٰۃ ایک ایسی خیرات ہے' جو امیر لوگ احسان کے طور پر غریبوں میں بانٹتے ہیں۔

زکوٰۃ اور خیرات میں فرق

اس الزام کی حقیقت جاننے کے لیے ہمیں سب سے پہلے خیرات اور زکوٰۃ کے باہمی فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہوگا۔ خیرات ایک رضاکارانہ فعل ہے' جس پر کوئی قانون یا حکومت کسی کو مجبور نہیں کر سکتی' لیکن اس کے برعکس زکوٰۃ ایک قانونی حکم ہے' جو لوگ اس کی ادائیگی سے انکار کریں' اسلامی حکومت ان کے خلاف جنگ کرتی ہے۔ اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو انہیں سزائے موت دیتی ہے' کیونکہ یہ لوگ اپنے اس انکار کے بعد مسلمان نہیں رہتے' مرتد قرار پاتے ہیں۔ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ خیرات کے معاملے میں اسلامی حکومت اس طرح کا سخت رویّہ اختیار نہیں کرتی' بلکہ ایسے لوگوں کے جذبۂ خیر اور ان کی صوابدید پر چھوڑ دیتی ہے۔

پہلا باقاعدہ ٹیکس

مالیات کے نقطۂ نظر سے الزکوٰۃ پہلا باقاعدہ ٹیکس تھا' جو دُنیا میں کسی قوم پر عائد

کیا گیا۔ اس سے پیشتر ٹیکسوں کے لیے کوئی ضابطہ یا قانون مقرر نہ تھا' بلکہ حکمران اپنی مرضی اور خواہش سے ان کا تعین کرتے تھے۔ ان کی وصولی بھی حکمرانوں کی ذاتی امنگوں، مصلحتوں اور ضرورتوں کے تابع ہوتی تھی۔ ان ٹیکسوں کا اصل بلکہ سارا بوجھ امیروں کے بجائے غریبوں پر ہوتا تھا۔ اسلام نے آکر ٹیکسوں کی وصولی کا ایک باقاعدہ نظام قائم کیا' اور عام حالات کے لیے ایک انتہائی فیصد نسبت مقرر کر دی۔ اس نے یہ ٹیکس امیروں اور متوسط طبقے پر عائد کیے اور غریبوں کو ان کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا۔

اسلامی حکومت کا خزانۂ عامرہ

اسلام میں خود ریاست غریبوں میں زکوٰۃ تقسیم کرتی ہے' نہ کہ امیر لوگ بطور خود ایسا کرتے ہیں۔ گویا زکوٰۃ ایک ایسا ٹیکس ہے جو حکومت وصول کرتی ہے' اور وہی عوام میں اس کو تقسیم بھی کرتی ہے۔ اسلامی نظام میں خزانۂ عامرہ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو موجودہ حکومتوں میں وزارتِ خزانہ کی ہے' جو ایک طرف تو عوام سے مالیہ اور ٹیکس وصول کرتی ہے' اور دوسری طرف ان کی آسائش و بہبود کی ذمہ دار ہوتی ہے' اور ان تمام لوگوں کی کفالت بھی کرتی ہے' جو اپنی روزی آپ کمانے کے قابل نہیں ہوتے یا جن کے ذرائع آمدنی محدود اور ناکافی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ریاست ان معذوروں اور مستحقین کی مدد خیرات یا احسان کے طور پر نہیں کرتی کہ اس کا قبول کرنا' لینے والوں کی تحقیر و تذلیل کا موجب ہو۔ اگر حکومت کے ریٹائرڈ ملازمین کو' جو ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی حکومت سے پنشن پاتے ہیں' اور ان کاریگروں کو' جو اجتماعی بہبود کی اسکیموں سے فائدہ اٹھاتے ہیں' یہ طعنہ نہیں دیا جا سکتا کہ وہ امیروں سے خیرات پا رہے ہیں' تو ان بے بس بچوں اور معذور بوڑھوں کے متعلق جو اپنی روزی آپ نہیں کما سکتے' یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھیک کے طور پر حکومت سے امداد پاتے ہیں۔ اگر حکومت ان لوگوں کی معذوری کے پیشِ نظر ان کی مالی اعانت کرتی ہے' تو اس سے ان لوگوں کی بے عزتی یا سبکی نہیں ہوتی' کیونکہ ان کی امداد و اعانت تو ریاست کے انسانی فرائض میں شامل ہے۔

اجتماعی بہبود کا نظام اور اسلام

آج کل اجتماعی بہبود کے تحفظ کا جو نظام رائج ہے، وہ انسانیت کے صدیوں کے تلخ تجربے اور سماجی بے انصافی کی ایک طویل تاریخ کے بعد اپنایا گیا ہے۔ اسلام کی عظمت و برتری کی ایک بہت بڑی دلیل اجتماعی بہبود کے اس نظام کو ایک ایسے دور میں رائج کرنا ہے، جب کہ یورپ سماجی لحاظ سے ابھی اندھیروں میں ٹامک ٹوئیے مار رہا تھا، مگر جو لوگ مشرق یا مغرب سے مستعار لیے ہُوئے نظاموں کی تعریف و توصیف کرتے ہُوئے نہیں تھکتے، ان کی ذہنی غلامی کا یہ عالم ہے کہ اگر اسلام ان کے پسندیدہ کسی نظام کو اپنا لے تب بھی اسلام سے ان کی بدظنی دُور نہیں ہوگی، بلکہ وہ اپنے ان محبوب نظاموں کو بھی وحشت اور رجعت پسندی کی پیداوار قرار دینے لگیں گے۔

زکوٰۃ کی تقسیم اور اسلام

اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں اُس وقت کے مخصوص حالات کے پیش نظر مستحق لوگوں کے خود جا کر نقد یا جنس کی صورت میں زکوٰۃ وصول کرنے کو روا رکھا تھا، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام کے نزدیک زکوٰۃ کی تقسیم کا یہی واحد طریقہ ہے کہ مستحقین خود جا کر زکوٰۃ وصول کرتے پھریں۔ اور کوئی دوسرا طریقہ اختیار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی قانون میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے، جس سے ایسا نتیجہ نکالا جا سکے۔ اسلام زکوٰۃ کے روپے سے عوامی بہبود کے ادارے مثلاً اسکول اور ہسپتال قائم کرنے سے نہیں روکتا، اور نہ اس کو اس کے روپے سے امدادِ باہمی کی انجمنوں اور کارخانوں کی تعمیر پر ہی کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر زکوٰۃ کی رقم سماجی بہبود کے سارے مفید کاموں پر صرف کی جا سکتی ہے۔ زکوٰۃ کے مال میں سے نقد امداد صرف بیماروں، بُوڑھوں اور بچوں کو دی جاتی ہے، لیکن دوسرے تمام لوگوں کی امداد ان کے لیے روزگار فراہم کرنے یا ان کی بھلائی کے کسی منصوبے کی تکمیل کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ اسلامی معاشرہ

ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں محض زکوٰۃ پر گزارہ کرنے والے کسی غریب طبقے کا کوئی مستقل وجود نہیں پایا جاتا۔

اسلامی معاشرے کا مثالی دَور

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کا زمانۂ خلافت بھی اسلامی معاشرے کا مثالی دَور تھا۔ اس دَور میں لوگوں کی خوشحالی کا یہ حال تھا کہ زکوٰۃ جمع کر کے حکام مستحقین کو ڈھونڈتے تھے، مگر انہیں کوئی اس کا لینے والا نہ ملتا تھا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کے ایک عاملِ زکوٰۃ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں: "حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے مجھے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے افریقہ بھیجا۔ میں نے زکوٰۃ جمع کر کے غریبوں کی تلاش کی، مگر مجھے کوئی غریب نہ ملا اور نہ کوئی اور مستحق ملا، جو اسے لیتا، کیونکہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے لوگوں کو خوشحال بنا دیا تھا۔"

بلاشبہ ہر معاشرے میں غریب بھی ہوتے ہیں اور ضرورت مند بھی، اس لیے ان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ضروری قانون کی موجودگی ناگزیر ہے۔ اسلام کو وقتاً فوقتاً جن قوموں سے واسطہ پڑتا رہا ہے، وہ مادی ترقی و دولت کے لحاظ سے مختلف مراحل میں تھیں۔ اس لیے یہ بالکل فطری امر تھا کہ وہ ایک ایسا قانون وضع کرتا، جس کے نتیجے میں بتدریج حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کا سا مثالی معاشرہ وجود میں آ جاتا۔

صدقات کی حقیقت

یہ ہے زکوٰۃ اور اس کی حقیقت۔ اس کے برعکس جہاں تک صدقات اور خیرات کا تعلق ہے، وہ دراصل اُس دولت کا نام ہے، جو امیر اور خوشحال لوگ اپنی خوشی سے خیرات کرتے ہیں۔ اسلام نے صدقات اور خیرات کو پسندیدہ قرار دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ خیرات مختلف طریقوں سے دی جا سکتی ہے۔ یہ اپنے والدین اور اعزہ و اقربا کی اعانت کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے اور عام ضرورت مندوں کی حاجت روائی کی شکل میں بھی۔ یہی نہیں بلکہ اچھے اعمال اور مہربانی کے کلمات بھی صدقہ بن سکتے ہیں۔

صدقات کی رُوح

اگر ہم اپنے اعزہ واقرباء سے ہمدردی کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس سے ان کے جذبات یا احترام نفس کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچ سکتی۔ اپنے اعزہ واقرباء سے اس طرح کا فیاضانہ سلوک تو محبت، ہمدردی اور شفقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو تحفہ دیتا ہے یا اپنے عزیزوں کو دعوت پر بلاتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ ان کی توہین نہیں کرتا کہ بعد میں اسے ان کی نفرت اور مخالفت کا نشانہ بننا پڑے۔

زکوٰۃ بصورت جنس

جہاں تک مستحقین کو اجناس کی صورت میں دیئے جانے والے صدقات کا تعلق ہے تو اس کے لیے بھی وہی اصول اور قانون تھا، جو اسلام کے ابتدائی دور میں زکوٰۃ کیلیے مقرر تھا۔ اس وقت حالات ایسے تھے کہ ان میں اجناس کی صورت میں تحائف کو اسلام نے ضرورت مندوں کی حاجت براری کا ایک جائز ذریعہ قرار دیا، مگر اسلام کا کوئی اصول ایسا نہیں ہے کہ جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ خیرات صرف اسی ایک طریقے سے دی جاسکتی ہے، بلکہ یہ خیرات ایسے اجتماعی ادارے اور تنظیمیں بھی وصول کرسکتی ہیں جو معاشرتی بہبود کے لیے کام کر رہی ہوں۔ اسی طرح زکوٰۃ اسلامی ریاست کو بھی مختلف اجتماعی منصوبوں اور اسکیموں کی تکمیل کے لیے اجتماعی منصوبوں اور اسکیموں کی تکمیل کے لیے دی جاسکتی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب تک معاشرے میں غریب موجود ہیں، مملکت ہر ممکن ذریعے سے ان کے لیے زندگی میں زیادہ سے زیادہ آسانیاں فراہم کرے، مگر اسلام یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ معاشرے میں غریبوں اور محتاجوں کا کوئی مستقل طبقہ پیدا ہو جائے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں کوئی محتاج اور غریب نہ رہے؛ چنانچہ اسلام کے مثالی معاشرے میں صدقہ اور زکوٰۃ لینے والوں کو تلاش کیا جاتا ہے، پھر بھی کوئی ان کا لینے والا نہیں ملتا؛ چنانچہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کا اسلامی معاشرے کی اسی خصوصیت

کا آئینہ دار ہے کہ اس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی محتاج نہیں ملتا تھا۔ جب یہ صورت رونما ہوگی تو زکوٰۃ اور صدقات کا روپیہ اجتماعی بہبود اور ان لوگوں کی دیکھ بھال پر صرف کیا جائے گا' جو کسی وجہ سے اس قابل نہیں رہے کہ اپنی روزی کما سکیں۔

یہ احسان نہیں ادائیگی فرض ہے

اسلام نے مسلمانوں کو خیرات و صدقات پر انحصار کرنا نہیں سکھایا، البتہ اسلامی مملکت پر یہ ذمہ داری ضرور عائد کی ہے کہ وہ اپنے ان تمام شہریوں کے لیے آبرومندانہ زندگی کی سہولتیں فراہم کرے' جو اپنی روزی نہیں کما سکتے۔ گویا ان لوگوں کی مدد کر کے اسلامی ریاست ان پر کوئی مہربانی یا احسان نہیں کرتی' بلکہ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔

فراہمی روزگار اور اسلامی حکومت

مزید برآں اسلامی مملکت پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ کام کے اہل تمام افراد کو روزگار فراہم کر کے دے۔ مملکتِ اسلامی کی اس ذمہ داری کا اظہار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بخوبی ہو جاتا ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ ایک آدمی آنحضورؐ کے پاس آیا' اور آپؐ سے گزربسر کے لیے مدد کا سوال کیا۔ آنحضورؐ نے اس کو ایک کلہاڑی اور ایک رسی دی اور حکم دیا کہ وہ جنگل میں جا کر لکڑیاں جمع کرے' اور ان کو بیچ کر گزارہ کرے۔ آپؐ نے اس کو ہدایت بھی کی کہ وہ کچھ عرصہ بعد آپؐ کو اپنی حالت کی خبر دے۔

ممکن ہے بعض خود غلط فہم کے لوگ اس حدیث کو محض ایک انفرادی معاملہ کہہ کر ٹال دیں' جس کا موجودہ بیسویں صدی سے کوئی تعلق نہیں' کیونکہ اس حدیث میں کلہاڑی' رسی اور محض ایک بے کار آدمی کا تذکرہ ہے' جبکہ جدید دور میں ہمارا واسطہ بڑے بڑے کارخانوں' لاکھوں بے کار مزدوروں' منظم حکومتوں اور ان کے مستعد شعبوں سے ہے' مگر اس طرح کی باتیں کرنا محض حماقت ہوگی' کیونکہ پیغمبر اسلامؐ کا یہ کام نہیں تھا کہ آپؐ ہزاروں برس پیشتر جبکہ کارخانوں کا دنیا میں کہیں وجود ہی نہ تھا' ان کو اپنا موضوع سخن بناتے یا ان سے پیدا ہونے

ڈلے مسائل کےلیے قانون سازی کرتے۔ اگر آپؐ ایسا کرتے تو اس وقت کا کوئی آدمی آپؐ کی بات نہ سمجھ سکتا۔

یہ طریقہ اختیار کرنے کے بجائے شارعؑ اسلام نے قانونِ حیات کی بنیادوں کو متعیّن کرنے پر اکتفا کیا اور زندگی کے عملی مسائل میں ان کے انطباق کے معاملے کو آپؐ نے آنے والی نسلوں پر چھوڑ دیا، تاکہ وہ ان بُنیادی اصولوں کی روشنی میں تفصیلاتِ حیات خود طے کر سکیں۔

اسلامی حکومت کی فلاحی ذمہ داریاں

اُوپر جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے مملکتِ اسلامی کی مندرجہ ذیل بُنیادی ذمہ داریوں پر روشنی پڑتی ہے:

۱: پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی سربراہ مملکت اسلامی) کو یہ احساس تھا کہ بے روزگار آدمی کو روزگار مہیا کرنا آپؐ کی ذمہ داری ہے۔

۲: حضورؐ نے حالات کے مطابق اس آدمی کے لیے روزگار مہیا کیا۔

۳: آنحضور صلعم نے جب اس آدمی کو واپس آنے اور دوبارہ اپنے حالات سے مطلع کرنے کا حکم دیا، تو وہ بھی دراصل آپؐ کے اسی احساسِ ذمہ داری کا آئینہ دار تھا۔

سربراہِ مملکت کا یہ احساسِ ذمہ داری جس کا جلوہ اسلام نے دُنیا کو آج سے تیرہ صدی پیشتر دکھایا تھا، جدید ترین معاشی اور سیاسی نظریات سے پُوری طرح ہم آہنگ ہے۔

بہرحال اگر مملکتِ اسلامی بے کار شہریوں کو روزگار مہیا نہ کر سکے، تو خزانۂ عامرہ پر یہ ذمہ داری آن پڑتی ہے کہ وہ ان کی معاشی حالت کے سدھرنے تک ان کی کفالت کرے، کیونکہ مُسلمان تو خواہ ان کا اپنا معاملہ ہو، یا ریاست اور دوسرے شہریوں کا، سب کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتے آئے ہیں!!

اسلام اور عورت

مشرق میں آج کل عورت کے حقوق اور مردوں کے ساتھ اس کی کامل مساوات کے متعلق زور شور سے بحث جاری ہے۔ اس بحث میں حقوقِ نسواں کے سرگرم حامیوں میں سے وہ مرد اور عورتیں بالخصوص قابلِ ذکر ہیں' جو اسلام کے نام پر بعض انتہائی احمقانہ باتیں کہہ اور لکھ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو محض شرارتاً یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے ہر لحاظ سے مردوں اور عورتوں میں کاملِ مساوات ملحوظ رکھی ہے' اور بعض اپنی جہالت یا کم فہمی کے باعث یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام' عورت کا دشمن ہے' کیونکہ وہ اسے حقیر خیال کرتا ہے اور ذہنی لحاظ سے فرومایہ قرار دے کر معاشرے میں اس کو ادنیٰ مقام دیتا ہے' جس کے بعد اس میں اور دوسرے جانوروں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ عورت' مرد کی حیوانی خواہشات کی تسکین کا محض ذریعہ اور بچے پیدا کرنے کی ایک مشین بن کر رہ جاتی ہے' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عورت کا معاشرتی مقام مرد سے بہت پست ہے؛ چنانچہ مرد' عورت کا حاکم بن بیٹھتا ہے اور زندگی کے ہر میدان میں اس پر اپنی بالادستی کی دھونس جمالیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں گروہ یکساں طور پر اسلام کے متعلق جہالت میں مبتلا ہیں۔ یا پھر یہ لوگ جان بوجھ کر دوسروں کو دھوکا دینے کی خاطر حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کرتے ہیں' تاکہ معاشرے میں انتشار اور ابتری پھیلے' اور اس طرح ان کے مذموم مقاصد کی تکمیل کیلئے راہ ہموار ہو سکے۔

یورپ کی تحریک آزادیٔ نسواں

اسلام میں عورت کے مقام پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے ہم یورپ کی تحریک آزادیٔ

نسواں (EMANCIPATION MOVEMENT) کی تاریخ کا ایک طائرانہ جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ جدید مشرق میں پائے جانے والے تمام منحرف رجحانات کا سرچشمہ یہی تحریک ہے۔

عہدِ قدیم میں عورت کی حیثیت

قدیم یورپ بلکہ دُنیا بھر میں عورت کو کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں تھی۔ قدیم علماء اور "فلاسفہ" عرصۂ دراز تک اس کے بارے میں کچھ اس قسم کے موضوعات پر سر کھپاتے رہے کہ کیا عورت میں بھی رُوح ہوتی ہے؟ اگر اس میں رُوح ہوتی ہے، تو یہ انسانی رُوح ہے یا حیوانی روح؟ اور اگر انسانی روح ہے، تو مَرد کے مقابلے میں اس کا صحیح معاشرتی مقام کیا ہے؟ کیا عورت پیدائشی طور پر ہی مَرد کی غلام ہے یا غلام سے اس کا مقام کچھ اُونچا ہے؟

یونان اور روم

یہ صورتِ حال تاریخ کے ان قلیل وقفوں کے دوران میں بھی جُوں کی تُوں رہی جن میں بظاہر عورت کو معاشرے میں مرکزی اہمیت حاصل تھی، جیسا کہ قدیم یونان اور روما میں نظر آتا ہے، مگر عورت کی یہ ساری قدر و منزلت اس کی نسوانیت کی قدر و منزلت ہرگز نہ تھی، نہ اس کا مطلب بحیثیتِ مجموعی پورے طبقۂ نسواں کی عزّت و احترام تھا، بلکہ یہ بات بڑے بڑے شہروں میں رہنے والی چند نمایاں عورتوں کی تعظیم و تکریم تک ہی محدود تھی، جو اپنے بعض ذاتی اوصاف کی وجہ سے معاشرتی تقریبات کی روحِ رواں تھیں۔ ان کی حیثیت بگڑے ہُوئے اور عیاش طبقے کے لیے محض ایک ذریعۂ تفریح کی تھی؛ چنانچہ وہ ان کی دِل کھول کر حوصلہ افزائی کرتا تھا، مگر یہ عورت کی بحیثیت انسان تعظیم و تکریم نہ تھی کیونکہ اس کا تمام تر انحصار اس بات پر تھا کہ عورت مرد کے لیے کہاں تک عیش و مسرت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

جاگیرداری دَور میں

یورپ میں عورت کی یہ حیثیت زرعی غلامی (SERFDOM) اور جاگیرداری دَور میں

بھی برقرار رہی۔ اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے وہ بار بار زندگی کی ظاہری چکاچوند سے فریب کھاتی رہی۔ اور یہ سوچ کر کہ زندگی بس اسی کا نام ہے، اس نے محض کھانے پینے، بچے پیدا کرنے اور دن رات جانوروں کی طرح کام میں جتے رہنے کو اپنا وظیفۂ حیات سمجھ لیا۔

جب یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہُوا، تو یہ عورت کے لیے بدترین مصائب و آلام کا پیغام ثابت ہُوا۔ اب کے اسے جن مصائب و آلام میں مبتلا ہونا پڑا انہوں نے پچھلی ساری داستانِ ظلم و ستم کو مات کر دیا۔

یورپ کا جو مجموعی مزاج اب تک سامنے آیا ہے، وہ کچھ ایسی کجی اور سنگدلی سے مرکب ہے کہ جس کی وجہ سے وہ فیاضی اور خلوص دونوں صفات سے عاری نظر آتا ہے۔ اس نے ہر جگہ انسانوں کو شدید مصائب و آلام سے دوچار کیا، مگر اس کے عوض انہیں کبھی کوئی فوری یا دُور رس مادی فوائد عطا نہ کیے، بہرحال غلامی اور جاگیرداری کے ادوار میں حالات کچھ اس قسم کے تھے اور مروج زراعتی نظام اس طرح کا تھا کہ اس میں مَرد ہی کو عورت کے اخراجات کا بار بھی اُٹھانا پڑتا تھا۔ یہ اس زمانے کے حالات اور مزاج کے عین مطابق تھا، مگر اس وقت بھی عورت بعض گھریلو صنعتوں میں حصّہ لیتی تھی، جو ہر زراعتی معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ ان گھریلو صنعتوں کے ذریعہ گویا عورت مَرد کو ان اخراجات اور مالی بار کا معاوضہ چکا دیتی تھی، جو وہ اس کی وجہ سے برداشت کرتا تھا۔

صنعتی انقلاب کے بعد

مگر صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی کیا شہر اور کیا دیہات سب جگہ صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ خاندانی زندگی بالکل تباہ ہو گئی۔ اور خاندان کے افراد کو جوڑنے والا رشتہ بھی ختم ہو گیا، کیونکہ صنعتی انقلاب کی لائی ہُوئی تبدیلی کے بعد مَردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچّوں کو بھی گھر چھوڑ کر کارخانوں کی راہ لینی پڑی، تاکہ ملازمت کر کے اپنا پیٹ پال سکیں۔ مزدوری پیشہ طبقے رفتہ رفتہ دیہات کو خیرباد کہہ کر شہروں میں آنے لگے۔ دیہات کی زندگی میں باہمی ذمہ داری اور تعاون و اشتراک کی رُوح پائی جاتی تھی، مگر اب جس شہری زندگی سے دوچار ہُوئے، اس میں

کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا، نہ کسی کو دوسرے لوگوں سے، حتیٰ کہ اپنے ہمسایوں سے کوئی دلچسپی تھی۔ ہر آدمی کی زندگی کا محور اس کی ذات تھی جس کے سوا اسے نہ کسی سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ وہ اپنے سوا کسی اور کا بوجھ برداشت کرنے کے لیے ہی تیار تھا۔ شہروں میں نہ کوئی اخلاقی اصول تھا، اور نہ کسی کو اخلاقی اصولوں کی پابندی کا خیال تھا؛ چنانچہ صنفی انارکی کی ایسی وبا پھیلی کہ مرد اور عورت اپنے جنسی جذبات کی تسکین کا جو موقع پاتے، اس سے بلا تکلف فائدہ اٹھاتے اور اخلاقی بندشیں منہ دیکھتی رہ جاتیں۔ اس کا ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں شادی کرنے اور گھر بسانے کی خواہش کمزور پڑ گئی، یا اگر کچھ لوگوں میں یہ خواہش باقی رہی، تو وہ بھی یہی چاہنے لگے کہ یہ مصیبت چند سال اور ٹل جائے، تو بہتر ہے[۱]۔

عورت کی مظلومی و محرومی

ان صفحات میں ہمارا مقصد یورپ کی تاریخ پر کوئی تفصیلی گفتگو کرنا نہیں ہے، بلکہ ہمیں صرف ان عوامل سے دلچسپی ہے جو یورپی تاریخ میں عورت کی تقدیر بنانے کے لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں؛ جیسا کہ ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں صنعتی انقلاب کی وجہ سے بچوں اور عورتوں پر معاش کی جو ذمہ داری آن پڑی تھی، اس سے خاندانی رشتہ کمزور پڑ گیا اور خاندانی

---

[۱] اسی قسم کی شہادت پر بھروسا کر کے مادہ پرست اور مارکسیت کے علمبردار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف اقتصادی حالات ہی سماجی حالات کو وجود میں لاتے ہیں اور انسانی روابط کو متعین کرتے ہیں۔ ہمیں انسانی زندگی میں معاشیات کی اہمیت سے انکار نہیں ہے، مگر یہ کہنا غلط ہے کہ انسانی خیالات، جذبات اور طرزِ عمل کو صرف اقتصادی عوامل ہی متعین صورت بخشتے ہیں۔ یورپ میں معاشیات کی جو اہمیت نظر آتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یورپ کے پاس کوئی اعلیٰ نصب العین نہ تھا، جو دنیائے اسلام کی طرح یورپ کو روحانی عظمتوں سے روشناس کرتا اور وہاں کے معاشی روابط کو خالص انسانی بنیادوں پر استوار کرنے میں مدد دیتا۔ اگر ایسا ہوتا، تو نہ صرف یورپ کے تمام مادی مسائل حل ہو جاتے، بلکہ باقی دنیا کے لوگ بھی اس کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس اور استحصال بےجا (EXPLOITATION) کا نشانہ نہ بنتے۔

زندگی مکمل طور پر انتشار کی نذر ہوگئی، مگر اس انقلاب میں سب سے زیادہ مظلوم ہستی عورت تھی۔ اس کو اب پہلے سے کہیں زیادہ شدید محنت کرنا پڑتی تھی، اس کا احترام اور وقار بھی رخصت ہو چکا تھا، اس کے باوجود نہ نفسیاتی طور پر آسودہ خاطر تھی اور نہ مادی لحاظ سے خوشحال۔ مرد نے نہ صرف یہ کہ عورت کا، خواہ وہ اس کی بیوی تھی یا ماں، مالی سہارا بننے سے انکار کر دیا، بلکہ اپنی روزی آپ کمانے کی ذمہ داری بھی الٹا اس کے سر پر ڈال دی تھی۔ اس کے باوجود وہ کارخانہ داروں کی بے انصافیوں کی شکار تھی۔ اس کو کام زیادہ کرنا پڑتا تھا، مگر معاوضہ مردوں کے مقابلے میں کہیں کم ملتا تھا۔

یورپی عورت کی مظلومی کی اصل وجہ

اگر یورپ کے معاشرتی مزاج کو جو بخل، سنگدلی اور محسن کشی سے عبارت ہے پیش نظر رکھا جائے، تو عورت کے ساتھ اس کے اس سلوک کی علت کو سمجھنا دشوار نہیں رہتا۔ اس نے کبھی انسان کو بحیثیت انسان عزت و احترام نہیں دیا اور نہ اس کے ہاتھوں کبھی کسی کا بھلا ہوا ہے، بلکہ جیسا کہ اس کا ماضی گواہ ہے، اس نے ہر موقع پر دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے، بشرطیکہ اس کے نتیجے میں خود اس کو کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ یورپ کے اس مزاج میں مستقبل میں بھی کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے، البتہ اگر خداوند تعالیٰ اس پر رحم کر کے اس کو صحیح راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما دے، اور اس کو روحانی پاکیزگی سے نواز دے، تو البتہ بہتری کی امید پیدا ہو سکتی ہے۔ بہرحال جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں کمزور بچوں اور عورتوں کو ظالم کارخانہ داروں نے بے تحاشا اپنے مظالم اور بے انصافیوں کا تختۂ مشق بنایا۔

سماجی مصلحین اور عورت

آبادی کے ان کمزور طبقوں پر اس ظلم و بے انصافی کو بعض باضمیر افراد زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے؛ چنانچہ انہوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ بچوں پر (جی ہاں بچوں

پر عورتوں پر نہیں) اس ظلم کے انسداد کی کوشش شروع کر دی۔ ان سماجی مصلحین نے چھوٹے بچوں کو کارخانوں میں ملازم رکھنے کی مخالفت کی، کیونکہ اس سے ان کی فطری نشو و نما رک جاتی تھی اور جو قلیل معاوضہ انہیں ملتا تھا، وہ ان کے مشکل اور غیر موزوں کام کے لحاظ سے ہرگز معقول نہ تھا۔ معاشرتی بے انصافی کے خلاف یہ احتجاج مؤثر ثابت ہوا؛ چنانچہ ملازمت کی عمر بتدریج بڑھا دی گئی، معاوضوں میں اضافہ کیا گیا، اور کام کے اوقات میں کمی کر دی گئی۔

مگر عورت اب بھی مظلوم تھی، کوئی اس کے حق میں آواز بلند کرنے والا نہ تھا اور نہ کسی کو اس کے حقوق کے تحفظ کی کوئی فکر تھی، کیونکہ اس کے لیے جس ذہنی پاکیزگی اور اخلاقی بلندی کی ضرورت ہے یورپ اس سے محروم تھا؛ چنانچہ عورت کی مصیبت کے ایام ختم نہ ہوئے۔ وہ دن رات محنت کرتی، تب کہیں جا کر اپنا پیٹ پال سکتی تھی، کیونکہ اسے جو معاوضہ ملتا تھا، وہ ویسا ہی کام کرنے والے مردوں کے معاوضے سے بھی بہت کم تھا۔

جنگِ عظیم کا اثر

پہلی جنگِ عظیم میں یورپ اور امریکہ کے لاکھوں مرد مارے گئے اور اپنے پیچھے لاکھوں بے خاوند عورتیں چھوڑ گئے، جنہیں انتہائی مصائب و شدائد سے دوچار ہونا پڑا۔ اب نہ کوئی ان کا سہارا تھا، اور نہ کوئی سر دھرا، جس کی حفاظت میں وہ زندگی بسر کر سکتیں۔ جو لوگ ان کے لیے زندگی کا سہارا تھے، ان میں سے کچھ تو مارے گئے تھے، کچھ عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے تھے، کچھ ایسے تھے کہ جنہیں خوف، اعصابی کھنچاؤ اور زہریلی گیسوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناکارہ بنا دیا تھا، اور کچھ کئی سال کی قید کاٹ کر تازہ تازہ قید خانوں سے رہا ہوئے تھے اور اپنے کھوئے ہوئے اعصابی توازن کو بحال کرنے کے لیے اپنے آپ کو دنیا کی دلچسپیوں میں گم کر دینا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے دلوں میں شادی کی کوئی خواہش موجود نہ تھی، کیونکہ شادی کر کے وہ اپنے آپ کو جسمانی اور مادی جھنجھٹوں میں مبتلا کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔

عورت کی بے بسی

جنگ کی وجہ سے مردوں کی تعداد میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا، اس کو بھرنا زندہ رہنے

والوں کے بس کی بات نہ تھی۔ مزدوروں اور کارکنوں کی کمی کے باعث کارخانوں کے کام پر بہت بُرا اثر پڑا، جس کی وجہ سے جنگ کے نقصانات کی تلافی بھی ناممکن ہوگئی، اس لیے عورتوں کو مجبوراً گھروں سے باہر نکلنا اور نکل کر مَردوں کی جگہ لینی پڑی، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتیں، تو وہ اور ان کے سارے متعلقین ــــ بوڑھی عورتیں اور چھوٹے بچے ــــ بھوک سے مَر جاتے، مگر کارخانوں میں جاکر کام کرنے کے نتیجے میں عورت کو اپنی سیرت و کردار اور اپنی نسائیت دونوں کی قربانی دینی پڑی، کیونکہ اب یہ اس کی "ترقی" میں سدِ راہ بن گئی تھیں۔ اور ان کی موجودگی میں اس کے لیے آزادانہ روزی کمانا مشکل ہوگیا تھا۔ دوسری طرف کارخانہ داروں کا یہ حال تھا کہ وہ صرف کام کرنے والے ہاتھ ہی نہیں چاہتے تھے، بلکہ اپنی شہواتِ نفسانی کا سامان بھی مانگتے تھے۔ عورت جس بے بسی سے دوچار تھی، اس کے ہوتے ہُوئے ان لوگوں کو اپنی حیوانی خواہشات کی تسکین کا سنہری موقع ہاتھ آگیا، جس سے انہوں نے خُوب خُوب فائدہ اُٹھایا۔ اس طرح اب عورت بیچاری کو دوہرے فرائض انجام دینے پڑے۔ ایک تو کارخانے میں مزدوری کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ کارخانہ دار کا دِل بہلانا۔ اب صرف بھوک ہی عورت کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ جنسی تسکین بھی اس کا ایک بڑا سنگین مسئلہ بن گئی تھی۔ جنگ میں مَردوں کی ایک کثیر تعداد کے ختم ہوجانے کی وجہ سے اب ہر عورت کے لیے شادی کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ جائز ذریعے سے اس کے تمام صنفی تقاضے پُورے ہوسکتے ــــ دوسری طرف یورپ میں جو مذہب رائج تھا، اس کی رُو سے جیسا کہ اس قسم کے ہنگامی حالات میں اسلام نے انتظام کیا ہے، کثرتِ ازواج کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بیچاری یورپی عورت اپنے بے رحم جذبات و خواہشات کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی۔ ایک طرف روزی کمانے کی فکر اور جنسی ناآسودگی اور دوسری طرف قیمتی کپڑوں، بناؤ سنگھار اور بننے ٹھننے کی خواہش۔ ان سب سے مغلوب ہوکر وہ ایک مخصوص ڈگر پر چل پڑی۔

یورپی عورت کا کام اب صرف یہ رہ گیا تھا کہ مَردوں کا دِل لبھائے، کارخانوں اور دُکانوں میں ملازمت کرے اور اپنی خواہشات ہر جائز و ناجائز ذریعے سے پُوری کرے مگر

اس کے پاس جس قدر سامانِ تعیش بڑھتا جاتا تھا، اسی قدر اس کی ہوس بھی بڑھتی جاتی تھی۔ جس کو پورا کرنے کا طریقہ صرف یہ تھا کہ وہ اپنے زیادہ سے زیادہ اوقات محنت مزدوری کے لیے وقف کر دے۔ کارخانہ داروں نے عورت کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اور صریح بے انصافی کا ارتکاب کرتے ہوئے مردوں کے مقابلے میں اس کے کام کا معاوضہ بہت کم رکھا تاکہ وہ خود زیادہ سے زیادہ نفع بٹور سکیں۔

ان حالات و واقعات کے نتیجے میں اس عظیم انقلاب کا رونما ہونا بالکل فطری امر تھا جس نے ظلم و بے انصافی پر مبنی اس صدیوں پرانے نظام کا خاتمہ کر دیا۔

معاشرتی انقلاب کے بعد

مگر اس انقلاب سے عورت کو کیا ملا؟ جسمانی لحاظ سے اب وہ پہلے سے بھی زیادہ تھکی ہوئی تھی، معاشرے میں اس کی کوئی عزت نہ تھی۔ اپنی نسائیت وہ کھو چکی تھی۔ اب نہ کوئی اس کا خاندان تھا، اور نہ بچے کہ جن کی خاطر قربانیاں دے کر اپنی شخصیت کو اور حقیقی آسودگی اور عظمت کو پا سکتی، مگر اس انقلاب کا ایک فائدہ ہوا، اور وہ یہ کہ اب اس کے لیے بھی مردوں کے مساوی اجرت کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ اور یہی وہ واحد فطری حق ہے جو اب تک یورپ، عورت کو دے سکا ہے۔

مگر یورپی مرد اتنی آسانی سے اپنی بالادستی سے دستبردار ہونے والا نہیں تھا۔ اور نہ عورت کے مقابلے میں اپنی انا کی شکست کو وہ گوارا کر سکتا تھا۔ عورت کے لیے مساوات کا اصول بھی اس نے ایک طویل اور شدید کشمکش کے بعد قبول کیا تھا، اور کشمکش بھی ایسی کہ جب میں وہ تمام سامانِ حرب و ضرب استعمال کیا گیا، جو بالعموم ایسی جنگوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اپنے حقوق کی اس جنگ میں عورت کو ہڑتالیں بھی کرنی پڑیں، اور تعاون و اشتراک کا مظاہرہ بھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے پبلک اجتماعات بھی منعقد کیے اور صحافت کو بھی آلۂ کار بنایا۔ پھر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ حالات کی اصلاح کے لیے اس کو ملکی قوانین سازی میں بھی مردوں کے ساتھ برابر کا حصہ لینا چاہیے؛ چنانچہ پہلے تو حق رائے دہی کا

مطالبہ پیش ہُوا اور پھر رفتہ رفتہ یہ لے بلند سے بلند تر ہوتی گئی، حتیٰ کہ یہ نعرہ گونجنے لگا کہ عورت کو پارلیمنٹ کا رُکن بننے کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ چونکہ اس کی پرورش ایک ایسے نظامِ تعلیم وتربیت کے تحت ہُوئی تھی، جو وظیفۂ حیات کے لحاظ سے مَرد وزن میں کسی قسم کی تفریق کا قائل نہیں تھا، اس لیے وہ آگے چل کر کاروبارِ حکومت میں بھی مَردوں کے ساتھ برابری کا مطالبہ کرنے لگی۔

یہ ہے اس جنگ کی داستان، جو یورپ میں عورت کو اپنے حقوق کی خاطر لڑنی پڑی۔ یہ ایک ہی مسلسل داستان ہے جس کا تانا بانا بہت سے باہم مربوط واقعات سے بنتا ہے۔ قطعِ نظر اس امر کے کہ مَردوں کو یہ نئی صورتِ حال پسند تھی یا ناپسند، بہرحال عورت کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جس بگڑے ہُوئے معاشرے کی سیادت اور قیادت کے منصب سے اس نے مَرد کو اتنی کامیابی سے محروم کیا تھا، اس میں وہ بھی اسی قدر — لاچار ہے جس قدر کہ مرد ہے[1]۔

مگر قارئین کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ آج بھی انگلستان میں، جس کو جمہوریت کا گہوارہ کہا جاتا ہے، سرکاری محکموں میں عورتوں کو مَردوں کے مقابلے میں کم تنخواہیں دی جاتی ہیں، حالانکہ انگلستان میں ترقیٔ نسواں کا یہ عالم ہے کہ کئی معزز خواتین کو برطانوی پارلیمنٹ کی رکنیت کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

---

[1] اسی قسم کے واقعات کی شہادت کی بُنیاد پر مارکسسٹ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ زندگی میں صرف معاشی عامل ہی اصل عامل ہے، جیسا کہ یورپی تحریکِ آزادیٔ نسواں سے ثابت ہوتا ہے۔ ہم اس سے پہلے اس کتاب میں ایک جگہ لکھ چکے ہیں کہ ہم زندگی میں معاشیات کی اہمیت کے مُنکر نہیں ہیں، لیکن یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ اگر یورپ والوں کے پاس اسلام کی طرح کا کوئی نصب العین اور نظامِ زندگی ہوتا، جو ہر طرح کے حالات میں عورت کی کفالت کے لیے مَرد کو ذمہ دار ٹھیراتا ہے، اور اگر بدرجۂ مجبوری وہ اپنی روزی کمانے نکلتی ہے تو اس کو مَردوں کے برابر اُجرت دِلواتا ہے۔ ہنگامی حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کثرتِ ازدواج کی اجازت دیتا ہے جس سے عورت کو نہ صرف معاشی تحفظ حاصل ہو جاتا ہے، بلکہ جنگوں کے مابعد پیش آنے والے دَور میں اس کی جنسی تسکین کی ایک جائز اور سُتھری راہ بھی نکل آتی ہے — اگر اس طرح کا کوئی نظامِ زندگی یورپ کے پاس ہوتا، تو وہاں کی عورت کا مسئلہ یُوں اُلجھ کر نہ رہ جاتا۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ اسلام عورت کو کیا مقام دیتا ہے اور پھر اس سوال پر غور کریں کہ اس معاشرتی مقام کی موجودگی میں کیا کوئی ایسی تاریخی، جغرافیائی، اقتصادی نظریاتی اور قانونی مجبوری پائی جاتی ہے کہ جس کی وجہ سے ہمارے یہاں کی عورت کے لیے بھی اسی طرح اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ ہو، جس طرح کہ اس کی مغربی بہن لڑ چکی ہے۔ اس کے بعد ہی ہم یہ جان سکیں گے کہ آیا حقوقِ نسواں کے مشرقی علمبرداروں کا موجودہ شور و غوغا اور عوامی اجتماعات میں ہنگامہ آرائی حقیقت پر مبنی ہے یا محض ان کے اپنے احساسِ کمتری کا کرشمہ ہے۔

اسلام کی بنیادی خصوصیت ــــ مساوات

اسلامی نظامِ حیات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عورت کو بھی انسانیت کا ویسا ہی اہم جزو قرار دیتا ہے جیسا کہ ایک مرد کو ــــ اور اس میں بالکل ویسی ہی رُوح کا وجود مانتا ہے جیسی کہ مرد میں پائی جاتی ہے؛ چنانچہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو اپنے پروردگار سے
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ	ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے
نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا	پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا	دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں
رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً (۴:۱)	پھیلا ئیں۔

گویا مرد اور عورت اپنے نقطۂ آغاز، اپنی جائے قرار، اور اپنے انجام کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں اور یکساں اور مساوی حقوق کے حقدار ہیں۔ اسلام نے عورت کو مردوں کی طرح جان، آبرو اور مال وجائیداد کے حقوق دے دیئے۔ اس نے اس کی ذات کو محترم قرار دیا اور کسی کے لیے یہ بات جائز نہ رکھی کہ وہ اس میں عیب نکالے یا اس کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی بیان کرے اور نہ کسی کو یہ حق دیا کہ وہ اس کی ٹوہ میں رہے اور اس کو اپنے نسوانی فرائض کی بجا آوری کی وجہ سے حقیر جانے۔ یہ سب حقوق عورت

کو اسی طرح حاصل ہیں جس طرح مرد کو۔ ان میں مرد و عورت کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں بلکہ اس سلسلے میں موجود قوانین کا اطلاق دونوں پر مساوی طور پر ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۖ ... وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ (۴۹:۱۱)	اے ایمان والو نہ مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ ان سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں، اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیے۔ کیا عجب ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو ... اور تجسس نہ کیا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۔ (۲۴:۲۷)	اے ایمان والو۔ تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو۔ جب تک کہ اجازت حاصل نہ کر لو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کر لو۔
... كل المسلم على المسلم حرامٌ دمهٗ وعرضهٗ ومالهٗ (بخاری ومسلم)	ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، آبرو اور مال حرام ہے۔

اسی طرح آخرت میں اجر کے لحاظ سے بھی اسلام نے مرد و عورت دونوں کو مساوی قرار دیا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ (۳:۱۹۵)	سو قبول کر لیا ان کی دعا کو ان کے رب نے۔ میں تم میں سے کسی شخص کے کام کو اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو۔

جائیداد کے حق میں مساوات

جہاں تک مال اور جائیداد کے حق کا تعلق ہے' اس معاملے میں بھی اسلام نے عورتوں اور مردوں میں مساوات کو ملحوظ رکھا ہے؛ چنانچہ مرد ہو یا عورت اپنی جائیداد کی خرید و فروخت اور اس کا انتظام کرنے میں بالکل آزاد ہوتی ہے۔ وہ چاہے اسے رہن رکھے' پٹہ پر دے' کسی کو ورثے میں دے' فروخت کرے یا اس کو مزید زمین خریدنے کا ذریعہ بنائے یا اس کو اپنی احتیاجات پوری کرنے میں استعمال کرے' ان تمام معاملات میں عورت کو مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۔ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَ الْأَقْرَبُونَ ..... (۴:۷)

مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ (۴:۳۲)

مردوں کے لیے ان کے اعمال کا بدلہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا بدلہ۔

یورپ اور جائیداد کا حق

جہاں تک عورت کے حقِ جائیداد اور اس کے آزادانہ استعمال کا تعلق ہے ہمیں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ مہذب یورپ کے قانونی نظام میں زمانۂ حال تک عورت کو ان میں سے کوئی ایک حق بھی حاصل نہیں تھا۔ قانونی طور پر وہ اپنے ان حقوق کو براہ راست استعمال کرنے کی بھی مجاز نہیں تھی' بلکہ ان کا استعمال بالواسطہ طور پر کسی نہ کسی مرد ــــ اپنے خاوند' باپ' یا سرپرست ــــ کی وساطت سے کرتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ اسلام کی طرف سے عورت کو یہ حقوق مل چکنے کے بعد بھی گیارہ صدی سے

زائد عرصے تک یورپ کی عورت اپنے اُن حقوق سے محروم رہی جن کے حصول کی خاطر اس کو شدید کشمکش سے دوچار ہونا پڑا تھا جس کے دوران میں اس کی نسائیت اور عفت محفوظ رہی، اور نہ اس کی شخصی عزت و وقار سلامت رہا۔ اس کو نہ صرف ان سب چیزوں کی قربانی دینا پڑی، بلکہ شدائد و مصائب، قتل، محرومیوں اور بدبختی کے ایک اندوہناک عمل میں سے بھی گزرنا پڑا، اور اس کے باوجود اس کو ان حقوق کا ایک حقیر سا حصہ ملا، جو اس سے بہت پہلے اسلام عورتوں کو دے چکا تھا، مگر اسلام کا یہ دینا معاشی حالات کے دباؤ کا نتیجہ نہ تھا، اور نہ اس کی پشت پر کوئی طبقاتی کشمکش کارفرما تھی، بلکہ اس کی اصل وجہ اسلام کی یہ خواہش تھی کہ دُنیا میں انسانی زندگی کی دو بنیادی حقیقتیں —— صدق اور عدل —— عملی صورت میں جلوہ گر ہوں، اور یہ محض خوابوں کی دُنیا تک محدود نہ رہیں۔

دوسری بات یہ قابلِ ذکر ہے کہ مغرب کا بالعموم اور اشتراکیت کا بالخصوص یہ نقطۂ نظر ہے کہ انسانی زندگی دراصل انسان کی معاشی حالت ہی کا دوسرا نام ہے؛ چنانچہ ان کے نظریے کی رُو سے جب تک عورت کو مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوئے تھے اور وہ اپنی جائیداد اور ملکیت میں آزادانہ تصرف کی مجاز نہیں تھی، وہ قطعاً آزاد حیثیت کی مالک نہیں تھی۔ اس کو آزاد انسانی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی، جب وہ معاشی لحاظ سے آزاد ہوئی اور اس قابل ہوئی کہ اپنی ملکیت میں کسی مرد کی مداخلت کے بغیر براہِ راست پوری آزادی سے تصرف کر سکے، اور اس کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔

عورت کی آزاد حیثیت

اگرچہ ہم انسانی زندگی کے بارے میں اشتراکیت اور سرمایہ داری کے اس تنگ نقطۂ نظر کے قائل نہیں ہیں، جس کی وجہ سے انسانی زندگی جانوروں کی سی پست معاشی سطح پر گر کر رہ جاتی ہے، تاہم ہم اشتراکیوں اور مغربی مفکرین کے اس خیال سے اصولی طور پر متفق ہیں کہ انسانی معاشرے میں انسانی جذبات اور خود شناسی کی نشوونما پر مستحکم معاشی حالت کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسلام اس لحاظ سے ایک امتیازی شان کا مالک ہے کہ اس نے عورت کو

آزاد معاشی مقام عطا کیا اور اس کو یہ حق دیا کہ وہ کسی درمیانی واسطے کے بغیر اپنی جائیداد میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام نے عورت کی زندگی کے سب سے اہم مسئلے ۔۔۔ شادی ۔۔۔ کے معاملے میں بھی عورت کی آزاد حیثیت کو قائم کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ اس کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہیں کی جا سکتی، نکاح کی صحت کے لیے اس کی رضامندی ایک ضروری شرط ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "کسی بیوہ کا نکاح اس کے مشورے کے بغیر نہ کیا جائے،

اور کسی کنواری کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر نہ کرو۔ کنواری کی رضامندی اس کی خاموشی ہے[1]۔" اسلام نے عورت کی رضامندی کو اس قدر اہمیت دی کہ اگر نکاح کے بعد بھی کوئی عورت یہ کہہ دے کہ اس کا نکاح اس کی رضامندی سے نہیں کیا گیا تو نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔

علحدگی کا حق

اسلام سے قبل اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے آزادی کی طالب ہوتی تھی، تو وہ ناجائز اور غلط طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہوتی تھی۔ خاوند کو اس پر کُلی اختیار حاصل تھا، اور وہ بالکل اس کے تابع فرمان تھی، کیونکہ نہ مُلکی قانون میں طلاق کی گنجائش تھی اور نہ مروّجہ ضابطہ ہی اس کو اپنے خاوند سے علحدگی کی اجازت دینے کا مجاز تھا۔ اسلام نے عورت کو یہ حق بھی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں عطا کیا کہ وہ جب چاہے اپنے اس حق کو استعمال کر سکے[2]۔

---

[1] بخاری، مسلم۔

[2] مشرق میں اس وقت جو سماجی اور معاشی حالات پائے جاتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے اس حق کی حیثیت ایک فریب نظر سے زیادہ نہیں ہے مگر مشرق کے یہ موجودہ حالات اسلام کے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہیں اور قوانین اسلامی کے عملی نفاذ میں سدِّ راہ بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کے دَورِ اوّل میں عورت اپنے اس حق کو استعمال کرتی تھی، اور اس کو آنحضورؐ نے بحیثیت شارع اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء نے بھی عورت کے اس حق کو پوری طرح تسلیم کیا۔ آج ہمارا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ ان تمام اسلامی قوانین کو نافذ کیا جائے اور اس کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں انہیں دُور کیا جائے، خواہ وہ مشرق کے موجودہ اقتصادی اور سماجی حالات کی پیداوار ہوں یا دوسروں کی دیکھا دیکھی غیر اسلامی طور طریقوں کی اندھی پیروی کا نتیجہ۔

بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے عورت کو یہ اختیار بھی دیا کہ اپنی مرضی سے جس سے چاہے شادی کرے اور اپنی پسند کے آدمی کو شادی کا پیغام دے۔ یورپی عورت کو یہ حق بہت بعد میں یعنی اٹھارویں صدی میں حاصل ہوا، تو اس کو قدیم روایات کے خلاف عورت کی ایک بہت بڑی فتح سے تعبیر کیا گیا۔

حصولِ علم کا حق

پھر اسلام ہی وہ مذہب ہے کہ جس نے ایک ایسے دور میں ساری انسانیت کے لیے علم کی اہمیت پر زور دیا، جب دنیا میں ہر طرف جہالت اور تاریکی کا دور دورہ تھا۔ اس نے علم کو محض ایک مخصوص طبقے کا حق قرار نہ دیا، بلکہ اس کو تمام انسانوں کے لیے ایک ناگزیر ضرورت بتایا اور تمام مسلمانوں کے لیے اس کا حصول ان کے ایمان اور اسلام کی ضروری شرط قرار دیا۔ یہ شرف بھی اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے عورت کو آزاد وجود قرار دے کر اس کو بتایا کہ علم کے بغیر اس کی شخصیت کی تکمیل ناممکن ہے۔ حصولِ علم جس طرح مرد پر فرض ہے اسی طرح یہ عورت پر بھی فرض ہے، کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ عورتیں جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اپنی عقل و روح کو بھی ترقی دیں تاکہ بہتر زندگی گزار سکیں۔ اس کے برعکس یورپ زمانۂ حال تک عورت کے لیے اس قسم کا کوئی حق تسلیم نہ کر سکا، اور صرف اسی وقت اس کو یہ حق دیا، جب معاشی حالات نے اسے بالکل ہی مجبور کر دیا اور اس کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہ رہی۔

اُوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اس جھوٹ کا پردہ چاک کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اسلام عورت کو ثانوی درجے کی مخلوق سمجھتا ہے، یا اس کو مرد کا تابع اور زیردست بنا کر رکھنا چاہتا ہے یا اسلام کی نگاہ میں اس کا وظیفۂ حیات سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا، کیونکہ اگر ان الزامات میں کچھ بھی حقیقت ہوتی، تو اسلام عورت کے لیے علم کی اہمیت پر اس قدر زور ہرگز نہ دیتا۔ عورت کے لیے علم کے حصول پر اس قدر زور دینے سے ظاہر ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عورت کو خدا کے ہاں بھی اور اسلامی معاشرے

میں بھی ایک بلند اور باعزت مقام حاصل ہے۔

مرد اور عورت میں امتیاز کی بنیاد

لیکن انسانی حیثیت سے مرد و زن میں کامل مساوات تسلیم کرنے، اور انہیں یکساں حقوق کا حامل قرار دینے کے بعد بھی جہاں تک زندگی میں دونوں اصناف کے وظیفۂ حیات کا تعلق ہے، اسلام ان کے باہمی فرق کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اسلام کے خلاف خواتین کی بعض انجمنوں اور ان کے حامی ادیبوں، سماجی مصلحین اور نوجوانوں کے شور و غوغا کی اصل وجہ اسلام کا یہی تصور ہے۔

دونوں اصناف میں اسلام جن پہلوؤں سے امتیاز کرتا ہے، ان پر نگاہ ڈالنے سے پیشتر آئیے طبی، حیاتیاتی اور نفسیاتی نقطہ ہائے نظر سے اصل بنیادی مسئلے کا مطالعہ کریں۔ اس کے بعد ہم اسلامی نقطۂ نظر پیش کریں گے۔

بنیادی مسئلہ

کیا مرد اور عورت ایک ہی صنف سے تعلق رکھتے ہیں یا یہ دونوں دو الگ اصناف ہیں؟ کیا زندگی میں ان کا وظیفہ یکساں ہے یا مرد اور عورت ہونے کی حیثیت سے ان کے فرائض کے دائرے جدا جدا ہیں؟ یہ سوالات بڑے پیچیدہ ہیں، مگر دراصل انہی کے سلجھنے پر مرد و زن کے مسئلے کے حل کا انحصار ہے۔ جن عورتوں اور ان کے حامی ادیبوں، مصلحین اور نوجوانوں کا یہ خیال ہے کہ مرد اور عورت کی جسمانی اور وجدانی ساخت میں کوئی فرق پایا ہی نہیں جاتا اور زندگی میں ان کے حیاتیاتی فرائض بھی یکساں نوعیت کے ہیں، ان سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے، البتہ وہ لوگ جو مرد اور عورت کی جسمانی ساخت اور زندگی میں ان کے فرائض میں کوئی فرق مانتے ہیں، ان سے اب بھی اس مسئلے پر مفید اور نتیجہ خیز گفتگو کی جا سکتی ہے۔

دونوں صنفوں میں مساوات کے مسئلے پر ایک تفصیلی بحث میری کتاب "الانسان بین

المادیۃ والاسلام" میں موجود ہے۔ اس بحث کے کچھ اقتباسات موقع کی مناسبت کے لحاظ سے ذیل میں دیے جاتے ہیں :

وظائف اور مقاصد کا اختلاف

"دونوں اصناف کے وظائف اور مقاصد میں اس بنیادی اختلاف ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ اپنے مزاج اور ساخت کے اعتبار سے مَرد اور عورت ایک دوسرے سے کچھ اس طرح مختلف واقع ہُوئے ہیں کہ وہ صرف اپنے اپنے بنیادی وظائف حیات ہی کو سرانجام دے سکتے ہیں۔"

"یہی وجہ ہے کہ مَیں اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہُوں کہ مَرد اور عورت کے درمیان کامل مساوات پر کھوکھلی تقریریں کرنے سے حقیقت کی دُنیا میں اس مساوات کو رُوبہ عمل کیونکر لایا جا سکتا ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے مَرد اور عورت میں مساوات ایک بالکل فطری اور معقول مطالبہ ہے۔ مَرد اور عورت خانوادۂ انسانیت کے دو یکساں اہم ارکان ہیں، اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، لیکن زندگی میں اپنے فرائض اور ان کی بجا آوری کے عملی طریقے میں بھی کیا وہ آپس میں مساوی ہو سکتے ہیں؟ کیا اس قسم کی مساوات کبھی ممکن ہو سکتی ہے؟ اگر دُنیا بھر کی عورتیں بیک زبان اس کا مطالبہ کریں، اور اس کے حق میں بڑے بڑے اجتماعات منعقد کریں اور قراردادیں منظور کریں، تب بھی اس مساوات کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ اجتماعات اور ان میں منظور کی ہُوئی قراردادیں نہ مَردوں کی فطرت بدل سکتی ہیں اور نہ عورتوں کی اور نہ اس سے دونوں اصناف کے وظائفِ حیات میں کوئی تغیّر و تبدل واقع ہو سکتا ہے کہ عورتیں، مَردوں کے کام کرنے لگیں اور مَرد عورتوں کے بجائے حمل، بچّوں کی پیدائش اور انہیں دودھ پلانے کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

طبعی اور نفسیاتی فرق

"کوئی بھی خصوصی نوعیت کا حیاتی وظیفہ ایک خاص قسم کی طبعی اور نفسیاتی مزاج کی عدم موجودگی میں انجام نہیں دیا جاسکتا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہُوا کہ عورت کی مخصوص ذمہ داریوں۔ حمل اور رضاعت ۔۔ کو انجام دینے کے لیے مخصوص جذباتی اور ذہنی صلاحیتیں ناگزیر ہیں۔ انھی کی مدد سے عورت اپنی ان مشکل ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتی ہے۔"

عورت کا مزاج

"واقعہ یہ ہے کہ ماں کی ماتا، اس کے پاکیزہ جذبات، اعلیٰ کردار، مصائب شدائد کے ہجوم میں اس کا صبر واستقامت، ہمدردی اور کارکردگی کا یہ نقطۂ کمال اس مخصوص طبعی مزاج کی غیر موجودگی میں ممکن ہی نہیں، جو عورت کو اپنے اصل وظائف ۔۔ حمل اور رضاعت ۔۔ انجام دینے کے قابل بناتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے اس کے نفسی، ذہنی اور اعصابی نظام کی ایک مخصوص صورت بنتی ہے۔ عورت کی یہ ذہنی، نفسی، عصبی اور طبعی خصوصیات پہلو بہ پہلو پائی جاتی ہیں اور یہ نہ صرف ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، بلکہ ان میں باہم ربط اور ہم آہنگی بھی ملتی ہے۔ اس لیے سوائے انتہائی استثنائی صورتوں کے یہ ممکن ہی نہیں کہ ان میں سے کوئی خصوصیت دوسری خصوصیات کی عدم موجودگی میں پائی جائے۔"

"جذبات کی لطافت، وجدان کی نزاکت اور زود حسی سے جو ایک عورت کی خصوصیات ہیں، ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا ضمیر بنیادی طور پر عقل سے نہیں، بلکہ جذبات سے اُٹھایا گیا ہے۔ اس کی یہی جذباتیت ماتا کی زندہ اور دائمی صفات کا سرچشمہ ہے، کیونکہ بچے کی پرورش کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ عقلی نہیں ہیں، بلکہ اس کے لیے تیز و تند جذبات کی ضرورت ہے جو عورت کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے ہی نہیں دیتے، اور اس کو بچے کی ضروریات کے تقاضے پر فوراً اور بلاکسی تاخیر اور سستی کے لبیک کہنے پر آمادہ کرتے ہیں"

"یہ ہے زندگی میں عورت کا صحیح کردار۔ یہ کردار اس کے وظائفِ حیات کی انجام دہی میں اس کی مدد کرتا ہے اور اس کے تخلیقی مقصد کے حصول کو ممکن بناتا ہے۔"

مَرد کا وظیفۂ حیات

"اس کے برعکس مَرد کے سپرد جو فرائض ہیں ان کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔

مگر وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تمام ضروری مگر عورت سے مختلف نوعیت کی صلاحیتوں سے مسلح ہے۔ اس کا اصل کام کارزارِ حیات میں معرکہ آرائی ہے۔ وہ جنگل کے وحشی درندوں کو مطیع بناتا ہے، زمین و آسمان میں فطرت کی قوتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے، حکومت کی تشکیل کرتا ہے، اور کبھی قومی اقتصادیات اور معاشرے کے لیے قانون وضع کرتا ہے۔ مرد کو زندگی میں ان تمام مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر وہ اپنی روزی کمانے یا اپنی ذات، اور اپنے بیوی بچوں کو دوسروں کے ظلم و ستم سے بچانے کے قابل ہوتا ہے۔

مرد کا نفسیاتی مزاج

" چنانچہ مرد کو زندگی میں اپنے فریضے کی انجام دہی کے لیے عورت کی طرح کے شدید جذباتی مزاج کی ضرورت نہیں۔ اس کو جس نوعیت کا کام کرنا ہے، اس میں جذبات بجائے مفید اور معاون ہونے کے، الٹا مضر ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ ان میں ہر آن اور ہر لمحہ اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، جس سے متضاد ذہنی کیفیات جنم لیتی رہتی ہیں۔ ان جذبات میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ آدمی کسی لگے بندھے طریقہ پر طویل عرصہ تک ثابت قدم رہ سکے۔ ان کی پسند و ناپسند بھی بدلتی رہتی ہے۔ اس طرح کا ہر آن بدلتا ہوا جذباتی مزاج ایک ماں کے وظیفۂ حیات کے باہم مختلف اور ہمہ وقت متغیر تقاضوں سے تو پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ لیکن مرد کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں، کیونکہ اس کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کو مستقل مزاجی اور پامردی سے طویل عرصے تک اپنے فرائض نبھانے پڑتے ہیں، اس کی عملی زندگی میں جہاں اس کو بے شمار مخالف طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے، اس کی عقل ہی اس کی ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے اس میں مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے موجودہ صورت حال کا جائزہ

سے لینے، اور اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس کے متوقع نتائج کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ عقل سُست گام ہے، مگر اس میں ثبات اور استقلال پایا جاتا ہے۔ اس سے سرعتِ عمل مطلوب نہیں، کیونکہ یہ چیز تو اُن جذبات کا امتیازی وصف ہے، جن سے عورت کے وجود میں رنگ و نور پیدا ہوتا ہے۔ عقل سے جس چیز کا البتہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ حصولِ مقصد کے لیے کسی موزوں تر طریقہ کی جانب ہماری رہنمائی کرے۔ خواہ ہمارے پیشِ نظر جنگلی جانوروں کا شکار ہو، یا کسی نئے آلے کی ایجاد یا نئے معاشی نظام کا قیام، اور کسی نئی حکومت کا بنانا ہو، یا کسی بیرونی ملک کے خلاف جنگ اور صلح کا اعلان کرنا۔ مرد کی یہ ساری سرگرمیاں اس کی ذہنی صلاحیتوں پر منحصر ہیں۔ ان میں جذبات کا عمل دخل ان کو سلجھانے کے بجائے انہیں الجھانے کا باعث ہی بن سکتا ہے۔

کامیاب مرد — کامیاب عورت

" اور اس لیے ایک مرد کو زندگی میں صرف اسی صورت میں کامیاب اور زندگی سے ہم آہنگ کہا جائے گا، جب کہ وہ اپنے حقیقی اعمال اور وظائفِ حیات کے لیے سرگرمِ عمل ہو۔ اس سے مرد اور عورت کے باہمی اختلاف کی علت سمجھ میں آسکتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مرد ان کاموں میں کیوں خوشی محسوس کرتا ہے، جن میں اس کو جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کی ضرورت پڑتی ہے، اور جذباتی دنیا میں آکر وہ بچے کی مانند بے بس کیوں بن جاتا ہے۔ اسی طرح عورت جذبات کے دائرہ میں انتہائی مسرور دکھائی دیتی ہے، کیونکہ یہی وہ دائرہ ہے، جس میں رہ کر وہ اپنے فرائض کو بطریقِ احسن بجا لا سکتی ہے۔ جن پیشوں مثلاً نرسنگ، تدریس اور دایہ گری میں اس کی نسوانیت کے لیے اپیل پائی جاتی ہے،

ان میں بھی وہ خوش رہتی ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی دکان میں کام کرتی ہے، تو اس میں بھی اس کو ایک طرح کی جذباتی آسودگی ملتی ہے، کیونکہ اس سے اپنے لیے کسی مرد ساتھی کی تلاش میں اس کے لیے آسانی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ سارے کام اس کے اصل فریضے کی بجا آوری میں محض ضمنی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے اس کی فطرت کا اصل تقاضا جو ایک خاوند، گھر، کنبہ اور بچے چاہتا ہے، کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ ایک بالکل فطری امر ہے کہ جب کبھی اس کو اپنا اصل وظیفۂ حیات انجام دینے کا موقع ملتا ہے، وہ ملازمت کو چھوڑ چھاڑ اپنے آپ کو گھریلو فرائض کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ اور اس وقت تک گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی، جب تک ہنگامی حالات اور روپیہ پیسہ کی ضرورت اس کو بالکل بے بس نہ کر دیں۔

"اس کا یہ مفہوم بہرحال نہیں ہے کہ مرد اور عورت میں بنیادی طور پر کوئی ایسا اختلاف ہے کہ یہ آپس میں مل ہی نہیں سکتے۔ اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک صنف کے افراد میں سرے سے یہ صلاحیت ہی مفقود ہوتی ہے کہ وہ ان وظائف کو انجام دے سکیں، جن کے لیے فطرت نے صرف صنفِ مخالف کو ضروری صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے۔

صنفوں کا نقطۂ اشتراک

"یہ دونوں اصناف ایک طرح کے ملغوبے کی صورت میں پہلو بہ پہلو ملتی ہیں۔ مگر آپ کسی ایسی عورت کو دیکھیں، جو حکمرانی کی صفات رکھتی ہو، مسندِ انصاف پر بیٹھتی ہو، بھاری بوجھ اٹھاتی ہو اور جنگوں میں لڑتی ہو .... اور اسی طرح اگر آپ ایک ایسے مرد سے ملیں، جو کھانا پکا لیتا ہو، گھر کا کام کاج کرتا ہو، بچوں کے لیے ماں کی طرح محبت و شفقت رکھتا ہو، جذباتی ہو اور تلون کا شکار ہو اور اس کی

طبیعت میں ہر آن اتار چڑھاؤ ہو، تو آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ بالکل فطری ہے۔ اس میں کوئی چیز بھی غیر فطری نہیں ہے۔ یہ اس بات کا منطقی نتیجہ ہے کہ ہر جنس میں اپنے علاوہ دوسری جنس کے جرثومے بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر اس سے گم گشتہ راہ مغربی مفکرین اور ان کے مشرقی شاگردوں کے اس دعوے کا اثبات ہرگز نہیں ہوتا کہ عورت اور مرد کے وظائف حیات یکساں ہونے چاہئیں۔ اس کے برعکس ان استثنائی مثالوں کی موجودگی سے جو سوال پیدا ہوتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ آیا عورت کے یہ اضافی کام اس کے اصل اور حقیقی وظیفہ حیات کا بدل بن سکتے ہیں؟ کیا انہیں انجام دینے کے بعد عورت کو واقعی اپنے گھر، بچوں اور کنبے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟ کیا یہ خلا واقعی پُر ہو جاتا ہے؟ اور کیا ان کے بعد اپنے صنفی جذبات کی تسکین کے لیے وہ کسی مرد ساتھی کی ضرورت سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے؟

مرد اور عورت کے باہمی اختلافات کی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آیئے اب ذرا ان پہلوؤں پر غور کریں، جن کی بنا پر اسلام مرد اور عورت میں فرق کرتا ہے اور زندگی میں ان کے لیے الگ الگ وظائف حیات تجویز کرتا ہے۔

فطری نظام زندگی

اسلام کا بہت بڑا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ زندگی کا عملی نظام ہے، جو انسانی فطرت کے خلاف لڑتا نہیں ہے، نہ اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ چاہتا ہے بلکہ اس کے لیے وہی کچھ تجویز کرتا ہے، جو اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ انسان کو روحانی پاکیزگی سے بہرہ ور کرتا ہے۔ اور اسے اتنا بلند دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے ڈانڈے عینیت (IDEALISM) سے مل جاتے ہیں، مگر انسانی ترقی و پاکیزگی کے اس تمام عمل میں وہ کہیں بھی انسانی فطرت سے نہیں ٹکراتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک انسان کی فطرت میں نہ تو اس طرح کی کوئی تبدیلی ممکن ہے، اور نہ کسی لحاظ سے بھی ایسا کرنا مفید ہے

اس کے نزدیک انسانیت کی معیاری کامرانیاں وہی ہیں، جو انسان کو اپنی فطرت سے لڑ کر نہیں بلکہ اس کے تقاضوں کو پورا کر کے اور اس کی ایسی تہذیب کر کے حاصل ہوں، جس کے نتیجے میں انسان نیکی اور احسان کے اعلیٰ ترین مقام کو پا سکے۔ نیکی اس کی نگاہوں میں مرغوب و مطلوب بن جائے اور وہ خواہشات نفس کا محض بندہ نہ رہے۔

فرق کے دو مواقع

عورت اور مرد کے مسئلے میں اسلام نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، وہ بھی انسانی فطرت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ چنانچہ جہاں کوئی فطری بنیاد موجود ہوتی ہے، وہاں وہ ان دونوں کے درمیان مساوات قائم کرتا ہے، اور جہاں فطرت امتیاز چاہتی ہے، وہاں وہ بھی ان میں فرق اور امتیاز کرتا ہے۔ مرد اور عورت میں اسلام جن مواقع پر فرق کرتا ہے، ان میں دو مواقع بہت نمایاں ہیں: ایک وراثت کی تقسیم کا اور دوسرا خاندان کی سربراہی کا معاملہ۔

وراثت

وراثت کے متعلق اسلام کا قانون یہ ہے کہ:

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے

اور یہ بالکل فطری اور منصفانہ تقسیم ہے، کیونکہ مالی اخراجات کا سارا بوجھ تنہا مرد ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ عورت پر سوائے اپنی ذات کے اور کسی کے اخراجات کا بوجھ نہیں ہوتا۔ البتہ جب عورت ہی خاندان کی سربراہ ہو، تو معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ اس صورت میں بے شک عورت ہی کو خاندان کی ضروریات مہیا کرنی پڑتی ہیں، مگر یہ ایک استثنائی صورت حال ہے، جو اسلامی معاشرے میں شاذ و نادر ہی پیش آسکتی ہے، کیونکہ جب تک عورت کا کوئی عزیز مرد موجود ہو۔ خواہ وہ عزیز کتنا ہی دور کا رشتہ دار کیوں نہ ہو، روزی کمانے کے لیے عورت کو گھر چھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کیا حقوق نسواں کے علمبرداروں کے بقول عورت کے لیے یہ انتظام واقعی اس پر ظلم و زیادتی کے مترادف ہے؟ ان کھوکھلے نعرے بازوں اور تنگ نظری کا پرچار کرنے

والوں سے قطع نظر دیکھا جائے، تو اصل مسئلہ ریاضی کا ایک سیدھا سادا سوال ہے: کل ورثہ کا ایک تہائی حصہ عورت کو صرف اپنی ذات کے لیے ملتا ہے، جب کہ باقی دو تہائی مرد کو دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی (یعنی عورت) اپنے بچوں اور خاندان کی ضروریات پوری کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وراثت کا بیشتر حصہ کس کو ملتا ہے، مرد کو یا عورت کو؟ ہو سکتا ہے کہ بعض مرد اپنی ساری دولت اپنے ذاتی آرام و آسائش پر ہی لٹا دیتے ہوں، اور شادی کر کے گھر بسانے پر آمادہ نہ ہوں، مگر ایسی صورتیں بہت شاذ ہوتی ہیں۔ بالعموم مرد ہی اپنے خاندان کے سارے اخراجات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور وہی خاندان کے تمام افراد کی (بشمول اپنی بیوی کے) ضروریات مہیا کرتا ہے۔ مگر ایسا کر کے وہ کسی پر احسان نہیں کرتا، بلکہ اپنی ایک اخلاقی ذمہ داری بجا لاتا ہے۔ اگر کوئی عورت صاحب جائیداد ہو تو اس کا خاوند اس کی مرضی کے بغیر اس سے یہ جائیداد نہیں لے سکتا۔ یہی نہیں بلکہ اس عورت کے سارے اخراجات کا بوجھ بھی مرد ہی کو اٹھانا پڑے گا۔ اگر خاوند بیوی کو نان نفقہ دینے سے انکار کر دے، یا اپنی آمدنی کے لحاظ سے اس کو کم خرچ دے، تو وہ عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کر کے اس سے نان نفقہ وصول کر سکتی ہے یا بصورت دیگر اس سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔ اسلام کے خلاف یہ محض بہتان ہے کہ اسلام وراثت میں عورت کو مرد کے مقابلے میں تھوڑا یا ناکافی حصہ دیتا ہے، کیونکہ مرد کی معاشی ذمہ داریاں ہی ایسی ہیں کہ وراثت میں سے اس کو عورت کے مقابلے میں دگنا حصہ ملنا ہی چاہیئے۔

اسلامی قانون وراثت کا اصل الاصول

ترکے کی تقسیم میں بھی اسلام ایسی ہی نسبت ملحوظ رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو قانون اصل الاصول کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے زیادہ منصفانہ قانون انسانیت اب تک دریافت نہیں کر سکی۔ لِکُلٍّ حَسْبَ حَاجَتِہٖ۔ یعنی ہر آدمی کو اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔ جب کہ آدمی کی ضروریات کا پیمانہ اس کی وہ معاشرتی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، جو اس کو بجا لانا پڑتی ہیں۔ لیکن جہاں تک دولت کمانے کا تعلق ہے، اسلام مرد اور عورت میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔

نہ مزدوری میں ان کے درمیان کوئی فرق کرتا ہے، نہ تجارت کی صورت میں نفع کی تقسیم میں ان میں امتیاز روا رکھتا ہے اور نہ زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی کے معاملہ میں ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک کرتا ہے، کیونکہ ان معاملات میں اسلام صنفین میں مکمل مساوات کے اصول پر عمل کرتا ہے اور ان کی محنت کے مطابق انہیں مساوی معاوضہ دیتا ہے۔ اس معاملے میں وہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی گوارا نہیں کرتا۔ مسلم عوام میں عام طور پر پایا جانے والا یہ تاثر، جس کو اسلام کے دشمن ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پھیلاتے نظر آتے ہیں، کہ اسلام کی نگاہ میں عورت مرد کے مقابلے میں نصف معاوضہ کی مستحق ہے، سراسر غلط ہے۔

قانون شہادت

یہ بات کہ اسلام میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے مساوی ہے، ہرگز یہ ثابت نہیں کرتی کہ اسلام کی نگاہ میں ایک عورت نصف مرد کے برابر ہے۔ بلکہ یہ تو ایک دانشمندانہ اقدام ہے، جس کا مقصد ہر ممکن ذریعے سے قانونی شہادت کو غلطیوں اور خرابیوں سے محفوظ رکھنا ہے، خواہ یہ شہادت استغاثے کے حق میں ہو یا اس کے خلاف۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے عورت انتہائی جذباتی اور تاثر پذیر واقع ہوئی ہے اور خطرہ ہے کہ وہ مقدمے کے واقعات کو خلط ملط کر دے۔ اس لیے اس کی گواہی کی صورت میں ایک اور عورت کو بھی اس کے ساتھ شامل کر لیا گیا، اور اس کی مصلحت یہ بیان کی گئی کہ:

أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۔

اگر ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔

(۲ : ۲۸۲)

کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس مجرم کے خلاف یا حق میں وہ عدالت میں گواہی دے رہی ہے وہ کوئی حسین عورت ہو، اور وہ ضد اور جلاپے کی وجہ سے اس کے خلاف جھوٹی شہادت دے بیٹھے۔ اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ ملزم کوئی نوجوان مرد ہو، جس کو دیکھ کر گواہ کی ممتا بیدار ہو جائے،

اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کو بچانے کی کوشش میں ایسی شہادت دے دے، جو مبنی برحقیقت نہ ہو۔ مگر جہاں دو عورتیں بیک وقت عدالت میں گواہی دے رہی ہوں، وہاں پر ان دونوں کا ایسی غلطی میں مبتلا ہو جانا اور غلط شہادت دینا بعید از قیاس ہے۔ ایسی صورت میں قرائن یہی بتاتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک حقیقت کے بارے میں غلط فہمی کی شکار ہو گی، تو دوسری عورت اس کی اصلاح کر دے گی۔ اس موقع پر یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی خاتون گواہ نسوانی امراض کی ماہر کے طور پر عدالت میں پیش ہو، تو کوئی اور گواہ نہ ہونے کے باوجود اس کی اکیلی شہادت بھی معتبر سمجھی جائے گی۔

خاندان کی سربراہی

جہاں تک دوسرے مسئلے یعنی خاندان کی سربراہی کا تعلق ہے، تو اس کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے صرف وہی فرد عہدہ برآ ہو سکتا ہے، جس میں انتظامی صلاحیت ہو اور جو خاندان کے معاملات کی نگرانی اور انتظام کر سکتا ہو۔ اور خاندان ایک مرد و عورت اور بچوں کے اشتراک اور اس سے پیدا ہونے والی ذمہ داریوں کا نام ہے۔ دوسرے معاشرتی اداروں کی مانند خاندان کو بھی ایک ذمہ دار سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی عدم موجودگی میں عائلی زندگی انتشار اور بالآخر تباہی کا شکار ہو سکتی ہے۔ خاندان کی سربراہی کے سلسلے میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ مرد خاندان کا حاکم ہو۔ دوسرے یہ کہ عورت اس کی سربراہی کرے اور تیسرے یہ کہ مرد اور عورت دونوں بیک وقت خاندان کی سربراہی کے منصب پر فائز ہوں۔

تیسری صورت تو ظاہر ہے کہ خارج از بحث ہے کیونکہ ہمارا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ جہاں دو سربراہ ہوں، وہاں سرے سے کوئی سربراہ نہ ہونے کی حالت سے بھی زیادہ انتشار اور مصائب جنم لیتے ہیں۔ زمین اور آسمانوں کی تخلیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :-

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ ... — زمین یا آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود ہوتا، تو زمین آسمان، دونوں درہم برہم ہو جاتے...

إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ ... — تو ہر خدا اپنی مخلوق کو جدا کر لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔

اگر ان خیالی خداؤں کا یہ حال ہے تو تصور کیجیے کہ ان انسانوں کا کیا حال ہوگا، جو اس قدر ظالم اور بے انصاف واقع ہوئے ہیں۔

ایک سوال

اس طرح ہمارے سامنے صرف دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ جن پر بحث کرنے سے قبل ہم قارئین کے سامنے ایک سوال رکھتے ہیں: اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے خاندان کی سربراہی کے لیے عورت اور مرد میں سے کون زیادہ موزوں ہے؟ کیا عقلی صلاحیتوں سے مسلح مرد اس کی ذمہ داریوں سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہو سکتا ہے یا وہ عورت جس کا امتیازی وصف ہی اس کی جذباتیت ہے؟ جوں ہی ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں، کہ اپنی ذہنی صلاحیتوں اور مضبوط جسم کی بدولت مرد اس قابل ہے کہ خاندان کا حاکم بنے یا عورت جو اپنی فطرت کے لحاظ سے سخت جذباتی اور انفعال پذیر واقع ہوئی ہے اور اقدام کی مردانہ صفات سے عاری ہے، تو مسئلہ خود بخود طے ہو جاتا ہے۔ خود عورت بھی کسی ایسے مرد کو پسند نہیں کرتی، جو کمزور ہو اور وہ اس کو بآسانی دبا لے۔ ایسے مرد سے وہ نفرت کرتی ہے، اور کبھی اس پر اعتماد نہیں کرتی۔ عورت کا یہ طرز عمل اس ذہنی رویے کے پیچھے اثرات کا نتیجہ ہو سکتا ہے، جو گزشتہ کئی سو سال کی تربیت اور وراثت کے طور پر

---

[1] سورۃ الانبیاء: ۲۱ [2] المؤمنون: ۹۱

[3] پوری انسانی تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ ہر شعبے ہر محکمے اور ہر ادارے کا ایک ہی سربراہ ہوتا ہے۔ کسی ملک میں دو صدر یا دو وزیراعظم کا تصور بھی احمقانہ ہے۔ یہی صورت ایک خاندان کی ہے۔ اس میں بھی سربراہ بہرحال ایک ہی ہوگا۔ (مترجم)

اس کو ملا ہے۔ مگر بہر حال یہ واقعہ ہے کہ عورت آج بھی اسی مرد میں کشش پاتی ہے، جو جسمانی لحاظ سے تندرست، توانا اور مضبوط ہو۔ یہ حقیقت امریکی خواتین کی زندگیوں میں پوری طرح جلوہ گر ملتی ہے۔ امریکی عورت کو مرد کے ساتھ برابر کے حقوق حاصل ہیں، اور اس کی آزاد حیثیت کو بھی وہاں پر تسلیم کیا جا چکا ہے، مگر اس کے باوجود مرد سے مغلوب ہو کر اسے خوشی ہوتی ہے۔ وہ ایسے مرد سے محبت کرتی ہے اور ہر طرح سے اس کا دل جیتنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ مرد کے مضبوط جسم اور کشادہ سینے کو دیکھ کر متاثر ہوتی ہے، اور جب جسمانی قوت کے معاملے میں اسے اپنے سے کہیں زیادہ مضبوط اور قوی پاتی ہے، تو اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی ہے۔

عورت کو خاندان کی سرداری کا شوق صرف اسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک اس کے اولاد نہیں ہو جاتی، اور اس کو اس کی تعلیم یا تربیت کی کوئی فکر دامنگیر نہیں ہوتی۔ بچوں کی موجودگی میں ان اضافی فرائض کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں بچتا، کیونکہ ماں کی حیثیت سے اس پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، وہ کچھ کم مشکل اور وقت طلب نہیں ہوتے۔

عائلی زندگی کی روح

اس کا یہ مطلب بہر حال نہیں ہے کہ گھر میں عورت مرد کی غلام اور وہ اس کا جابر آقا بن کر رہے۔ کیونکہ گھر کی سرداری چند ایسے فرائض اور ذمہ داریوں کا نام ہے۔ جنہیں صرف اسی صورت میں پورا کیا جا سکتا ہے، جب کہ خاوند اور بیوی کے درمیان محبت اور تعاون کی فضا قائم ہو۔ گھریلو زندگی کی کامیابی کے لیے باہمی افہام تفہیم اور مستقل ہمدردی ناگزیر ضروریات ہیں۔

اسلام باہمی کشمکش اور مسابقت کے بجائے مرد اور عورت کے درمیان محبت، افہام وتفہیم، اور مستقل ہمدردی کو عائلی زندگی کی اساس بنانا چاہتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[1] اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کرو۔

اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ خیرکم خیرکم لاھلہ[2] یعنی تم میں سب سے

---

[1] سورۃ النساء: ۱۹ [2] ترمذی

اچھا وہ ہے، جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے۔ گویا حضورؐ نے آدمی کے اخلاق کو ماپنے کے لیے جو پیمانہ مقرر کیا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت ہی صحیح پیمانہ ہے، کیونکہ کوئی آدمی اس وقت تک اپنی بیوی سے بدسلوکی نہیں کر سکتا، جب تک وہ روحانی طور پر مریض نہ ہو، اور اس میں نیکی کی کوئی حس ہی باقی نہ رہی ہو یا وہ کسی ذہنی الجھن کا شکار نہ ہو۔

بہرحال خاندانی زندگی میں خاوند اور بیوی کے رسمی تعلق کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ جن کی اصل حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے بعض غلط فہمیاں تو ان فرائض کے متعلق ہیں، جو عورت پر اپنے خاوند کی جانب سے عائد ہوتے ہیں اور بعض غلط فہمیوں کا تعلق طلاق اور تعدد ازواج کے مسائل سے ہے۔

میاں بیوی کے رشتہ کی پیچیدگی

ہم یہاں پر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ شادی کا رشتہ بنیادی طور پر ایک شخصی رشتہ ہے، اور دو افراد کے درمیان قائم ہونے والے باقی رشتوں کی مانند اس کا انحصار بھی متعلقہ افراد کے درمیان پائی جانے والی شخصی، نفسیاتی، ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی پر ہے۔ قانون کے ذریعے ان میں سے کوئی ایک چیز بھی وجود میں نہیں لائی جا سکتی۔ اس لیے اگر کوئی میاں بیوی آپس میں ہنسی خوشی سے رہ رہے ہوں، اور ان میں مکمل ہم آہنگی اور اطمینان موجود ہو، تو ضروری نہیں کہ اس کا راز ازدواجی زندگی کے اصولوں کی بے لاگ پیروی میں ہی مضمر ہو۔ کیونکہ بسا اوقات میاں بیوی میں شدید اختلاف بالآخر ان کی باہم گہری، وابستگی اور محبت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی شادی شدہ جوڑے کی ازدواجی زندگی میں کشمکش اور اختلاف نظر آئے، تو یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی وجہ خاوند کی کوئی غلطی یا بیوی کی سرکشی ہو۔ عین ممکن ہے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے میاں بیوی دونوں انتہائی اچھے اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہوں، مگر اس کے باوجود ان کے مزاج مختلف ہوں اور باوجود خواہش کے وہ آپس میں کوئی مصالحت کر ہی نہ سکتے ہوں۔

قانون ازدواج کی ضرورت

اس لیے ضروری ہے کہ قانون میں ایسی گنجائش موجود ہو کہ اس سے ازدواجی زندگی کے لیے قوانین اور اصول اخذ کئے جا سکیں۔ کیونکہ انسانی زندگی کے اس نازک مسئلے کو سلجھانے کی تدبیر کئے بغیر کوئی انسانی نظام جامعیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لیے ایک ایسا قانون ناگزیر ہے، جو کم از کم مسئلے کی عمومی اور ناقابل عبور حدود مقرر کر کے مرد اور عورت کو آزاد چھوڑ دے تاکہ وہ ان حدود میں رہ کر باقی تفصیلات خود طے کریں۔

اگر میاں بیوی میں محبت ہو اور وہ امن چین سے رہ رہے ہوں، تو ظاہر ہے کہ ان کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عدالت سے وہ صرف اسی صورت میں رجوع کرتے ہیں جب ان میں اَن بَن ہو جائے اور وہ خود اپنے جھگڑے کو نہ چکا سکیں۔

پھر قانون بھی ایسا ہونا چاہیئے جو انصاف پر مبنی ہو، اور اس سے نہ کسی فریق کی بے جا حمایت ہوتی ہو اور نہ بے جا مخالفت۔ اسی طرح اس کو اتنا جامع بھی ہونا چاہیئے کہ وہ واقعات کی زیادہ سے زیادہ تعداد پر منطبق ہو سکتا ہو۔ اس موقع پر ہم یہ بات دہرانا چاہتے ہیں کہ کوئی انسانی قانون یا ضابطہ ایسا نہیں ہو سکتا جو انسانی زندگی میں پیش آنے والے تمام حالات اور واقعات پر بیک وقت حاوی ہو سکے۔ اور نہ قانون کے جامد اور لفظی انطباق کو انصاف کے مطابق اور کوئی صحت مند قانونی نظیر قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسلامی قانون ازدواج کے متعلق چند بنیادی سوالات

اب آئیے ذرا اسلامی قانون کے اس حصے پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں، جو بیوی کی ذمہ داریوں سے بحث کرتا ہے۔ اور جس کے خلاف اس قدر غوغا آرائی کی جا رہی ہے۔ اسلامی قانون میں بیوی کی ذمہ داریوں سے متعلق مندرجہ ذیل تین نکات قابل غور ہیں:

—— کیا یہ ذمہ داریاں عورت پر ظلم کے مترادف ہیں؟

۲ ـــــ کیا یہ ذمہ داریاں یک رخی ہیں اور ان کے مقابلے میں عورت کو کوئی حقوق حاصل نہیں ہوتے؟ اور

۳ ـــــ کیا یہ ذمہ داریاں دائمی نوعیت کی ہیں کہ جن سے عورت کبھی اپنا پیچھا چھڑا ہی نہ سکے؟

بیوی کے فرائض

خاوند کی طرف سے عورت پر تین سب سے اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں :

۱۔ جب وہ مباشرت کا خواہاں ہو اور اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرے تو وہ اس کی اطاعت کرے۔

۲۔ کسی ایسے آدمی کو گھر میں نہ آنے دے، جس کی موجودگی کو اس کا خاوند ناپسند کرے۔ اور

۳۔ اس کی غیر حاضری میں اسکی وفادار رہے، اور اس کی امانت میں خیانت نہ کرے۔

پہلا فریضہ

جہاں تک ان فرائض میں سے پہلے فریضے کا تعلق ہے، اس کی اہمیت محتاج تشریح نہیں۔ اس میں جو مصلحت کارفرما ہے، وہ بالکل واضح ہے۔ مرد کی جسمانی ساخت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس کو جنسی آسودگی کی ضرورت عورت سے کہیں زیادہ پیش آتی ہے۔ اس طرح وہ جنسی تناؤ سے آزاد ہوتا ہے اور زندگی کے عملی میدان میں اپنے فرائض زیادہ مستعدی اور سرگرمی سے بجالانے کے قابل ہوتا ہے۔ جوانی میں بالخصوص مرد پر شہوت کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے اور اُسے عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ جنسی سکون کی حاجت ہوتی ہے۔ حالانکہ عورت جنسی لحاظ سے مرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ عمیق ہے اور جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے اس کی جانب اس کا میلان زیادہ شدید ہوتا ہے، مگر اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے اس جنسی میلان کا اظہار لازماً جسمانی فعل ہی کی صورت میں کرے۔ شادی مرد کی اسی فطری ضرورت کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اس کی زندگی کے روحانی، نفسیاتی، معاشرتی اور معاشی تقاضوں کا جواب بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ خاوند بیوی کے پاس جائے اور بیوی خاوند کی اس ضرورت کو پورا کرنے

کے بجائے اسے سرد مہری سے پرے دھکیل دے، تو خاوند کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا اسے دوسری عورتوں سے ناجائز تعلقات استوار کرلینے چاہیئں؟ کوئی مہذب معاشرہ اس طرح کے ناجائز تعلقات کا وجود برداشت نہیں کرسکتا۔ اور نہ خود بیوی ہی یہ گوارا کرسکتی ہے کہ اس کا خاوند جسمانی یا نفسیاتی لحاظ سے اس کے بجائے دوسری عورتوں میں کشش ڈھونڈتا پھرے۔ میاں بیوی کے باہمی تعلقات خواہ کیسے ہی کشیدہ کیوں نہ ہوں، کوئی عورت اس طرح کی صورت بہرحال برداشت نہیں کرسکتی۔

تین صورتیں

خاوند کی خواہش کے باوجود بیوی کے مباشرت سے انکار کی تین وجوہ ہوسکتی ہیں:

۱۔ بیوی خاوند سے نفرت کرتی ہے اور اس سے صنفی تعلق پسند نہیں کرتی۔

۲۔ خاوند سے وہ محبت کرتی ہے، مگر جنسی فعل کو پسند نہیں کرتی، لہٰذا جب وہ اس کا تقاضا کرتا ہے، تو انکار کردیتی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی صورتِ حال ہے مگر عملی زندگی میں عام ملتی ہے۔ اور

۳۔ یہ کہ وہ یوں تو خاوند کو بہت چاہتی ہے، اور جنسی فعل کو بھی برا نہیں سمجھتی مگر اس خاص وقت میں اس کے لیے اپنے اندر آمادگی نہیں پاتی۔

پہلی صورت تو ایک مستقل حالت ہے۔ اور ضروری نہیں ہے کہ صرف کسی خاص فعل یا مدت تک ہی محدود ہو۔ اس میں ازدواجی رشتہ زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس کا بہترین علاج صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مرد اور عورت کو ایک دوسرے سے علیحدگی کی اجازت دے دی جائے۔ اس معاملے میں جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے مرد کے مقابلے میں اسلام نے عورت کو کہیں زیادہ سہولتیں دے رکھی ہیں۔

دوسری صورت میں بھی بیوی کی معذوری مستقل قسم کی ہوسکتی ہے اس کا باعث صرف خاوند کی جنسی خواہش میں پوشیدہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک بیماری ہے اور اس کا پوری طرح علاج ہونا

چاہیئے، تاکہ میاں بیوی میں مکمل مفاہمت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اگر بیوی کی مرضی نہ ہو، تو اول تو خاوند کو ایثار سے کام لینا چاہیئے ورنہ بیوی کو چاہیئے کہ خاوند کی خواہش پوری کرے یہی محبت کا تقاضا ہے اور طلاق سے بچنے کی راہ۔ اگر میاں بیوی آپس میں اس قسم کی مفاہمت کرنے میں ناکام رہیں، تو انہیں شریفانہ طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ مگر جب تک وہ ازدواجی رشتے میں منسلک ہیں، اسلامی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ مباشرت کے معاملے میں بیوی بہر صورت خاوند کی مرضی پوری کرے، کیونکہ یہی صورت فطری ہے۔ عورت پر یہ کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہے، کیونکہ قانون کا منشا صرف اتنا ہے، کہ خاوند کو اخلاقی بے راہ روی میں مبتلا ہونے یا دوسری شادی کرنے سے روکا جائے۔ جو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے زبردستی کی مباشرت سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مگر اس قسم کے کشیدہ ازدواجی تعلقات کے دوام کو اسلامی قانون پسند نہیں کرتا، جن کی وجہ سے بیوی خاوند سے متنفر ہو اور بار بار زبردستی مقاربت کرنے کی وجہ سے اس سے سخت بیزار ہو۔ اس صورت میں بھی میاں بیوی کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

تیسری حالت البتہ ایک عارضی کیفیت ہے۔ اور اس کا بآسانی تدارک کیا جا سکتا ہے۔ مجامعت سے عورت کی نفرت کی وجہ جسمانی تھکاوٹ کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے اور اضمحلال اور مصروفیت بھی اس کا باعث بن سکتی ہے۔ مگر بہر حال یہ ایک عارضی حالت ہے۔ عورت اپنے جسمانی اور نفسیاتی مزاج کی مدد سے اس پر قابو پا سکتی ہے۔ عورت کی اس سرد مہری پر تحفے تحائف دے کر اور اس کو خوش کر کے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مقاربت سے قبل ملاعبت کے ذریعے بھی اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ ملاعبت سے میاں بیوی کی مقاربت محض ایک حیوانی فعل نہیں رہتی بلکہ ان کے لیے یہ ایک اعلیٰ روحانی تجربہ بن جاتی ہے۔ اس طریقے سے جنسی فعل سے بیوی کی نفرت کی اصل وجہ کو بھی دور کیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس اگر کوئی بیوی خاوند سے مقاربت کی خواہاں ہو، مگر خاوند کسی غیر معمولی وجہ

سے اس پر آمادہ نہ ہو، (مردوں میں ایسی صورت شاذونادر ہی دیکھنے میں آتی ہے) بہرحال اگر ایسی صورت ہو، تو قانون اسلامی نے بیوی کو یونہی بے سہارا نہیں چھوڑ دیا کہ وہ خاوند کو تعلق زن وشو کی بحالی پر کسی طرح مجبور ہی نہ کر سکے۔ جو اسلامی قانون بیوی کے لیے اپنے خاوند کی خواہش کو پورا کرنا لازمی قرار دیتا ہے، وہ اس بات کا بھی پورا پورا انتظام کرتا ہے کہ بیوی کی جائز خواہشات بھی پوری ہوتی رہیں۔ وہ خاوند کے لیے ضروری قرار دیتا ہے کہ بیوی تقاضا کرے، تو وہ اسے جنسی لحاظ سے مطمئن کرے۔ اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کو جنسی تسکین نہ دے سکے، تو ان کا نکاح فسخ کر دیا جائے گا۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اسلامی قانون میں نہ مرد اور عورت کے حقوق کو نظر انداز کیا گیا ہے اور نہ ان کے فرائض کو۔ اس میں کوئی ایسی شق موجود نہیں ہے جس سے بیوی کی اہانت اور استخفاف کا پہلو نکلتا ہو یا اس پر کسی طرح کا کوئی جبر و استبداد ثابت ہوتا ہو۔

دوسرا فرض

اپنے خاوند کی جانب سے بیوی پر عائد ہونے والا دوسرا اہم فرض یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو اس کے گھر میں نہ گھسنے دے جس کی گھر میں آمدورفت کو اس کا خاوند اچھی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو۔ (اس ہدایت کا بیوی کی بدکاری سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ اسے تو اسلامی قانون برداشت ہی نہیں کرتا اور اگر خاوند چاہے تب بھی بیوی کو اس سے بچنا چاہیئے۔ اس حکم کی حکمت بہت واضح ہے کیونکہ میاں بیوی کے بیشتر جھگڑوں کا باعث باہر کے آدمیوں کی مداخلت ہوتی ہے، جو ادھر ادھر لگائی بجھائی کر کے خاندانی جھگڑوں کو اور زیادہ ہوا دیتے رہتے ہیں۔ اگر اس قسم کی کسی مصلحت کے پیش نظر خاوند بیوی کو حکم دے کہ وہ فلاں شخص کو گھر میں نہ گھسنے دے اور بیوی ایسا کرنے سے انکار کر دے، تو ظاہر ہے کہ ان کے تعلقات خوشگوار نہیں رہ سکتے! اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا گھر مستقل طور پر ایک رزمگاہ بنا رہے گا۔ اور ان میں مفاہمت اور مصالحت کے تمام امکانات ختم ہو جائیں گے۔ گویا خاندان اور بچوں کی بہتری کا تقاضا بھی یہ ہے کہ بیوی اپنے اس فریضے کو بجا لائے کیونکہ بچوں کی صحیح اور مناسب پرورش، محبت اور ہمدردی سے بھرپور خوشگوار فضا ہی میں ہو سکتی ہے۔

اس موقع پر یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ قانونی لحاظ سے اگر بیوی کے لیے یہ ضروری ہے کہ خاوند کی مرضی کے بغیر کسی کو گھر میں نہ آنے دے، تو مرد کے لیے یہ کیوں ضروری نہیں ہے کہ وہ بھی کسی ایسے شخص کو گھر میں نہ گھسنے دے، جس کو اس کی بیوی ناپسند کرتی ہو۔ اگر میاں بیوی شائستہ اور سلجھے ہوئے ہوں اور ہنسی خوشی رہ رہے ہوں، تو اس طرح کا کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، اور اگر کبھی پیدا بھی ہوتا ہے، تو وہ اُسے خود ہی سلجھا لیتے ہیں۔ لیکن اگر بالفرض ان میں تلخی پیدا ہو جائے اور ان کے لیے اسے ختم کرنا ممکن نہ رہے، تو انہیں عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر بیوی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ بطور خود کسی کو اپنے خاوند کے گھر میں نہ گھسنے دے، تو اس سے معاملہ اور زیادہ بگڑ سکتا ہے، کیونکہ یہ بات نہ بھولیے کہ بیشتر معاملات میں عورت کے تاثرات منطق اور عقل کی قید سے آزاد ہوتے ہیں، اور وہ مصلحت اور دوراندیشی کے بجائے اس کی مخصوص شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہیں، یا سسرال والوں سے اس کے کشیدہ تعلقات کا ردعمل ——
اس لیے خاوند کو اس معاملہ میں بیوی کی مرضی کا پابند بنانا کہ وہ صرف اس شخص کو گھر میں قدم رکھنے دے، جس سے اس کی بیوی خوش ہو، کوئی دانشمندانہ فعل نہیں ہوگا۔ جس کو زیادہ دیر تک نبھانا بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔

اس سے میرا مقصود یہ بہرحال نہیں ہے، کہ خاوند سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہی نہیں ہوتی۔ نہیں بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ بعض حالات میں وہ طفلانہ حرکات کرے اور بہت متلون مزاج ثابت ہو۔ اسی طرح اس گفتگو کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ غلطیاں ہمیشہ بیوی ہی سے سرزد ہوتی ہیں اور خاوند بالکل معصوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیوی اپنے خاوند سے بالکل بجا طور پر متنفر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات میں کشیدگی کی اصل وجہ خاوند ہو، مگر قانون اس طرح کے استثنائی حالات کے لیے نہیں بنایا جاتا، بلکہ عام حالات اور عام آدمی کے لیے بنایا جاتا ہے۔ چونکہ بالعموم مرد عورت کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ معقولیت کا مظاہرہ کرتا ہے، اس لیے مرد کو عورت پر ایک گونہ برتری حاصل ہے۔ لیکن اگر بیوی یہ محسوس کرتی ہو کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ زندگی نہیں

گزار سکتی، تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اُس سے علیحدگی اختیار کرے۔

تیسرا فریضہ

رہ گئی عورت کی تیسری ذمہ داری یعنی اپنے خاوند کی عدم موجودگی میں اپنی عفت و ناموس اور اس کے مال و دولت کی حفاظت، تو وہ تو شادی کا بالکل فطری اور منطقی تقاضا ہے، جس کے بارے میں کسی بحث کی گنجائش نہیں مگر یہ ذمہ داری یک رُخی نہیں، بلکہ دو رُخی ہے۔ یعنی خاوند اور بیوی دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وفادار اور خیرخواہ بن کر رہیں۔

ناکام میاں بیوی

اب آیئے ذرا ایک ایسے میاں بیوی کے معاملے پر غور کریں، جو ایک دوسرے پر ظلم اور زیادتی کے مرتکب ہوں۔ چونکہ مرد گھر کا نگران اور اس کی ضروریات فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس لیے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ظاہر ہوتا ہے، اُسے یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی باغی اور سرکش بیوی کو راہِ راست پر لانے کے لیے اُسے سرزنش کرے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ۔ (۴ : ۳۴)	اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بدمانی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو، اور ان کو خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو، اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں، تو ان کے خلاف ظلم و زیادتی کرنے کے لیے بہانہ مت ڈھونڈو۔

بیوی کی اصلاح کا تدریجی طریقہ

اس آیت میں سرکش بیوی کی اصلاح کا جو طریقہ کار بیان ہوا ہے اس میں ایک خاص تدریج کارفرما ہے۔ جسمانی سزا کا مرحلہ اس میں سب سے آخر میں آتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض مرد اپنے اس حق کا غلط استعمال کرتے ہیں، مگر یہ صورت صرف اسی حق کے ساتھ مخصوص نہیں ہے،

بلکہ کسی بھی دوسرے حق کے بارے میں رونما ہو سکتی ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ لوگوں میں روحانی اور اخلاقی بلندی پیدا کی جائے، جس کی اہمیت سے اسلام کبھی غافل نہیں رہا۔ چنانچہ مندرجہ بالا آیت میں جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے، اس کا مقصد خانگی زندگی کا تحفظ اور استحکام ہے۔ کیونکہ کوئی قانون صرف اسی وقت مفید اور مؤثر ہو سکتا ہے، جب اس کی پشت پر ایک ایسی قوت نافذہ موجود ہو جو اس کی خلاف ورزی کے مرتکبین کو سزا دے سکے۔ اگر یہ قوت نافذہ موجود نہ ہو، تو قانون کی حیثیت ایک خالی خولی لفظ سے زیادہ نہیں رہتی۔ جو عمل کی دنیا میں کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتا۔

اس حکم کی مصلحت

شادی کا مقصد مرد اور عورت دونوں کی فلاح اور بہبود ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ گھر میں محبت اور سکون ہو، تاکہ قانون کا سہارا لیے بغیر میاں بیوی دونوں زیادہ سے زیادہ مادی اور روحانی فوائد سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ لیکن میاں بیوی میں جھگڑا اور اختلاف ہو، تو اس کے مضر اثرات صرف ان کی اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رہتے، بلکہ ان کے بچوں یعنی اگلی نسل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

عدالت اور گھریلو جھگڑے

اگر گھریلو زندگی میں تلخی کا باعث بیوی کا رویّہ ہو، تو سوال یہ ہے کہ اس کی اصلاح کون کرے؟ کیا عدالت یہ کام کر سکتی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر کے عدالت معاملے کو اور زیادہ بگاڑ تو سکتی ہے، اس کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے اختلافات بالکل معمولی اور عارضی ہوں، مگر عدالت میں جا کر یہ زیادہ پیچیدہ اور خطرناک صورت اختیار کر لیں۔ کیونکہ ایک دفعہ جب کوئی معاملہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے، تو طرفین کا غرور انہیں کسی قسم کی مصالحت کے قابل ہی نہیں رہنے دیتا۔ اس لیے معقول رویّہ یہی ہے کہ خاندانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات کو عدالت میں نہ لے جایا جائے۔ عدالت کو صرف اہم اور بڑے بڑے امور میں مداخلت کرنی چاہیئے اور وہ بھی صرف اس صورت میں جب کہ مصالحت کے باقی تمام ذرائع

ناکام ہو گئے ہوں۔

کوئی معقول انسان زندگی میں ہر لحظہ پیش آنے والی شکایات اور اپنے چھوٹے چھوٹے معاملات کو عدالت میں نہیں لے جاتا۔ کیوں کہ اگر ایسا ہو، تو پھر تو ہمیں ہر گھر میں ایک عدالت قائم کرنی پڑے گی، اور یہ عدالتیں دن رات انہی عائلی تنازعات کو چکانے میں الجھی رہیں گی۔

مرد کا کردار

بہر حال اس سے یہ ظاہر ہے کہ گھر میں کوئی ایسی قوت ضرور ہونی چاہیئے، جو گھریلو اصلاح کا کام اچھے طور پر انجام دے سکے۔ چنانچہ خاندان کا حقیقی سربراہ ہونے کی حیثیت سے مرد گھر کے اندر یہی فریضہ انجام دیتا ہے۔ اوپر کی آیت کریمہ میں اس کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ بیوی کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچائے بغیر زبانی فہمائش کے ذریعے اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اگر اس کے نتیجے میں بیوی اپنی اصلاح کرلے، تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی غلطی پر اصرار کرے، تو خاوند کو چاہیئے کہ وہ اس کو اپنی خواب گاہ سے الگ کر دے۔ یہ سزا پہلی سزا (یعنی زبانی فہمائش) سے قدرے سخت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام عورت کی نفسیات کا کس قدر گہرا ادراک رکھتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ اپنے حسن اور دلکشی سے مسحور ہو کر عورت لبسا اوقات اتنی مغرور اور سرکش ہو جاتی ہے کہ اپنے خاوند کی کھلم کھلا نافرمانی پر بھی اتر آتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کی خواب گاہ سے علیحدگی کا مطلب یہ ہوگا کہ خاوند کو وہ اپنے حسن، دلکشی اور ناز و ادا سے مجبور نہیں کر سکتی۔ اس سے اس کا غرورِ حسن کچھ کم ہوتا ہے، اور وہ دوبارہ معقول روش اختیار کر لیتی ہے۔

مگر اس سزا کے بعد بھی اس کی اصلاح نہ ہو، تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس قدر مغرور اور خود سر ہے کہ سوائے جسمانی سزا کے اور کسی طرح اصلاح پذیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر یہ صورت پیدا ہو جائے، تو خاوند کو اجازت ہے کہ آخری چارۂ کار کے طور پر اس کو مار پیٹ سکے۔ مگر اس مار پیٹ کا مقصد بیوی کی اصلاح ہونا چاہیئے نہ کہ اسے اذیت پہنچانا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون کی رُو سے یہ مار پیٹ بہت ہلکی ہونی چاہیئے۔

محض احتیاطی تدابیر

کیا عورت سے سختی کا یہ سلوک اس کی اہانت اور اس کی عزتِ نفس کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے؟ جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ کے اس پہلو پر گفتگو کرتے وقت ہمیں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس مار پیٹ کی حیثیت محض ایک احتیاطی تدبیر کی ہے، اور اس کو صرف اس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب اصلاح کے باقی تمام ذرائع ناکام ہو جائیں۔

سزا ــــ ایک نفسیاتی ضرورت

دوسری بات ہمیں یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ بعض نفسیاتی عوارض اور بگاڑ ایسے ہیں، جن میں مبتلا افراد کی اصلاح جسمانی سزا اور مار پیٹ کے سوا اور کسی طرح ممکن ہی نہیں ہوتی۔ علم نفسیات ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی کے عام حالات میں مذکورہ بالا ذرائع اصلاح ــــ یعنی زبانی فہمائش، اور خوابگاہ سے علیحدگی وغیرہ ــــ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ مگر بعض نفسیاتی عوارض مثلاً اذیت پرستی (MASOCHISM) وغیرہ ایسی ذہنی بیماریاں ہیں، جن میں مبتلا شخص کا علاج صرف جسمانی سزا ہی سے ممکن ہے۔ اس ذہنی عارضے کی، مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ اس طرح کی مریض عورتیں تحقیر اور مار پیٹ سے ایک طرح کا حظ حاصل کرتی ہیں [اس کے برعکس مرد عام طور پر جس نفسیاتی بیماری کا شکار ہوتے ہیں، وہ سادیت پسندی (SADISM) کہلاتی ہے۔ اس میں مبتلا مردوں میں ظلم و ستم سے ایک طرح کی مریضانہ محبت پائی جاتی ہے] ظاہر ہے کہ اگر بیوی اس قسم کی اذیت پرست خواتین کے گروہ سے تعلق رکھتی ہو، تو اس کی اصلاح مار پیٹ اور جسمانی سزا کے ذریعے ہی ممکن ہے، تاکہ اس کی نفسیاتی ضرورت پوری ہو، اور اس کے ہوش و حواس بحال ہوں۔ یہ بات بظاہر کتنی ہی عجیب و غریب کیوں نہ معلوم ہو، تاہم یہ حقیقت ہے کہ سادیت پسند مرد اور اذیت پرست عورتیں ایک دوسرے کے لیے بہت اچھے رفیقِ حیات ثابت ہوتے ہیں، حالانکہ ان کے باہمی تعلق کی اساس بجائے خود غیر صحت مندانہ ہوتی ہے۔ اسی طرح اذیت پرست خاوندوں

اور سادیت پسند بیویوں کی مثالیں بھی انسانی زندگی میں نایاب نہیں ہیں، جو وقتاً فوقتاً اپنے خاوندوں کو مضروب پیٹتی رہتی ہیں۔ ایسے اذیت پرست خاوندوں کا مزاج صرف پٹ پٹا کر ہی درست ہوتا ہے۔ یہ ان کی ایک نفسیاتی ضرورت ہے، جسے ان کی بیویاں بخوبی پورا کرتی رہتی ہیں۔ ... ایسے جوڑے بھی ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہتے ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ مارپیٹ کی نوبت صرف اسی وقت آتی ہے جب میاں یا بیوی مرض کی حد تک اس کے خوگر ہو چکے ہوں۔ اس کے بغیر یہ صورت پیش ہی نہیں آ سکتی۔ بہرحال قانونِ اسلامی خاوند کو جس مارپیٹ کی اجازت دیتا ہے، اس کی حیثیت محض ایک احتیاطی تدبیر کی ہے۔ کسی خاوند کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر اپنی بیوی کو زدوکوب کرے۔ قرآنی آیت میں اصلاحی تدابیر کا تدریجی ذکر اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو اپنا یہ حق صرف انہی مواقع پر استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، جہاں تمام دوسرے ذرائع ناکام ہو جائیں۔ آپ کا ارشاد ہے:۔

لا یجلد احدکم امرأته جلد العبیر ثم یجامعها فی آخر الیوم (بخاری)	تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو دن میں اس طرح نہ مارے کہ جس طرح اونٹوں کو مارا جاتا ہے اور پھر رات کو اسی سے مجامعت کرے۔

خاوند کی بدسلوکی کا علاج

اگر بیوی کو خاوند کی طرف سے کسی بدسلوکی کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں قانون ذرا مختلف ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ (۴ : ۱۲۸)	اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب گمان بدمزاجی یا بے پروائی کا ہو، تو دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم صلح کر لیں اور یہ صلح بہتر ہے۔

بعض لوگ اس معاملے میں بھی مرد اور عورت کے درمیان کامل مساوات کا مطالبہ کر سکتے

ہیں۔ مگر سوال محض نظری اور خیالی انصاف کا نہیں، بلکہ اس کی ایک ایسی صورت کا ہے، جو قابل عمل ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت سے بھی ہم آہنگ ہو۔ عورت "پسماندہ" مشرق کی ہو یا "مہذب" مغرب کی، وہ یہ ہرگز پسند نہیں کر سکتی کہ خاوند کی مار پیٹ کا بدلہ وہ بھی مار پیٹ کی صورت میں دے۔ اور اپنے خاوند کی پٹائی کرے۔ وہ ایسے خاوند کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھ ہی نہیں سکتی، جو اتنا کمزور ہو کہ اس کے ہاتھوں پٹتا اور مار کھاتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی عورت نے یہ مطالبہ نہیں کیا، کہ جس طرح خاوند کو اسے مارنے پیٹنے کا حق حاصل ہے اسی طرح اس کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ اپنے خاوند کو زدوکوب کر سکے۔

اس معاملے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اسلام کی نگاہ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ عورت چپ چاپ اپنے خاوند کی زیادتیاں اور جور و ستم برداشت کرتی رہے، اور اس کے خلاف اُف تک نہ کرے۔ نہیں بلکہ ایسی صورت میں اسلام اس کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ چاہے تو اپنے خاوند سے علیحدگی اختیار کر لے۔

بحث کا خلاصہ

اوپر کی بحث سے مندرجہ ذیل امور ہمارے سامنے آتے ہیں :۔

۱۔ خاوند کی جانب سے بیوی پر عائد ہونے والے فرائض نرے جبر اور قوت کا مظاہرہ نہیں ہیں، بلکہ ان کا اصل مقصود معاشرے کی اجتماعی فلاح اور بہبود ہے جس کا ایک جزو عورت بھی ہے۔

۲۔ بیوی کے اکثر فرائض کے مقابل میں خاوند پر بھی اسی طرح کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ جن گنے چنے مواقع پر مرد کو عورت کے مقابلے میں کسی نہ کسی طرح کی برتری حاصل ہے۔ ان میں بنیادی نقطہ نظر ان کی طبعی ساخت میں باہمی اختلاف کا نقطہ نظر ہے۔ اس سے عورت کی تحقیر یا تذلیل ہرگز مقصود نہیں ہے۔

۳۔ عورت پر مرد کو جو فوقیت حاصل ہے، اس کے مقابلے میں عورت کو یہ قانونی حق دیا گیا

ہے۔ کہ اگر خاوند اس سے بدسلوکی کرے تو وہ اس کو چھوڑ دے۔

طلاق کے تین طریقے

جہاں تک خاوند سے علیحدگی یا طلاق کا تعلق ہے جس کے ذریعے عورت قیدِ نکاح سے آزاد ہو کر اپنی تمام ازدواجی ذمہ داریوں سے آزادی حاصل کر لیتی ہے، اس کے حصول کے تین طریقے ہیں۔

ا۔ نکاح کے وقت عورت اپنے ہونے والے خاوند سے طلاق کا حق حاصل کر لے۔ اسلامی قانون کی رُو سے اگر مرد چاہے، تو اس طرح سے طلاق کا حق جو اسے حاصل ہے اپنی بیوی کو تفویض کر سکتا ہے، مگر عملاً بہت کم عورتیں اپنے اس حق کا استعمال کرتی ہیں۔ بہرحال قانون میں ان کا یہ حق موجود ہے، اور وہ جب چاہیں اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

ب۔ عورت عدالت میں اس بنا پر بھی اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے، اور اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ ہم نے یہ سنا ہے کہ بعض عدالتیں اس اصول پر عمل نہیں کرتیں اور عورت کے مطالبے کے باوجود خاوند سے اس کا ازدواجی تعلق منقطع نہیں کرتیں، حالانکہ اس بارے میں واضح اسلامی احکام موجود ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اور اس لحاظ سے یہ فقہ اسلامی کا ایک جزء ہے۔
جب عورت خود طلاق کا مطالبہ کرے، تو اسلام اس پر صرف ایک پابندی لگاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ خاوند سے ملنے والے تمام سامان جہیز کو اسے واپس کر دے۔ یہ انصاف کے عین مطابق ہے، کیونکہ اگر خاوند بیوی کو طلاق دیتا ہے، تو اس کو بھی اسی طرح تمام سامان بیوی کو دینا پڑتا ہے۔ گویا قیدِ نکاح سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر کچھ مادی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ج۔ بیوی کے سامنے تیسری راہ یہ ہے کہ وہ عدالت کے ذریعے اپنے خاوند سے طلاق لینے کے ساتھ ساتھ اس سے اپنا سامان جہیز اور نان نفقہ بھی وصول کرے بشرطیکہ وہ

عدالت کو ضروری ثبوت کے ذریعے مطمئن کر دے، کہ اس کے خاوند نے اس سے بدسلوکی کی ہے اور نکاح کے وقت اس نے اس کو نان نفقہ دینے کا جو وعدہ کیا تھا، اس کو پورا نہیں کیا۔ اگر عدالت اس کے دعوے کو صحیح تسلیم کرلے، تو وہ ان کے نکاح کو فسخ کرنے کے احکام جاری کرسکتی ہے۔

یہ ہیں وہ حقوق جو اسلام عورت کو دیتا ہے۔ ان سے وہ جب ضرورت ہو، کام لے سکتی ہے۔ عورت کے ان حقوق کے بعد مرد اور عورت کے حقوق میں ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے، تو عورت کو بھی اس کے مقابلے میں کچھ حقوق حاصل ہیں۔

عائلی الجھنیں

طلاق کے نتیجے میں ہمیں معلوم ہے کہ کس طرح بے شمار گھرانے مصائب و آلام میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عورت اور بچوں کو گوناگوں تکالیف کا تختہ مشق بننا پڑتا ہے۔ طلاق سے پیدا ہونے والے خاندانی جھگڑوں کی عدالتوں میں اس قدر بھرمار ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ کبھی ختم ہی نہیں ہوں گے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت ہشاش بشاش اور وفادار بیوی کی حیثیت سے اپنے شیر خوار بچے کی پرورش میں دل و جان سے مصروف ہے اور مزید اولاد کی تمنا لیے ہے کہ یکایک کوئی قاصد خاوند کی طرف سے کاغذ کا ایک پرزہ — طلاقنامہ — اس کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے اور اس کی پرسکون زندگی کو تہ و بالا کر کے چلا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے خاوند کی اس حرکت کا باعث اس کا کوئی وقتی جذبہ یا خیال ہو یا اس کو کوئی ایسی عورت مل گئی ہو جو اس کی بیوی سے زیادہ حسین ہو اور وہ اب اس سے شادی کا خواہاں ہو۔ یا اس کی وجہ محض یہ ہو کہ وہ اپنی بیوی سے اکتا گیا ہو اور تنوع چاہتا ہو۔ اسی طرح بیوی کی تھکاوٹ اور اضمحلال بھی طلاق کا باعث ہو سکتا ہے، جس کی بنا پر اس نے خاوند کی ہمبستری کی خواہش کو ٹھکرا دیا ہو اور اس نے ردعمل کے طور پر اس کو طلاق دے ڈالی ہو۔

ان سب باتوں کے پیش نظر، آزادی نسواں کے حامی پوچھتے ہیں، کیا یہ مناسب نہیں

ہے کہ طلاق کا یہ خطرناک ہتھیار، جو مرد کو حاصل ہے اور جس سے کسی وقتی جذبے کے تحت وہ کسی وقت بھی ایک معصوم اور صابر عورت کی زندگی کو تباہ اور اپنے بچوں کے مستقبل کو تاریک بنا سکتا ہے، اس سے چھین لیا جائے، تاکہ وہ اپنے اس حق کا غلط استعمال کر کے کسی کو نقصان پہنچا ہی نہ سکے؟

رومن کیتھولک ممالک کی مثال

جہاں تک بچوں اور بیوی پر ٹوٹنے والے مصائب و آلام کا تعلق ہے، ہمیں معلوم ہے کہ طلاق ہی ان سب کا باعث ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کا علاج کیا ہے؟ کیا مرد سے طلاق کا حق لے لیا جائے؟ اگر جواب ہاں میں ہو، تو پھر طلاق کے حق سے مرد کو محروم کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اس بھیانک صورت حال کا کیا تدارک ہوگا، جس کی ایک مثال ہمیں ان رومن کیتھولک ممالک میں ملتی ہے، جہاں طلاق قطعاً ممنوع ہے؟ اگر شادی کو ایک دائمی اور ناقابل انقطاع رشتہ بنا دیا جائے، تو ذرا اس میاں بیوی کے حشر کا تصور کیجئے جو ایک دوسرے سے متنفر ہیں اور ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں؟ کیا ایسی صورت میں اخلاقی جرائم کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملے گا؟ کیا خاوند اور بیوی گھر سے باہر داشتائیں اور آشنائیں ڈھونڈیں گے تاکہ جنسی آسودگی حاصل کر سکیں؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تاریک، گندے اور بیمار ماحول میں بچوں کی صحیح پرورش ہونی بھی ناممکن ہے، کیونکہ اس کے لیے والدین کی شفقت اور محبت سے زیادہ خوشگوار معاشرتی ماحول ضروری ہے۔ یہیں سے لوگوں کی زندگیوں میں نفسیاتی الجھنیں اور پریشانیاں جنم لیتی ہیں۔ ان کی اصل وجہ اسی قسم کے جھگڑالو والدین ہوتے ہیں۔

عدالت اور عائلی جھگڑے

بعض حلقوں کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ مرد کو طلاق دینے کا جو حق حاصل ہے، اس پر پابندیاں عائد کر کے اس کو محدود کر دیا جائے تاکہ اس کا انحصار صرف مرد کی خواہش پر نہ رہے، بلکہ یہ اختیار صرف عدالت کو حاصل ہو کہ وہ فریقین کے ثالث بٹھا کر ان میں

مصالحت کرائے اور اگر اس میں ناکام رہے، تو طلاق کی ڈگری جاری کر دے۔ مگر طلاق کی ڈگری کے اجراء سے پہلے ثالثوں کو معاملات کی پوری طرح چھان بین کرنی چاہیئے اور خاوند کو طلاق واپس لینے اور بیوی سے مصالحت کرنے پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیئے۔ جب یہ ساری تدابیر ناکام رہیں، تو صرف اسی وقت طلاق دی جائے اور اس کے اعلان کا اختیار خاوند کو نہیں، بلکہ صرف عدالت کو ہو۔

ہمارے خیال میں میاں بیوی میں مصالحت کی غرض سے اس طرح کی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں، اور ان پر قانوناً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے نزدیک عدالت کو اس معاملے میں مداخلت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ فقۂ اسلامی میں اس مسئلے کا جو حل موجود ہے، وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور حل کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک مصالحت کا تعلق ہے۔ اس کا زیادہ تر انحصار خود میاں بیوی پر ہے۔ اگر وہ دونوں خلوص سے صلح کے خواہاں ہوں، تو ان کے دوست احباب اتنے ہی مفید ثابت ہو سکتے ہیں، جتنا کہ کوئی عدالت۔ اگر ان کے دلوں میں یہ خواہش موجود نہ ہو، تو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی عدالت بھی ان میں مصالحت نہیں کرا سکتی۔ اب بھی دنیا میں ایسے ممالک موجود ہیں، جہاں جب افہام و تفہیم کے سارے ذرائع ناکام ہو جاتے ہیں، تو عدالتیں ہی طلاق نامے جاری کرتی ہیں، مگر اس کے باوجود ان ممالک میں ہر سال بے شمار طلاقیں واقع ہوتی ہیں۔ صرف امریکہ میں طلاق کی سالانہ شرح ۴۰ ٪ ہے، جو کہ دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

عدالت کی مداخلت کا تاریک پہلو

جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے کہ طلاق صرف اس وقت دی جائے، جب خاوند عدالت کو باقاعدہ ثبوت کے ذریعے مطمئن کر دے کہ سارا قصور اس کی بیوی کا ہے، اور وہ اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا، تو ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے عورت کا کچھ بھی بھلا ہوگا۔ آخر اس گھر میں رہنے میں اس کی کیا عزت ہے، جس میں دن رات اٹھتے بیٹھتے اس کو یہ جتلایا جاتا ہو کہ

اس کا خاوند اس سے بیزار ہے اور اس کے لیے اس کی حیثیت ایک بوجھ سے زیادہ نہیں۔ کیا ایسے گھر میں عورت کو رہنے پر اصرار کرنا چاہیئے تاکہ موقع پاکر خاوند کو دھوکا دے سکے؟ یقیناً کوئی قانون اس طرح کے طرزِ عمل کو پسندیدہ نہیں قرار دے سکتا، اور نہ وہ یہ برداشت کر سکتا ہے کہ نفرت کے اس گھر میں عورت مُہر بہ لب کُڑھتی اور ہر طرح کی ذلت سہتی رہے۔ کیا اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر اُسے ایسے گھر میں ٹھہرا رہنا چاہیئے؟ لیکن جس گھر میں بے انصافی کی ایسی تاریک فضا قائم ہو وہاں وہ بچوں کی تربیت کی ذمہ داریوں سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتی ہے؟

مسائل کے حل کی واحد راہ

واقعہ یہ ہے کہ ان تمام مسائل کا حل بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کی اخلاقی، ثقافتی، نفسیاتی اور روحانی تعلیم و تربیت میں مضمر ہے۔ جس کے لیے ذہنی تعمیر کے ایک طویل عمل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جاکر نیکی اور بھلائی کو غلبہ نصیب ہوتا ہے اور معاشرتی زندگی کے لیے ایک صحت مند اساس میسر آتی ہے۔ ایک ایسے پاکیزہ معاشرے میں ہی خاوند کے دل میں یہ احساس بیدار ہو سکتا ہے کہ ازدواج کا رشتہ ایک مقدس رشتہ ہے جس کو کسی وقتی جذبے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

زندگی کی تنظیمِ نو

اخلاقی اور روحانی ارتقا کا یہ عمل بہت سست اور طویل ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی قانون کی روشنی میں قوم کی معاشرتی زندگی کی تنظیمِ نو کی جائے، اور اس مقصد کے لیے تمام اجتماعی ادارے مثلاً گھر، مدرسہ، فلم، ریڈیو، پریس، ادب، دینی پیشوا اور عوام سب مل جل کر کوشش کریں۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ اور اس کے لیے بہت طویل مدت درکار ہے مگر پائیدار معاشرتی انقلاب لانا مقصود ہو تو اسے اپنائے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ پائیدار انقلاب کی یہی واحد راہ ہے۔

قانون کا بنیادی مقصد

اس کے برعکس ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عائلی قوانین کا بنیادی مقصد عدل و انصاف کے ایسے نظام کا قیام ہے جو طرفین یعنی خاوند اور بیوی دونوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے اور انہیں بے انصافی سے بچانے کے قابل ہو۔ طلاق اسی معاشرتی انصاف کے ایک تقاضے کو پورا کرتی ہے اور میاں بیوی کے لیے یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ اگر وہ امن و سکون سے زندگی نہ گزار سکیں، تو ایک دوسرے سے علحدہ ہو جائیں۔ اس ضمن میں ہمیں فقہ اسلامی کا یہ اہم اصل بھی یاد رکھنا چاہیے کہ "حلال چیزوں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق سب سے زیادہ ناپسندیدہ شے ہے۔"

ایک ہنگامی قانون

جہاں تک تعدد ازواج کا تعلق ہے، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ محض ایک ہنگامی قانون ہے اور اسلام کا کوئی بنیادی قانون یا اصول نہیں ہے۔ اس کے سلسلے میں قرآن میں ارشاد ہے :-

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

(۴ : ۳)

تو عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہوں اُن سے نکاح کرو۔ دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے۔ پس اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر بس کرو۔

جیسا کہ اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی صورت میں مرد اس امر کا پابند ہے کہ وہ ان سب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف کا برتاؤ کرے، جس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ مرد کو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ گویا جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے، اسلام تعدد ازدواج کے مقابلے میں یک زوجگی کے حق میں ہے، مگر بعض حالات میں یک زوجگی بھی انصاف کے بجائے بے انصا؟

کی علامت بن جاتی ہے۔ اس طرح کے غیر معمولی حالات کے لیے اسلامی قانون تعدّدِ ازدواج کی راہ کھلی رکھتا ہے، کیونکہ اگرچہ اس میں مکمل انصاف ناممکن الحصول ہے، تاہم ایسے ہنگامی حالات میں اس سے جو خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں، وہ ان خرابیوں سے کہیں کم ہیں، جو ایسے حالات میں یک زوجگی پر اصرار کرنے سے پیدا ہوسکتی ہیں۔

جنگیں

مثال کے طور پر جنگوں ہی کو لیجیے۔ ان میں مردوں کی بہت بڑی تعداد ختم ہوجاتی ہے جس سے عورتوں اور مردوں کا توازن بالکل درہم برہم ہوجاتا ہے۔ ایسے حالات میں تعدّدِ ازدواج ناگزیر معاشرتی ضرورت بن جاتی ہے کہ اس سے معاشرہ اس جنسی انارکی کے خطرے سے بچ جاتا ہے، جس کی وبا جنگوں کے بعد بالعموم پھوٹ پڑتی ہے، کیونکہ مردوں کی تعداد کم ہوجانے کے باعث بے شمار عورتیں بے سہارا رہ جاتی ہیں۔ ایسی بے سہارا عورتوں کی روزی کا انتظام تو ہوسکتا ہے، مگر ان کی جذباتی اور جنسی تسکین مشکل ہوجاتی ہے، چنانچہ ان حالات میں شدید خطرہ ہوتا ہے کہ یہ عورتیں مردوں کی ہوس رانی کا شکار بن جائیں، مگر حقیقی جذباتی تسکین سے پھر بھی ناآشنا رہیں اور وہ بچوں اور ان کی محبت کو جس کے بغیر ان کی زندگی میں کوئی حسن اور رنگینی باقی نہیں رہتی، ساری عمر ترستی ہی رہیں۔

فرانس کی زندہ مثال

کیا اس طرح کے ہنگامی حالات میں یہ مناسب ہے کہ ان بیواؤں کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے کہ وہ معاشرتی اخلاقیات کو پس پُشت ڈال کر جائز و ناجائز جیسے ممکن ہو، اپنی جنسی تسکین کرتی رہیں۔ فرانسیسی قوم کو ایسی ہی صورت حال سے سابقہ پیش آیا تھا جس کے نتیجے میں وہاں کے معاشرتی نظام کی چولیں ہل گئیں۔ بالآخر فرانسیسی قوم اپنی تمام تاریخی عظمت اور وقار کھو بیٹھی۔ اس طرح کے معاشرتی انتشار کے خطرے سے بچنے کی راہ صرف یہ ہے کہ قانون میں مرد کو واضح اور صریح الفاظ میں یہ اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح

کر سکے۔ بشرطیکہ وہ ان میں عدل ملحوظ رکھے۔ عدل کی اس شرط میں وہ جذباتی لگاؤ یا وابستگی شامل نہیں جو خاوند کو اپنی کسی خاص بیوی سے ہوتی ہے۔ اس میں مساوات اس کے بس کی بات نہیں ہے اور وہ چاہے بھی تو اس معاملے میں عدل کی کسوٹی پر پُورا نہیں اُتر سکتا۔

کچھ اور ناگزیر حالات

اسی طرح کے بعض اور ہنگامی حالات میں بھی تعدّد ازدواج ایک معاشرتی ضرورت بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر بعض مرد دُوسروں سے زیادہ قوتِ حیوانی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ایک بیوی پر اکتفا کر لینا بہت مشکل ہے، کیونکہ وہ چاہیں بھی تو اپنی زائد قوتِ حیوانی کو دبا نہیں سکتے۔ ایسے لوگوں کو بھی قانوناً دُوسری شادی کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ بصُورتِ دیگر یہ لوگ گھروں سے باہر اپنی گرل فرینڈز کے پاس سامانِ تسکین تلاش کریں گے اور معاشرے کو ایک ایسے کوڑھ میں مُبتلا کر دیں گے جس کی اجازت کوئی صحت مند معاشرہ نہیں دے سکتا۔

بیوی کا بانجھ پن

مزید براں بعض اور حالات بھی پیش آ سکتے ہیں، جن میں تعدّدِ ازدواج ہی بہت سے مسائل کا واحد حل ہو۔ مثلاً بیوی کا بانجھ پن، یا اس کا کسی ایسے دائمی مرض میں مبتلا ہونا جس کی وجہ سے وہ زن وشو کے تعلّق کے قابل ہی نہ رہے۔ پہلی صُورت میں یعنی اگر بیوی بانجھ ہے، تو بلاشُبہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں کہ اس کو ملامت کا ہدف بنایا جائے، لیکن سوال یہ ہے کہ خاوند اس کی وجہ سے اولاد کی نعمت سے محروم کیوں رہے؟ حالانکہ اولاد کی خواہش انسانی دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ اس صورتِ حال کا واحد معقول علاج دوسری شادی ہی ہے۔ پہلی بیوی چاہے تو اپنے خاوند اور اس کی دُوسری بیوی کے ساتھ رہے اور چاہے، تو طلاق لے کر الگ ہو جائے۔ رہ گئی وہ بیوی جو کسی مزمن مرض

ہیں مبتلا ہو، تو اس کے معاملے میں غور کرتے وقت یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ صنفی تعلق ایک پست جذبے کی پیداوار ہے اور محض اس کی خاطر خاوند کو اپنی معصوم بیوی کی خوشی اور اطمینان کو پامال نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہاں پر اصل مسئلہ یہ نہیں کہ جنسی جذبہ اعلیٰ و ارفع ہے یا گھٹیا اور پست، بلکہ اصل مسئلہ انسان کی عملی ضرورت کا ہے جس کو نظر انداز بہرحال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس معاملے میں خاوند اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی بیوی کی خوشی پر آمادہ ہو اور جنسی حظ سے محرومی گوارا کر لے، تو اس کا یہ جذبہ نہایت پاکیزہ اور اس کی فیاضی کا اظہار ہوگا اور اس کی تحسین کی جائے گی، مگر اللہ تعالیٰ کسی انسان پر اس کی قوت اور استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، کیونکہ حقائق کا سامنا کرنا زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ ہے اور اس دکھاوے کی شرافت سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہے جس کے پردے میں ہر طرح کی برائیوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے، جیسا کہ ان اقوام میں نظر آتا ہے جن میں تعددِ ازدواج ممنوع ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں وہ حالات بھی پیشِ نظر رکھنے چاہییں جن میں خاوند مجبور ہوتا ہے۔ اور وہ بیوی کو نہ محبت دے سکتا ہے اور نہ اسے طلاق دے کر آزاد ہی کر سکتا ہے۔ ایسے تمام حالات میں تعددِ ازدواج ہی مسئلے کا واحد حل ہے۔

مسئلے کا کچھ اور پہلو

اب ہم چاہتے ہیں کہ مسئلۂ زن کے بعض پہلوؤں کا بھی جائزہ لیتے چلیں جن کے بارے میں شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔

نقل و حرکت کا حق

سب سے پہلے گھر سے باہر محنت مزدوری کرنے اور نقل و حرکت کرنے کے حق کا مسئلہ ہے۔ اسلام عورت کو محنت مزدوری اور نقل و حرکت کا مکمل حق دیتا ہے۔ صدرِ اول میں جب کبھی کوئی حقیقی ضرورت ہوتی تھی، مسلمان عورتیں گھروں سے باہر کام کرتی تھیں۔ اسی

طرح اسلام عورتوں کو سماجی اداروں مثلاً تعلیم نسواں کے ادارے، نرسنگ اور عورتوں کی طبی امداد کے مراکز میں کام کرنے سے بھی نہیں روکتا، بلکہ اگر ضرورت ہو تو ہنگامی حالات میں جس طرح مردوں کی خدمات حکومت مستعار لے لیتی ہے، اسی طرح ان کی خدمات بھی ان مقاصد کی خاطر مستعار لی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی عورت بالکل ہی بے سہارا ہو، اور کوئی مرد موجود نہ ہو تو عورت روزی کمانے کیلیے بھی گھر سے باہر نکل سکتی ہے، مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام عورت کو اپنا گھر چھوڑنے کی اجازت صرف اسی صورت میں دیتا ہے جب کوئی واقعی ضرورت یا مجبوری لاحق ہو کہ اس کے بغیر اور چارہ ہی نہ رہے۔

عام حالات میں جب کوئی خاص مجبوری نہ ہو، اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ عورت خواہ مخواہ گھر کو چھوڑے، جیسا کہ مغربی اور اشتراکی ممالک میں ہوتا ہے۔ ایسا کرنا اسلام کی نگاہ میں محض حماقت ہے، کیونکہ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی غرض سے جب عورت اپنے گھر کو خیرباد کہتی ہے، تو اس سے اس کے اصل اور بنیادی وظیفۂ حیات پر مضر اثرات پڑنا ناگزیر ہے جس کو وہ گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر ہی بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ جب بلا ضرورت وہ گھر چھوڑتی ہے تو معاشرے میں بہت سی نفسیاتی، سماجی اور اخلاقی الجھنیں بھی پیدا کر دیتی ہے۔

خسارے کا سودا

یہ بات کہ عورت جسمانی، ذہنی اور وجدانی اعتبار سے اپنے اصل مقصدِ حیات یعنی ماں بننے کے لیے بہترین صلاحیتوں سے آراستہ ہے، ایک ایسی حقیقت ہے جس کو جھٹلانا ناممکن ہے۔ لہٰذا اگر اس کی توجہ دوسری غیر ضروری سرگرمیوں کی طرف مبذول ہو جائے اور وہ اپنے اصل فریضے سے غافل ہو جائے، تو ظاہر ہے کہ نقصان پوری انسانیت کو پہنچے گا اور وہ ماں بننے کے بجائے مردوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا، ان کی دل لگی کا سامان اور تفریح کا ایک مشغلہ بن جائے گی اور اس کی متاعِ حیات عیاشی اور ہوسناکی کی نذر ہو جائے گی۔ اسلام اس صورتِ حال کو بھی برداشت نہیں کرتا، کیونکہ اس کا

امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ وہ انسانیت کو ایک ایسی مربُوط وحدت سمجھتا ہے جو وقت کے ساتھ بدلتی اور تبدیل نہیں ہوتی ۔

ایک بے بُنیاد خیال

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بچّوں کو اَنا کے سپرد کر کے اگر کوئی عورت گھر سے باہر کوئی ملازمت کر لے، تو آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے ؟ اس طرح وہ نہ صرف کما سکتی ہے، بلکہ ماں کی حیثیت سے اپنا بُنیادی فریضہ بھی پورا کر سکتی ہے، مگر یہ ایک بے بُنیاد اور نامعقول خیال ہے، کیونکہ کوئی اَنا خواہ کتنی ہی اچھی ہو اور بچّوں کی جسمانی، ذہنی یا نفسیاتی نشو و نما میں دلچسپی لیتی ہو، ایک معاملے میں معذور ہے ۔ وہ ماں نہیں بن سکتی اور نہ ماں کی جگہ لے سکتی ہے اور نہ بچّوں کو ماں کی وہ محبّت اور شفقت دے سکتی ہے، جس کے بغیر گلستانِ حیات ویران اور اخلاقِ انسانی پژمردگی کا شکار ہو جاتے ہیں ۔

مغربی تہذیب کے فرزند ہوں یا اشتراکی نظام کے آشفتہ مو علمبردار، ان کی بے معنی چیخ پکار فطرتِ انسانی میں ہرگز کوئی تغیّر پیدا نہیں کر سکتی ۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کے ابتدائی دو برس میں تو بچّے کو ماں کی ہمہ وقتی اور ہمہ جہتی شفقت اور توجّہ کی اتنی شدید احتیاج ہوتی ہے کہ اس میں وہ کسی اور کی، خواہ وہ اس کا بھائی یا بہن ہی کیوں نہ ہو، شرکت گوارا نہیں کر سکتا ۔ کوئی اَنا یا نرس بچّوں کو ماں کی یہ شفقت اور توجّہ کیسے دے سکتی ہے ؟ بالعموم ایک اَنا کو بیک وقت دس دس بیس بیس بچّوں کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے ۔ اس طرح کی کرائے کی ماں کے زیرِ سایہ پلنے والے بچّے ہمیشہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں ۔ کبھی ایک دُوسرے کے کھلونوں پر قبضہ کرنے کے لیے اور کبھی اس مصنوعی ماں کی توجّہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے، چنانچہ رفتہ رفتہ یہ لڑائی جھگڑا ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے اور بڑے ہونے پر تو ان کے دل محبّت و شفقت کی گرمی سے ناآشنا اور لطیف جذبات سے محروم ہو جاتے ہیں ۔

مسلمان خاوندوں، باپوں اور بھائیوں سے ایک سوال

اگر کوئی حقیقی ضرورت لاحق ہو، تو بچّوں کی دیکھ بھال کے لیے کوئی انتظام رکھی جا سکتی ہے، مگر اس قسم کی ضرورت کے بغیر ایسا کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ اہلِ مغرب تو ممکن ہے کہ اپنے بعض مخصوص تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور معاشی حالات کی بنا پر ایسا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہوں، مگر مشرق کے مسلمانوں کے لیے تو ایسا کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ کیا ہمارے ہاں مردوں کی تعداد میں واقعی اس قدر کمی واقع ہو گئی ہے کہ گھر سے باہر کی دُنیا کا نظام چلانے کے لیے بھی اب ہمیں عورتوں کی مدد کی ضرورت ہے؟ یا مسلمان مردوں، باپوں، بھائیوں، خاوندوں اور رشتہ داروں کے دلوں سے ساری حمیّت اور غیرت رخصت ہو چکی ہے اور اپنی بیویاں، بیٹیاں اور بہنیں بھی اب ان پر بوجھ ہیں؟ اور اس لیے وہ بے چاری مجبور ہیں کہ اپنا بوجھ خود اُٹھائیں اور دفتروں اور کارخانوں میں جا جا کر ملازمتیں کریں؟

دُنیائے اسلام کی غربت

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملازمت کرنے سے عورت کو معاشی آزادی حاصل ہوتی ہے جس سے معاشرے میں اسکی قدر و منزلت بڑھتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام نے عورت کی آزاد معاشی حیثیت سے انکار کب کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دُنیائے اسلام کو جو مسائل درپیش ہیں، وہ ہمارے نظامِ زیست کی خرابی کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ اُس ہمہ گیر غربت و افلاس کی پیداوار ہیں، جس کی وجہ سے کیا مرد اور کیا عورتیں سبھی پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی کی سہولتوں سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم اپنی مادی پیداوار کو بڑھائیں تاکہ ساری قوم خوشحال ہو اور ہم میں کوئی غریب یا محتاج نہ رہے۔ ذرائع پیداوار کی ملکیت کے بارے میں اس وقت عورت اور مرد میں جو دوڑ جاری ہے، وہ اس مسئلے کا حل ہرگز نہیں ہے۔

ملازمت کا ایک اور نقصان

عورت کی ملازمت کے حق میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ اس طرح سے وہ کنبے کی آمدنی میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ دو افراد کی کمائی گھر کے ایک فرد کی کمائی سے بہرحال زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بات بعض گھرانوں کے بارے میں صحیح ہو سکتی ہے، لیکن اگر ساری عورتیں ملازمتیں اختیار کر لیں، تو عائلی نظام چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ میاں بیوی کافی دیر تک ایک دوسرے سے جدا رہیں گے، جس کی وجہ سے معاشرے میں اخلاقی برائیوں کی وبا پھوٹ پڑے گی۔ کیا واقعی کوئی ایسی ناگزیر معاشی، معاشرتی یا اخلاقی مجبوری موجود ہے جس کی وجہ سے عورت کا گھر سے باہر نکلنا اور اس کی خاطر اتنی بڑی قیمت ادا کرنا ضروری ہو؟

یہ رتبۂ بلند

اسلام نے عورت کا فطری وظیفہ کامل یکسوئی اور اطمینانِ خاطر سے نسلِ انسانی کی افزائش اور پرورش کو قرار دیا، تو اس کے سامنے انسانی فطرت اور معاشرے دونوں کے مطالبات تھے۔ اسی لیے اسلام نے عورت کی معاشی کفالت کا سارا بوجھ مرد پر ڈالا تاکہ عورت تمام غیر ضروری تفکّرات سے محفوظ رہ سکے، مگر اس کے ساتھ ہی اس نے عورت کا معاشرتی مقام اس قدر بلند کر دیا کہ جب ایک شخص نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا: "میرے حُسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟" تو آپ نے فرمایا: "تیری ماں۔" اس شخص نے پوچھا: "پھر؟" حضورؐ نے جواب دیا: "اس کے بعد تیری ماں۔" اس شخص نے پھر پوچھا: "اس کے بعد کون میرے حُسنِ سلوک کا مستحق ہے؟" حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "تمہارا باپ[1]۔"

اسلام اور جدید تحریک آزادیٔ نسواں

اسلام نے عورت کو جو عزت اور مقام بخشا ہے اس کو دیکھتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا کہ

---

[1] بخاری اور مسلم۔

جدید مسلمان عورت کے حقوق کے نام پر اس سارے ہنگامے کا آخر مقصد کیا ہے؟ کیا کوئی ایسا حق باقی ہے، جو اسلام نے عورت کو نہیں دیا جس کی وجہ سے وہ اپنے حقوق کی خاطر باقاعدہ مہمیں چلانے اور حق رائے دہی اور پارلیمانی نیابت کی طرح کے ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہے؟ آئیے ذرا ان مطالبات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔

انسانی مساوات

آج کی مسلمان عورت کا مطالبہ ہے کہ اس کو مساوی انسانی درجہ دیا جائے، مگر شاید اسے معلوم نہیں۔ اسلام اسکو یہ حق آج سے بہت پہلے دے چکا ہے۔ نظری طور پر نہیں، بلکہ عملاً بھی اور قانوناً بھی۔

معاشی آزادی کا مطالبہ

وہ معاشی آزادی کی طالب ہے اور معاشرتی زندگی میں براہِ راست حصہ لینے کا حق مانگتی ہے، حالانکہ اسلام دُنیا کا پہلا مذہب ہے، جس نے اس کو یہ حق عطا کیا ہے۔

تعلیم کا حق

وہ اپنے لیے تعلیم حاصل کرنے کا حق چاہتی ہے؟ اسلام نہ صرف اس کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے، بلکہ اس پر اس کا حصول فرض قرار دیتا ہے۔

اپنی پسند سے شادی کا حق

کیا وہ اپنے لیے یہ حق مانگتی ہے کہ اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر اس کی شادی نہ کی جائے؟ اسلام اس کا نہ صرف یہ حق تسلیم کرتا ہے بلکہ اپنی شادی خود طے کرنے کا حق بھی اس کو دیتا ہے۔

انصاف، شفقت اور قانونی تحفظ

کیا وہ یہ چاہتی ہے کہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر وہ اپنے فرائض بجا لائے اور اس کے ساتھ انصاف اور مہربانی کا برتاؤ کیا جائے؟ اور اگر اس کا خاوند اس سے بدسلوکی اور بے انصافی کا مرتکب ہو، تو اس کو اس سے علیحدگی کا حق حاصل ہو۔ اسلام عورت کو یہ سارے حقوق دیتا ہے اور مردوں پر یہ لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اس کے ان حقوق کی حفاظت کریں۔

ملازمت کا حق

اور کیا وہ گھر سے باہر کام کاج اور ملازمت کا حق مانگتی ہے؟ اسلام اس کا یہ حق بھی تسلیم کرتا ہے۔

ایک استثناء

لیکن اگر وہ یہ چاہتی ہے کہ اسے چھچھور پن اور اخلاق باختگی کے مظاہرے کرنے کی آزادی دی جائے اور اس کی انسانیت سوز سرگرمیوں پر بھی کوئی گرفت نہ کی جائے، تو ظاہر ہے کہ اسلام کے ہاں اس کو یہ آزادی اور چھوٹ حاصل نہیں ہو سکتی، کیونکہ اسلام ان سب چیزوں کو انسانی عزّ و شرف کے منافی سمجھتا ہے اور یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی عورت یا مرد ان میں پڑ کر اپنی انسانیت میں بٹہ لگائے، لیکن اگر آج کی عورت کو یہی کچھ مطلوب ہے، تو اس کے لیے اسے پارلیمانی نیابت کا سہارا لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے تو اسے بس صبر سے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ جب معاشرتی روابط اور اجتماعی روایات پوری طرح انتشار کی وبائے عام کی نذر ہو جائیں۔ اس کے بعد اس کا گوہرِ مقصود بھی خود بخود حاصل ہو جائے گا اور وہ بغیر کسی اخلاقی قدغن کے کھل کھیل سکے گی۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ مشرقی ممالک کے حالات اور زندگی کی اقدار مغرب کے حالات اور اقدار سے بالکل مختلف ہیں، یہ کہتے ہیں کہ مشرقی عورت

کا معاشرتی مقام اتنا پست ہے کہ انسان اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف مغربی عورت کو آزادی بھی حاصل ہے اور معاشرتی عزّت بھی۔ اس لیے کیوں نہ مشرقی عورت بھی مغربی عورت کی پیروی کرتے ہوئے اپنے غصب شدہ حقوق کو واپس حاصل کرنے کی کوشش کرے؟

مسلمان عورت کی موجودہ حالت

ہم مان لیتے ہیں کہ اس وقت مسلم ممالک کی عورتیں بالعموم پسماندگی کا شکار ہیں انہیں نہ معاشرتی عزت حاصل ہے اور نہ کوئی وقار اور احترام۔ وہ اس وقت بالکل حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ یہ سب باتیں درست سہی مگر سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کی ذمّہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کیا اسلام اور اس کی تعلیمات کو کسی لحاظ سے بھی اس کا ذمّہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آج مشرقی عورت جس حالتِ زار میں مُبتلا ہے، وہ ان اقتصادی، سماجی، سیاسی اور نفسیاتی حالات کا نتیجہ ہے۔ جن سے آج کا مشرق دوچار ہے۔ اگر ہم اپنی سماجی زندگی کی اصلاح کے متمنی ہیں تو ہمیں ان حالات پر بھی نگاہ ڈالنی ہوگی تاکہ ہم خرابیوں کے سرچشمے کو معلوم کر سکیں۔

مصائب کی جڑ

مشرقی عورت کی مصیبتوں کی جڑ وہ غربت اور افلاس ہے، جس میں گزشتہ کئی نسلوں سے مشرق گرفتار ہے۔ نیز اس کی وجہ وہ سماجی بے انصافی ہے جس کی وجہ سے کچھ لوگ تو داد عیش دیتے ہیں، جب کہ اکثریت کے پاس نہ تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا ہے اور نہ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی۔ یہ نتیجہ ہے اس سیاسی گھٹن اور استبداد کا جس کی وجہ سے لوگ حاکم و محکوم کے دو مستقل طبقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ حکمران طبقہ کے لوگ ساری سہولتیں تو اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں، مگر ذمہ داریاں ساری کی ساری عوام کے سر ڈال دیتے ہیں۔ وہ خود کوئی ذمّہ داری قبول کرتے ہیں اور نہ عوام کو ان کا کوئی حق دیتے ہیں۔ اس وقت مشرق کی معاشرتی زندگی پر

استبداد کے جو تاریک بادل چھائے ہیں، وہ انہی معاشرتی عوامل کی پیداوار ہیں۔ مشرقی عورت کی موجودہ تذلیل اور مصائب و آلام کے ذمے دار بھی یہی معاشرتی حالات ہیں۔

افلاس زدہ ماحول

آج کی عورت مرد کے ساتھ باہمی محبت اور احترام کے رشتے استوار کرنا چاہتی ہے مگر مشرق کے موجودہ گھٹے گھٹے اور افلاس زدہ ماحول میں اسے یہ محبت اور احترام کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس ماحول اور ان حالات نے صرف عورت ہی کو مبتلائے آلام نہیں کر رکھا، بلکہ خود مرد بھی جس کی حالت بظاہر کچھ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ ان کا زخم خوردہ ہے۔

معاشرتی بے انصافی کا ردِ عمل

مرد گھر میں عورت سے جس طرح بدسلوکی کرتا ہے اور اسے ظلم و ستم کا تختہ مشق بناتا ہے، وہ دراصل اس سختی اور بے انصافی کا ردِ عمل ہے جو اس کے اردگرد کے لوگ اس سے روا رکھتے ہیں۔ معاشرے میں اس کو ذلیل ہونا پڑتا ہے اور اس کی عزتِ نفس کبھی گاؤں کے چودھریوں کے ہاتھوں مجروح ہوتی ہے کبھی پولیس والے اور کارخانہ دار اس کی خودی کو ٹھیس پہنچاتے ہیں اور کبھی خود سربراہ مملکت اس کی تذلیل کا باعث بن جاتا ہے۔ معاشرے میں اس کو ہر جگہ ذلت اور نامرادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، مگر وہ کسی سے کوئی انتقام نہیں لے سکتا، چنانچہ وہ اپنا سارا غصہ گھر میں آ کر بیوی بچوں یا اپنے ساتھیوں پر اتارتا ہے۔

یہی افلاس کی لعنت ہے، جو مرد کو اس قدر نچوڑ لیتی ہے کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں سے محبت، ہمدردی اور بردباری کا برتاؤ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا اور یہی وجہ ہے کہ عورت اپنے خاوند کے ہاتھوں ہر قسم کا ظلم و ستم اور بدسلوکی برداشت کرتی ہے مگر دم نہیں مارتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اگر اس کے خاوند نے اس کو گھر سے نکال دیا، تو اسے فاقوں مرنا پڑے گا حتیٰ کہ اس خوف سے وہ اپنے قانونی حقوق کا مطالبہ کرنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتی مبادا اس کا خاوند ناراض ہو کر اس کو طلاق دے دے۔ اس کے اپنے والدین اتنے مفلس ہوتے ہیں کہ وہ اس کا بوجھ نہیں

اٹھا سکتے۔ اور اگر وہ خاوند کے گھر کو چھوڑ کر ان کے گھر جا بیٹے تو وہ بھی اس کو یہی نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے خاوند کے گھر لوٹ جائے اور جیسے تیسے ہر قسم کا جور و ستم صبر و سکون سے سہتی رہے۔ مشرق میں آج عورت کی تذلیل اور تحقیر کی یہ ایک بڑی وجہ ہے۔

اعلیٰ نصب العین کا فقدان

ثانیاً اپنی پسماندگی کی وجہ سے آج کا مشرق کسی بلند نصب العین اور خود شناسی دونوں سے محروم ہے اور اس پر جہالت کے گھرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ مشرق اعلیٰ انسانی اقدار کا ادراک بھی کھو چکا ہے۔ اور اب لے دے کر وہ ایک ہی قدر کو تسلیم کرتا ہے اور وہ ہے قوت اور اس کے مظاہر کی پرستش اور کمزوروں سے نفرت اور ان کی تذلیل۔ چنانچہ کسی کا کمزور ہونا اس کے نزدیک اسے ذلیل اور رسوا کرنے کے لیے کافی ہے۔

قوت کی پرستش

قوت کی اس پرستش کی وجہ سے مرد عورت کو حقیر سمجھتا ہے۔ اپنے مقابلے میں جسمانی لحاظ سے کمزور عورت کے احترام کے لیے جس اخلاقی نفاست اور بلندی کی ضرورت ہے مرد اس سے محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کا دل عورت کی انسانیت کے احترام سے خالی ہے۔ اور وہ اُسے وہ عزت و وقار نہیں دے سکتا۔ جو احترامِ آدمی کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر کوئی عورت مال و دولت کی مالک ہو، تو مشرق کے موجودہ مادیت زدہ ماحول میں اس کو ہر عزت اور منصب حاصل ہو سکتا ہے۔

پسماندہ معاشرے

اسی طرح پس ماندہ معاشروں میں جن کی ایک مثال ہمارا آج کا مشرق ہے، انسان اس قدر گر جاتے ہیں کہ خالص حیوانی سطح یا اُس کے قریب قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اس قسم کے معاشرے جنس زدہ ہوتے ہیں اور زندگی کے بارے میں ان کے تمام نظریات اور معاملات میں جنس کی رنگ آمیزی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان معاشروں میں عورت مرد کی حیوانی خواہشات اور شہواتِ نفسانی کی

تسکین کا محض ایک ذریعہ ہوتی ہے[1]۔ اس کو بحیثیت انسان کوئی عزت اور وقار حاصل نہیں ہوتا کیونکہ نفسیاتی، ذہنی اور روحانی لحاظ سے وہ مرد سے اتنی پست خیال کی جاتی ہے کہ اس کو نہ کسی احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور نہ وہ اس کے لیے کوئی مطالبہ ہی کر سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت اور مرد کا جسمانی تعلق خالص حیوانی تعلق بن جاتا ہے جس میں نر کو ہمیشہ مادہ پر فوقیت حاصل ہوتی ہے، جو مطلب نکل جانے کے بعد اپنی مادہ کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔

جہالت اور بھوک

چونکہ پسماندہ معاشرے ہمیشہ جہالت اور بھوک کا شکار رہتے ہیں، اس لیے ان کے پاس نہ اتنا وقت ہوتا ہے اور نہ اتنی قوت کہ وہ اخلاق اور نظم و ضبط کے لحاظ سے ارتقاء کر سکیں حالانکہ ان اوصاف کے بغیر کوئی معاشرہ اعلیٰ انسانی معاشرہ ہونے کا اعزاز حاصل نہیں کر سکتا اور نہ خالص حیوانی سطح سے اوپر ہی اٹھ سکتا ہے۔ معاشرے میں اس طرح کے اخلاقی اور روحانی نظم کے فقدان یا اس کی کسی ناموزوں صورت شکل میں موجودگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی محض معاشیات بن کر رہ جاتی ہے۔ قوت اور اقتدار کی پرستش ہوتی ہے اور زندگی کو محض حیوانی خواہشات کے پیمانے سے ماپا اور تولا جاتا ہے۔

ماں کا غلط رویہ

اس طرح کے پسماندہ معاشرے میں ماں کی حیثیت سے عورت ایک غلط رویہ اپناتی ہے، اور یوں غیر شعوری طور پر طبقۂ نسواں کے بارے میں مرد کے نقطۂ نظر میں خرابی کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ اپنے چھوٹے سے بچے کو ایک ننھا سا آمرِ مطلق بنا کر رکھتی ہے، جو صرف حکم دینا اور اطاعت کرانا جانتا ہے۔ اس کی محبت اتنی اندھی ہوتی ہے کہ اپنے بچے کے لایعنی مطالبات اور خواہشات پر وہ کوئی معقول پابندی لگا ہی نہیں سکتی۔ بلکہ اس کی ہر فضول اور نامعقول خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس حد سے زیادہ بڑھے ہوئے لاڈ پیار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا بچہ جب جوان

---

[1] اسی طرح عورت مرد کو اپنی خواہشاتِ نفس کی تسکین کا محض ایک آلہ سمجھنے لگتی ہے۔ بس فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ مرد چونکہ کماتا ہے اور گھر کا مالک ہوتا ہے، اس لیے وہ اس حظِ نفسانی میں سے بھی عورت کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی حصہ وصول کر لے جاتا ہے۔

ہوتا ہے، تو وہ اپنی خواہشاتِ نفس کا بے بس غلام ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ بلا چون وچرا اس کے ہر حکم کو بجا لائیں۔ لیکن عملی زندگی میں جب اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی، تو وہ جھنجلا جاتا ہے اور اپنی اس جھنجلاہٹ کا بدلہ اپنے اردگرد کے لوگوں، مردوں، عورتوں اور بچوں سے لیتا ہے، اور انہیں اپنے غصے کا نشانہ بناتا ہے۔

یہ ہیں چند بڑے بڑے اور اہم اسباب اس بے چینی اور اضطراب کے جس میں آج سارا مشرق گرفتار ہے۔ خاتونِ مشرق کے موجودہ مصائب اور تحقیر و تذلیل کا راز بھی انہی اسباب میں پوشیدہ ہے۔ مگر یہ اسباب نہ تو اسلام کے پیدا کردہ ہیں اور نہ یہ صحیح اسلامی روح سے کوئی مطابقت ہی رکھتے ہیں۔

اسلام اور مشرق کی موجودہ غربت

کیا مشرق کی موجودہ غربت اور افلاس اسلام کا نتیجہ ہے؟ یقیناً نہیں۔ کیونکہ اسلام نے تو اپنے مثالی دور ــــ یعنی حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کے دور میں معاشرے کو اس قدر خوشحال بنا دیا تھا کہ اس میں لوگ ڈھونڈتے تھے مگر انہیں کوئی خیرات لینے والا نہیں ملتا تھا۔ اسلام زندگی کا ایک عملی نظام ہے، جس نے عمل کی دنیا میں یہ عظیم معاشی معجزہ رونما کر دکھایا تھا۔ اسی اسلام کو اور اسی نظامِ زیست کو ہم آج پھر سے دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بحیثیت نظامِ زندگی اسلام چاہتا ہے کہ قوم کی دولت اس کے افراد میں انصاف اور عدل کے ساتھ تقسیم کی جائے۔

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (الحشر: ۷)

تاکہ مال تمہارے امیروں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔

اسلام افلاس کو نہ بنظرِ استحسان دیکھتا ہے اور نہ اس کو کوئی پسندیدہ چیز سمجھتا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ دنیا سے اس کا وجود مٹ جائے۔ اسی طرح وہ عیاشی اور بدمستی کی بھی کسی کو اجازت نہیں دیتا۔

جدید مشرقی عورت کے مصائب کا سب سے اہم سبب افلاس ہے۔ اگر اس کا خاتمہ ہو جائے، تو عورت کے بیشتر مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس کو کھوئی ہوئی

عزت واحترام بھی حاصل ہو جائے گا۔ اور پھر اس کی خاطر اس کو گھر سے باہر جا کر ملازمتیں تلاش کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی (اگرچہ یہ حق ملازمت اس کو پھر بھی حاصل رہے گا) کیونکہ اب وہ بھی قوم کی بڑھی ہوئی خوشحالی اور دولت میں سے قانون وراثت کے ذریعے اپنا جائز حصہ پائے گی، جس کو وہ چاہے تو اپنے ذاتی آرام وآرائش پر خرچ کر سکے گی۔ اس طرح جب عورت مادی لحاظ سے خوشحال ہو جائے گی، تو مرد بھی اس کا احترام کرنے لگیں گے اور وہ افلاس

کے خوف اور خطرے سے بالکل آزاد ہو کر پوری بے باکی سے اپنے جائز قانونی حقوق استعمال کر سکے گی۔

سیاسی بے انصافی اور اسلام

اچھا تو جدید مشرق میں اس وقت جو سیاسی بے انصافی پائی جاتی ہے، اور جس کے رد عمل میں مرد گھر میں اپنی بیوی بچوں پر اپنا غم وغصہ اتارتا ہے، کیا وہ اسلام کی پیدا کردہ ہے؟

اسلام کو اس سیاسی بے انصافی کا ذمہ دار بھی نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ کیونکہ وہ ظلم اور بے راہروی کے سامنے سر جھکانا نہیں سکھاتا، بلکہ ان کے سامنے ڈٹ جانے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور حکمرانوں اور رعایا کے باہمی تعلقات کو ایسی عادلانہ بنیادوں پر منظم کرتا ہے کہ ایک بار جب خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ نے لوگوں سے فرمایا: "سنو اور اطاعت کرو" تو ایک آدمی نے فوراً اٹھ کر جواب دیا: "ہم اس وقت تک، نہ آپ کی بات سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے، جب تک آپ ہمیں یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ جو چادر اوڑھے ہوئے ہیں، وہ آپ نے کہاں سے حاصل کی ہے"۔ یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ غصہ سے لال پیلے نہیں ہوئے۔ بلکہ آپ نے اس شخص کی جرأت کی تعریف کی اور سب کے سامنے اصل حقیقتِ حال کی وضاحت کی۔ جس پر وہی شخص پھر کھڑا ہوا اور کہنے لگا: "اب آپ فرمائیے۔ ہم اطاعت کے لیے حاضر ہیں"۔ آج ہم یہی نظامِ حکومت دوبارہ قائم کرنے کے متمنی ہیں۔ تاکہ کوئی حکمران اپنی قوم کو استبداد کا نشانہ نہ بنا سکے۔ اور عوام میں اتنی جرأت ہو کہ وہ پوری بے باکی سے اپنے حکمرانوں کے منہ پر دل کی بات کہہ سکیں اور گھروں میں اپنی بیویوں اور بچوں سے ان کے تعلقات انصاف، محبت اور اخوت کی اساس پر استوار ہوں۔

اعلیٰ انسانی اقدار اور اسلام

اچھا، تو کیا اعلیٰ انسانی اقدار کے انحطاط کا باعث اسلام ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے۔ اسلام اعلیٰ انسانی اقدار کے زوال کا ہرگز باعث نہیں ہے۔ وہ تو انسان کو اعلیٰ روحانی قدروں سے روشناس کرکے اسے بہتر انسان بناتا ہے۔ اُسی نے تو انسان کو پہلی بار یہ سکھایا تھا کہ دولت، قوت اور طاقت عزت و برتری کا پیمانہ نہیں ہیں بلکہ اس کا اصل معیار تقویٰ اور نیکی ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات) — بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

جب اسلام کی سکھائی ہوئی ان اعلیٰ اقدارِ حیات کو ایک بار معاشرے میں استحکام حاصل ہوتا ہے، تو پھر عورت کو محض اس لیے بنظرِ تحقیر نہیں دیکھا جاتا کہ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور ہے۔ بلکہ اسلامی معاشرے میں آدمی کی شرافت اور انسانیت کی کسوٹی اس کا اپنی بیوی سے سلوک ہوتا ہے چنانچہ آنحضورؐ کا ارشاد ہے:

خیرکم خیرکم لأھلہ و أنا خیرکم لاھلی

تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے، جس کا سلوک اپنے گھر والوں سے اچھا ہے اور اپنے گھر والوں سے سلوک کے لحاظ سے میں تم میں سب سے اچھا ہوں۔

اس حدیث نبوی سے نہ صرف نفس انسانی کے اس گہرے شعور و ادراک کا پتہ چلتا ہے، جو شارع اسلام کو حاصل تھا، بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی بدسلوکی کا مرتکب صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ خود نفسیاتی الجھنوں اور عوارض میں مبتلا ہو یا صحیح معیارِ انسانیت سے گر چکا ہو۔

کیا انسان کے موجودہ انحطاط اور اس کی زندگی میں حیوانیت کے موجودہ غلبے کا باعث اسلام ہے؟ یقیناً یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام تو اس بات کو گوارا ہی نہیں کرتا کہ انسان اتنی پست سطح پر گر کر اس طرح سے حیوانوں کی سی زندگی گزارنے لگیں۔ اس کے برعکس وہ تو انسان کو روحانی

لحاظ سے اس قدر بلند کر دینا چاہتا ہے کہ اس کے بعد وہ محض اپنی خواہشات کے غلام بن ہی نہیں سکتے اور نہ زندگی کے بارے میں ان کا زاویۂ نگاہ کبھی حیوانی ہو سکتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں مرد اور عورت کا صنفی تعلق محض حیوانی رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کی ایک طبعی ضرورت کا اظہار ہے۔ چنانچہ وہ زن و شو کے تعلق کو سند جواز عطا کرتا ہے تاکہ اس طرح مرد اور عورت جنس زدگی کے خطرے میں مبتلا ہوئے بغیر زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو پوری یکسوئی اور اطمینان سے جاری رکھ سکیں، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اگر ان کے جنسی داعیات کی تسکین کا یہ جائز دروازہ بھی بند کر دیا گیا، تو عورت اور مرد دونوں بے راہ روی کے شکار ہو جائیں گے۔ اسی لیے اسلام تعلق زن و شو کو برا نہیں سمجھتا مگر وہ اس میں حد سے زیادہ دلچسپی کو بھی پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی توانائیاں زندگی کے صرف اعلیٰ و ارفع مقاصد کے حصول میں صرف کرے۔ مرد اللہ کی راہ میں مسلسل مصروف جہاد ہو اور عورت گھر میں رہ کر بچوں کی تربیت اور دوسرے گھریلو امور کی نگرانی کرے۔ یوں اسلام مردوں اور عورتوں دونوں کو زندگی کا بلند اور پاکیزہ نصب العین عطا کرتا ہے۔ اور انہیں انسانوں کی طرح رہنا سکھاتا ہے۔

کیا اخلاقی اقدار میں موجودہ فساد اور انتشار اسلام کا لایا ہوا ہے؟ اس کا جواب بھی ایک زور دار نفی میں ہے۔ کیونکہ قرآن پاک اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ انسان میں روحانی پاکیزگی اور نفاست پیدا کرتا ہے اور اس کو دوسروں سے معاملہ کرتے وقت اسی طرح ضبط نفس، انصاف اور احترام آدمیت کی تعلیم دیتا ہے، جس طرح وہ خود دوسروں سے ان کا طالب ہوتا ہے۔

ہماری معاشرتی روایات

تو کیا پھر ہماری معاشرتی روایات مشرقی عورت کی موجودہ پسماندگی کا باعث ہیں؟ کیا ان روایات نے اس کو بقول بعض مصنفین کے، بے حس، تنگ نظر اور جاہل بنا رکھا ہے؟ جی نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری روایات ہمیں نہ علم حاصل کرنے سے روکتی ہے اور نہ یہ محنت مزدوری کرنے اور معاشرتی معاملات میں دوسروں سے تعاون و اشتراک کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں بشرطیکہ ان سرگرمیوں کا مقصود انسانیت کی فلاح ہو اور ان سے کسی اجتماعی نقصان

ہماری یہ روایات[1] جس چیز کے خلاف ہیں، وہ بعض مضر اور احمقانہ سرگرمیاں ہیں مثلاً بلاضرورت عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا اور سڑکوں پر گشت کرتے پھرنا۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی شخص بھی اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ اپنی ان بیرونی سرگرمیوں کے ساتھ عورت اپنی حقیقی نسوانی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا ہی نہیں سکتی اور نہ ان کے ذریعے اس کو معاشرے میں کوئی عزت اور وقار حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر عورتیں اس راہ پر چل نکلیں تو جیسا کہ مغرب کی مہذب اور روشن خیال سوسائٹی گرلز کا تجربہ بتاتا ہے، وہ بڑی آسانی سے مردوں کی ہوس رانی کا شکار ہو جائیں گی۔ چنانچہ جو لوگ پرانی روایات کے خلاف ہیں، ان کی مخالفت کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ یہ ان کو اُس عیاشی، بدمستی اور تعیش کی اجازت نہیں دیتیں جس کے وہ عادی ہو چکے ہیں۔

بے سروپا باتیں

مصر کا ایک غیر مسلم ادیب جو اسلام پر چوٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا[2] اپنے ہفتہ وار جریدہ کے ذریعے مسلمان عورتوں کو بار بار ترغیب دلایا کرتا تھا کہ: "اپنی بوسیدہ روایات توڑ پھینکو۔ گھروں سے باہر نکلو، جرأت و حوصلہ کے ساتھ مردوں سے ملو جلو اور کارخانوں اور دفتروں میں ملازمتیں سنبھال لو۔ یہ سب کچھ تم کو اس لیے نہیں کرنا ہے کہ ان کاموں کے انجام دینے کی کوئی حقیقی ضرورت درپیش ہے، بلکہ اس لیے تاکہ تم اپنی ان ذمہ داریوں سے بچ سکو، جو نسل انسانی کی ماؤں کی حیثیت سے تم پر ڈال دی گئی ہیں"۔ یہ صاحب[2] عورتوں کو یہ بھی بتاتے تھے کہ سڑک پر سے گزرتے ہوئے جو عورت نظریں نیچی کر کے چلتی ہے، وہ دراصل جرأت اور خود اعتمادی

---

[1] "روایات" سے ہماری مراد خالص اور حقیقی اسلامی روایات ہیں نہ کہ وہ اجنبی روایات جو غیروں کے ہاں سے درآمد کی گئی ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ روایات کے خلاف ہیں، وہ اپنی گفتگوؤں اور تحریروں میں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھتے۔

[2] یہاں جس ادیب کی طرف اشارہ ہے، اس کا نام سلامہ موسیٰ تھا۔ اس کی تحریریں اسلام دشمنی کا نمونہ تھیں۔ ان میں ہمیشہ اسلام پر کوئی نہ کوئی تعریض ہوتی تھی۔ یہی حال ایک اور عیسائی ادیب جرجی زیدان کا بھی تھا۔ مصر میں یہ دونوں اسلام کی دشمن قوتوں کے ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سے محروم اور مردوں کے خوف میں مبتلا ہوتی ہے۔ لیکن جب تجربے کے بعد اس میں روشن خیالی پیدا ہوگی، تو اس کا خوف بھی خود بخود زائل ہو جائے گا اور وہ پھر جرأت سے صنفِ مخالف کا آمنا سامنا کرنے لگے گی۔ مگر یہ بات کہتے ہوئے اس ادیب نے تاریخ کو بالکل ہی فراموش کر دیا۔ جس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہؓ جنہوں نے اپنے زمانے کی سیاسیات میں بھرپور حصہ لیا، اور جنگوں میں فوجوں کی قیادت کی، وہ بھی مردوں سے پردہ کرتی تھیں۔ اس کو یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ نظریں نیچی کرنا صرف عورتوں ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ کیونکہ تاریخ کی یہ شہادت بھی موجود ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کنواریوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔ کیا آپؐ کے اس شرمیلے پن کی وجہ آپؐ میں خود اعتمادی کا فقدان تھا؟ یا آپؐ کو یہ معلوم نہ تھا کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں؟ اسلام کے مخالفین نہ جانے کب تک ایسی بے سروپا اور احمقانہ باتیں بناتے رہیں گے؟

آج عورت پستی کی جس ذلت سے دوچار ہے، وہ ایک حقیقت ہے۔ اس سے کسی کو مجال انکار نہیں۔ مگر اس کا علاج وہ نہیں ہے جو مغرب کی عورت نے اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اس کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا، وہ ایک خاص نوعیت کے تھے وہاں کی عورت کی گم کردۂ راہ کی جو مخصوص صورتیں نظر آتی ہیں وہ بھی انہی حالات کی پیداوار تھیں۔

صحیح اسلامی ریاست کی ضرورت

عورت کا مسئلہ ہو یا مرد کا، اسلام اور صرف اسلام ہی اسے حل کر سکتا ہے۔

اس لیے ہم مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کا سب سے پہلا فرض ہے کہ مل جل کر ایک صحیح اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کوشش کریں۔ اور اپنی زندگیوں کو اسلامی قانون کے مطابق ڈھالیں۔ یہ کام جب ہم کریں گے، تو کل کی دنیا میں اپنے عقائد اور نظریات کو بھی غالب کر سکیں گے۔ زندگی میں توازن اور ہم آہنگی کے حصول کی یہی واحد راہ ہے، جو ہر قسم کی بے انصافی، جور و ستم اور جبر و استبداد سے پاک ہے۔

اسلام کا نظریۂ جُرم وسزا

روشن خیالی کی نئی منطق

"آج کے ترقی یافتہ دور میں وہ وحشیانہ سزائیں کیسے نافذ کی جا سکتی ہیں، جو زمانۂ قدیم کے وحشیوں کے لیے وضع کی گئی تھیں؟ کیا محض چند روپوں کی خاطر چور کا ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے؟ حالانکہ مجرم چور ہو یا ڈاکو، جدید نقطۂ نظر کے مطابق معاشرے کی بے انصافی اور ظلم کا شکار ہوتا ہے۔ وہ سزا کا نہیں، ہمدردی سے نفسیاتی علاج معالجہ کا مستحق ہے۔" یہ ہے وہ منطق، جو اسلامی قانون کے بارے میں جدید روشن خیالوں کی زبان سے اکثر سننے میں آتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ بیسویں صدی کے یہ روشن خیال حضرات شمالی افریقہ کے چالیس ہزار معصوم انسانوں کا بے دریغ قتل عام ہوتے دیکھتے ہیں تو ہلکا سا اضطراب بھی محسوس نہیں کرتے، لیکن محض ایک مجرم کی قانونی سزا پر بے چین اور چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں! افسوس کہ انسان خوشنما اور دلفریب الفاظ سے دھوکا کھا جاتا ہے، اور اصل حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ بہرحال بیسویں صدی کی تہذیب اور اس کی بیماریوں سے قطع نظر آیئے ہم اسلام کے تصورِ سزا پر غور کریں۔

جرم اور معاشرہ

جرم کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ معاشرے کے خلاف کسی زیادتی کے ارتکاب کا نام ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جرم وسزا کے تصور اور فرد اور اجتماع کے باہمی تعلق کے متعین کرنے میں معاشرے کے اجتماعی نقطۂ نظر کو بہت زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔

سرمایہ دار ممالک

جہاں تک مغرب کے سرمایہ دار اور انفرادیت پسند ممالک کا تعلق ہے، وہ فردکی تقدیس واحترام میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں، اور اس کو تمام معاشرتی زندگی کا مرکز ومحور

قرار دیتے ہیں۔ ان ممالک میں جہاں تک فرد کی آزادی پر کوئی قدغن عائد کرنے کا سوال ہے، ریاست کے اختیارات بہت محدود ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی نقطۂ نظر ان ممالک کے تصورِ جرم و سزا میں بھی ملتا ہے۔ وہاں پر مجرموں کو قابلِ ہمدردی سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ان کے خیال میں بگڑے ہوئے ماحول، نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی عوارض میں مبتلا ہوتے ہیں، اور ان پر قابو پانا ان کے بس ہی میں نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان ممالک میں جرائم کی سزاؤں کا خصوصاً اخلاقی جرائم کی سزاؤں میں کمی کا رجحان ملتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات توانہیں سرے سے کوئی ایسا جرم ہی نہیں سمجھا جاتا، جس پر مجرم کسی سزا کا مستحق قرار پائے۔

جدید نفسیات اور جرم

اس مرحلہ پر تحلیلِ نفسی (PSYCHO — ANALYSIS) کا نظریہ سامنے آتا ہے، جو جرم کی توضیح یا توجیہہ کی صورت میں اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ واضح رہے کہ فرائڈ (FREUD) اس اہم تاریخی انقلاب کا بہت بڑا داعی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ مجرم دراصل جنسی الجھنوں کا شکار ہوتا ہے، جو اس وقت پیدا ہوتی ہیں، جب معاشرہ، مذہب، اخلاق اور روایات انسانی جبلت کو دبانے کی کوشش کرتی ہیں۔ بعد میں تحلیلِ نفسی کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے تمام ماہرینِ نفسیات نے فرائڈ ہی کا اتباع کیا، مگر ان میں سے بہت سے اس کے اس نظریے سے متفق نہیں تھے کہ زندگی میں جنس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان ماہرینِ نفسیات نے مجرم کو ان حالات و واقعات کا محض بے بس شکار قرار دیا، جن سے وہ اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ "نفسیاتی نظریۂ جبر" (PSYCHOLOGICAL DETERMINISM) کے قائل تھے۔ یعنی ان کے خیال میں جہاں تک نفسیاتی قوتوں کا تعلق ہے، انسانوں کو نہ خواہش کی آزادی حاصل ہے اور نہ عمل کی، بلکہ وہ اس کے مقابلے میں مجبورِ محض ہے۔ اور وہ اس کی مداخلت سے بے نیاز ایک متعین اور بگے بندھے ضابطے کے مطابق کام کرتی رہتی ہیں۔

اشتراکی ممالک

اس کے برعکس اشتراکی ممالک کا نظریہ یہ ہے کہ اجتماع اور معاشرہ مقدس وحدت

ہے، جس کے خلاف آواز اٹھانے کا فرد کو سرے سے کوئی حق ہی حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ ان ریاستوں میں اگر کوئی فرد ریاست کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہو، تو اُس کو انتہائی سخت سزائیں، جن میں سزائے موت سے لے کر ہر طرح کی اذیتیں شامل ہیں، دی جاتی ہیں۔

فرائڈ اور اس کے ہم خیال ماہرین نفسیات کی طرح اشتراکیت جرائم کا اصل سبب نفسیات میں ڈھونڈنے کے بجائے معاشیات میں تلاش کرتی ہے۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے جو معاشرہ اقتصادی بدحالی میں مبتلا ہو، اس میں کوئی خوبیاں پروان چڑھ ہی نہیں سکتیں۔ لہٰذا ایسے معاشروں میں مجرموں کو سزائیں ملنی چاہیئے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو پھر روس میں کہ جہاں مکمل مساوات کا دَور دَورہ ہے، جرائم کیوں ہوتے ہیں؟ اور جیلوں اور عدالتوں کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

غلطی کی اصل وجہ

بلاشبہ انفرادیت پسندوں اور اشتراکیت دونوں کے نظریات جزوی طور پر صحیح ہیں۔ یہ درست ہے کہ فرد پر اس کے ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور اس کے تحت الشعور کی الجھنیں بعض اوقات جرائم کا باعث بنتی ہیں۔ لیکن انسان حالات کے مقابلے میں مجبورِ محض نہیں ہے۔ تحلیل نفسی کے ماہرین کی غلطی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ انسان کی قوت محرکہ (DYNAMIC ENERGY) پر اتنا زیادہ زور دیتے ہیں کہ وہ انسانی وجود میں ودیعت قوتِ ضابطہ (CONTROLLING ENERGY) کو بالکل ہی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہی قوت ہے، جس کی مدد سے ایک خاص عمر کے بعد بچہ رطوبت خارج کرنے والے غدودوں پر قابو پا لیتا ہے، اور اپنے بستر کو گیلا نہیں کرتا۔ اسی قوت کی مدد سے وہ اپنے جذبات اور افعال پر قابو پانا سیکھتا ہے اور اپنی بے قابو خواہشات اور آرزوؤں کو لگام دیتا ہے!

معاشیات اور ارتکاب جرم

مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشی حالات سے انسان کے جذبات اور افعال متاثر ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ بھوک روحِ انسانی کے انتشار اور معاشرے میں منافرت کا باعث بن کر بعض اوقات جرائم یا اخلاقی فساد کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ لیکن محض اقتصادی

حالات کو انسانی زندگی کا واحد مؤثر عامل قرار دینا صحیح نہیں البتہ کسی حد تک جزوی طور پر یہی درست ہے۔ خود سویت روس کے معاشرتی حالات اور واقعات ہی اس دعویٰ کی تردید کے لیے کافی ہیں، حالانکہ روس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنے ملک سے بھوک اور افلاس کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے۔

ارتکاب جرم میں مجرم کی ذمہ داری

بہر حال مجرم کو سزا دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرنے سے پیشتر ہمیں ارتکاب جرم میں اس کی ذمہ داری کی صحیح حدود کا تعین ضرور کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ جہاں تک جرم اور اس کی سزا کا تعلق ہے، اسلام ان میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کرتا۔

اسلام کا طریقۂ کار

اسلام اندھا دھند سزائیں تجویز نہیں کرتا، اور نہ بغیر سوچے سمجھے انہیں نافذ کرتا ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر انفرادیت پسندوں (INDIVIDUALISTIC) اور کلیت پسندوں (یعنی اشتراکیت) دونوں نظریات کی خوبیوں کا جامع ہے، مگر ان کی خرابیوں سے پاک ہے۔ اسلام صحیح معنوں میں عدل قائم کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ جرم کی سزا دینے سے پہلے ان تمام حالات اور اسباب کا جائزہ لیا جائے، جن کا ارتکاب جرم سے تعلق ہے۔ مجرم کو سزا دیتے وقت اسلام بیک وقت دو امور پیش نظر رکھتا ہے: مجرم کا نقطۂ نظر اور اس معاشرے کا زاویۂ نظر جس کے خلاف ارتکاب جرم کیا گیا ہے۔ ان ہر دو امور کی روشنی میں اسلام مناسب سزا تجویز کرتا ہے، جو منطق اور عقل دونوں سے ہم آہنگ اور غلط قسم کے انفرادی اور قومی نظریات کے اثرات سے بالکل پاک ہوتی ہے۔

اسلامی قانون تعزیرات

اسلام کی بعض مثالی سزائیں ممکن ہے بظاہر ظالمانہ اور غیر مناسب نظر آئیں۔ لیکن تھوڑے سے غور و فکر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ سزائیں ظالمانہ ہیں اور نہ غیر مناسب۔ کیونکہ اسلام انہیں صرف اسی صورت میں نافذ کرتا ہے جب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ مجرم

کو نہ تو کوئی خاص مجبوری درپیش تھی، اور نہ اس کے ارتکاب جرم کی کوئی اور معقول وجہ جواز ہے مثال کے طور پر اسلام چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا ہے، مگر جہاں ذرا بھی شبہ ہو کہ چوری کی وجہ بھوک تھی، تو وہ مجرم کو قطع ید کی سزا نہیں دیتا۔

اسی طرح اسلام بدکار مرد اور عورت دونوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے، مگر یہ سزا صرف شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے لیے مخصوص ہے، اور صرف اسی صورت میں دی جاتی ہے، جب چار عینی گواہوں نے انہیں ارتکاب جرم کرتے دیکھا ہو۔ دوسری سزاؤں کے بارے میں بھی اسلام اسی طرح کی احتیاط ملحوظ رکھتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا طریقہ

خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ بن الخطاب کے، جو کہ اسلامی تاریخ میں ممتاز ترین فقہا میں شمار ہوتے ہیں، بیان کردہ ایک اصول سے بھی اسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ احکام شریعت کے نفاذ میں اپنی سختی کے لیے مشہور ہیں، جس کی بنا پر ان کے اس اصول کو احکام شریعت کی توجیہہ میں نرمی سے بھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب قحط پڑا، تو آپ نے چوری کے جرم میں کسی کو قطع ید کی سزا نہیں دی، کیونکہ اس بات کا امکان موجود تھا کہ لوگ چوری بھوک سے مجبور ہو کر کرتے ہوں۔ مندرجہ ذیل واقعہ سے اسلامی قانون کے اس پہلو پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

ایک تاریخی واقعہ

حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ حاطب بن ابی بلتعہ کے کچھ غلاموں نے مُزنیہ کے ایک آدمی کی اونٹنی چرا لی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا، تو لڑکوں نے چوری کا اقرار کر لیا، جس پر آپ نے ان کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر آپ نے فرمایا: "خدا کی قسم! اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ تم ان لڑکوں کو ملازم رکھنے کے بعد انہیں فاقوں مارتے ہو جس سے وہ حرام کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، تو میں ان کے ہاتھ کٹوا دیتا"۔ یہ کہہ کر آپ نے قطع ید کی سزا منسوخ کر دی۔ پھر ان کے مالک حاطب بن ابی بلتعہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "خدا کی قسم! میں نے ان کے ہاتھ تو نہیں کٹوائے لیکن میں تم پر ضرور بھاری جرمانہ کروں گا، جس سے تمہیں تکلیف ہو گی"۔ اور

یہ کہہ کر آپ نے حکم دیا کہ وہ اونٹنی کے مالک کو دو اونٹنیوں کی قیمت ادا کرے۔

فقہ اسلامی کا ایک اہم اصول

یہ واقعہ اسلامی قانون کے ایک بہت واضح اور صریح اصول کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کسی مجرم کو قانونی سزا ایسے حالات میں نہیں دی جائے گی، جب جرم کا ارتکاب حالات سے مجبور ہو کر کیا گیا ہو۔ اس اصول کی تائید میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی موجود ہے کہ:

اُدْرَأُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ : شک کی صورت میں حدود جاری نہ کرو۔

اسلامی تعزیرات اور اصلاح معاشرہ

سزاؤں کے معاملے میں اسلام کی پالیسی کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پہلے تو معاشرے کو ان تمام حالات و اسباب سے پاک کرتا ہے، جو جرائم کا باعث بنتے ہیں۔ اس کے بعد بھی جو لوگ جرائم کے مرتکب ہوں، وہ انہیں عبرتناک اور منصفانہ سزائیں دیتا ہے۔ لیکن اگر جرائم کے اسباب موجود ہوں، اور مجرم کے بارے میں ذرا سا شک بھی پیدا ہو جائے کہ اس نے حالات سے مجبور ہو کر ارتکاب جرم کیا ہے، تو اس کو یہ سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ اس کے جرم کی مناسبت سے کوئی اور ہلکی سزا دی جائے گی، یا بغیر سزا دیئے ہی چھوڑ دیا جائے گا۔

اسباب جرم کا انسداد

جرائم کا باعث بننے والے اسباب کا اسلام مختلف ذرائع سے قلع قمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دولت کی منصفانہ تقسیم پر بھی زور دیتا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ افلاس کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی ریاست اپنی حدود میں رہنے والے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے، اور اس سلسلے میں مذہب، نسل، زبان، رنگ یا معاشرتی مقام کا کوئی اختلاف ملحوظ نہیں رکھتی۔ اسی طرح ریاست تمام شہریوں کے لیے مناسب روزگار بھی مہیا کرتی ہے۔ اگر روزگار مہیا نہ ہو سکے یا کوئی شہری کام کرنے اور اپنی روزی آپ کمانے کے قابل نہ ہو، تو خزانہ عامرہ سے اس کو

مدد دی جاتی ہے۔

جنس کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر

اسلام جنس (sex) کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی تسکین کے لیے جائز قانونی ذریعہ ــــ نکاح ــــ کا دروازہ کھولتا ہے۔ اسی لیے اسلام کم عمر میں شادی کا حامی ہے، اور جو لوگ باوجود خواہش کے نکاح کی استطاعت نہ رکھتے ہوں، ان کو سرکاری خزانہ سے امداد دلواتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسلام معاشرے کو ان تمام اسباب سے بھی پاک کرتا ہے، جو جذبات میں ہیجان پیدا کرتے ہیں۔ اسلام انسان کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین رکھتا ہے جس کو وہ قبول کر لے تو اس کی تمام قوتیں معاشرے کی مجموعی بہبود میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ یہ انسان کو اپنی فراغت کے اوقات قرب الٰہی کے حصول کے لیے صرف کرنا سکھاتا ہے۔ یوں اسلام ان تمام محرکات کا خاتمہ کر دیتا ہے، جو جرائم کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسلام کسی بدکار کو اس وقت تک سزا نہیں دیتا، جب تک وہ معاشرے کی تمام قدروں کو پامال کر کے خالص حیوانی سطح پر نہ گر جائے اور اس طرح کھلم کھلا بدکاری کا مرتکب ہو کہ چار عینی گواہ اس کو بدکاری کا ارتکاب کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں

یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی حالات کی وجہ سے اب نوجوانوں کے لیے یہ آسان نہیں رہا کہ وہ شادی کر سکیں، جس کی وجہ سے وہ بدکاری کے مرتکب ہوتے ہیں، ہمیں اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ لیکن جب ہم اسلام پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہوں گے، تو پھر معاشرے میں سفلی جذبات کو بھڑکانے اور نوجوانوں کے اخلاق کو تباہ کرنے والی گندی اور عریاں فلمیں، اخبارات اور فحش گانے بھی نہیں ہوں گے۔ نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکانے والے تمام اسباب ختم ہو جائیں گے۔ معاشرہ میں افلاس کی وہ لعنت بھی باقی نہیں رہے گی جس کی وجہ سے باوجود خواہش کے لوگ شادی نہیں کر سکتے۔ جب یوں معاشرہ تمام برے محرکات سے پاک ہو جاتا ہے، تو پھر اسلام لوگوں سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ اچھے انسان بن کر رہیں۔ مگر جو اس کے بعد بھی برائی کے مرتکب ہوں، وہ انہیں سزا دیتا ہے کیونکہ اب ان کے ارتکاب جرم کی کوئی وجہ جواز نہیں ہوتی، اور نہ ایسے حالات ہوتے ہیں، جن میں

وہ مجرم بننے پر مجبور ہوں ۔

اسلامی تعزیرات کا امتیازی وصف

اسلام کو دوسرے نظام ہائے حیات سے جو چیز نمایاں اور ممتاز کرتی ہے ، وہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ سزا کے نفاذ سے قبل جرم کے تمام امکانی اسباب وعلل کا سدباب کرتا ہے ، بلکہ یہ ہے کہ اسباب وعلل کے خاتمہ کے بعد بھی اگر کسی مجرم کے بارے میں اس کو یہ شک ہو جائے کہ اس نے حالات سے مجبور ہو کر جرم کیا ہے ، تو وہ اس کو سزا نہیں دیتا ۔ دنیا کا آخر کونسا دوسرا نظام حیات اسلام کے اس عدل وانصاف کا مقابلہ کر سکتا ہے ؟

اہل یورپ کی غلط فہمی کی بنیاد

بعض یورپی مصنفین چونکہ اسلام کے تصور جرم وسزا سے ناواقف ہیں ، اس لیے وہ اس کی مقرر کردہ سزاؤں کو وحشیانہ اور انسان کی توہین قرار دیتے ہیں کیونکہ غلطی سے وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کے یورپی ضابطہ تعزیرات کی طرح یہ سزائیں بھی آئے دن لوگوں پر نافذ ہوتی رہیں گی ۔ گویا ان کے نزدیک اسلامی معاشرہ میں کوڑوں ، قطع ید اور سنگساری کی سزائیں ایک عام معمول ہوتی ہیں ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کی عبرت ناک سزائیں اسلامی معاشرے میں شاذ ونادر ہی نافذ کی جاتی ہیں ۔ چنانچہ یہ بات کہ اسلامی تاریخ کی چار سو سالہ طویل مدت میں چوری پر قطع ید کی سزا صرف چھ مرتبہ دی گئی ، اس حقیقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس کا اصل مقصد چوری کا سدباب تھا نہ کہ لوگوں کے ہاتھ کاٹنا ۔ اسی لیے اسلام سزائیں دینے سے پہلے خود جرائم کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اسلامی سزاؤں کے نفاذ کے جو چند ایک واقعات ملتے ہیں ، وہ یقیناً مبنی برحق وانصاف تھے ۔

معلوم نہیں بعض یورپی مصنفین اسلام کے قانون کے عملی نفاذ سے اس قدر خائف کیوں ہیں ۔ اگر وہ طبعاً مجرم ، اور بلا کسی مجبوری اور اضطرار کے ارتکاب جرم پر مصر ہوں ، تو البتہ ان کے خوف کی ایک معقول وجہ سمجھ میں آسکتی ہے ۔

سزاؤں کا افادی پہلو

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی سزائیں کوئی عملی افادیت نہیں رکھتیں ، مگر یہ خیال

غلط ہے۔ اسلامی سزائیں دراصل ان لوگوں کو ڈرانے کے لیے ہیں جو بغیر کسی معقول وجہ جواز کے ارتکاب جرائم کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی اصلاح کے نقطۂ نظر سے یہ سزائیں بہت مؤثر ہیں۔ کیونکہ ان کی خواہش جرم خواہ کتنی ہی شدید ہو، سزا کا خوف انہیں ارتکاب جرم سے قبل کئی بار سوچنے پر ضرور مجبور کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض نوجوان جنسی ناآسودگی کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن جو معاشرہ اپنے تمام افراد کی فلاح وبہبود کے لیے سرگرم عمل ہوتا ہے، اس کو اس بات کا بھی پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے افراد کو جان ومال کا مکمل تحفظ دے تاکہ کوئی شخص کسی کی جان ومال کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

اس کے برعکس جو لوگ بغیر کسی خاص وجہ کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، اسلام انہیں حالات کے حوالے نہیں کرتا۔ بلکہ ہر ممکن طریقہ سے ان کا علاج کرتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ وہ ایک متوازن اور معقول زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔

افسوسناک .....

اس سلسلے میں افسوسناک بات یہ ہے کہ جدید زمانے کے بعض مہذب نوجوان اور ماہرین قانون اسلامی سزاؤں کو محض اس خوف سے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ یورپ کے لوگ انہیں وحشت وبربریت کا طعنہ دیں گے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ حضرات اگر اسلامی قانون کی حکمتوں کا کھلے دل سے مطالعہ کریں، تو ان کی تمام غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں۔

اسلام اور تہذیب

اسلام کے یہ معترضین

"کیا تم چاہتے ہو کہ ہم آج سے ہزاروں برس قبل خیموں میں رہنے والے خانہ بدوشوں کی مانند زندگی گزاریں۔ صحرا کے رہنے والے وحشی اور اجڈ بدوؤں کے لیے اسلام بالکل موزوں اور اُن کی ضروریات سے ہم آہنگ تھا۔ اس کی سادگی میں ان کے لیے کشش بھی موجود تھی، لیکن کیا موجودہ دور میں جو آواز سے تیز رفتار طیاروں، ہائیڈروجن بموں اور سینما کا دور ہے، کسی ایسی تہذیب کی گنجائش ہو سکتی ہے، جس کی بنیاد خدا کے اقرار و ایمان پر ہو اور جدید ترقی یافتہ تہذیب کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔ کیونکہ یہ جامد ہے اور وقت کا ساتھ دینے کی صلاحیت سے قطعاً عاری۔ اس لیے ہم جب تک اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کریں گے، آج کی ترقی یافتہ اور مہذب اقوام کی صف میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔"

کچھ عرصہ ہوا، جب میری ملاقات ایک انگریز فاضل سے ہوئی، تو مخالفین اسلام کے یہ سارے اعتراضات میرے ذہن میں گھوم گئے۔ یہ صاحب اقوام متحدہ کے ماہرین کے اس وفد سے متعلق تھے، جو گزشتہ دو برس سے مصر[1] میں مقیم تھا۔ اس وفد کا مقصد مصری کسانوں کے معیارِ زندگی کو بڑھانے میں حکومت مصر کی مدد اور رہنمائی تھا، مگر اس خطہ اور یہاں کے لوگوں سے "گہری" وابستگی اور محبت" کے باوجود چونکہ وفد کے ارکان میں سے کوئی بھی ان کی زبان سے واقف نہ تھا، نہ ان میں سے کسی نے اس کی ضرورت ہی محسوس کی تھی، لہٰذا حکومت مصر کی طرف سے مجھے یہ خدمت سونپی گئی کہ میں وفد اور مقامی کسانوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض انجام دوں۔ اس طرح میری ملاقات اس فاضل انگریز سے ہوئی۔

---

[1] واضح رہے کہ اصل عربی کتاب ۱۹۵۰ء میں مصر میں چھپی تھی۔

مَیں نے پہلی ملاقات ہی میں اس انگریز کو جتا دیا کہ مصر کے لوگ انگریزوں سے متنفر ہیں اور اس وقت تک متنفر رہیں گے جب تک وُہ مشرق کے کسی ایک ملک میں بھی جارحیت اور ظلم کا باعث بنتے رہیں گے۔ مَیں نے اس کو یہ بھی بتایا کہ ہم ان کے حلیفوں مثلاً امریکہ وغیرہ سے بھی نالاں ہیں، کیونکہ انہوں نے مصر فلسطین اور ہمارے دوسرے مسائل کے بارے میں غیر منصفانہ طرزِ عمل اپنا رکھا ہے۔ میری گفتگو سُن کر وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد کہنے لگا: "کیا تم کمیونسٹ ہو؟"

اس پر مَیں نے اسے بتایا کہ میں کمیونسٹ نہیں مسلمان ہوں اور اسلام کی صورت میں میرے پاس ایک ایسی تہذیب اور نظامِ زندگی موجود ہے جو اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ ارفع اور برتر ہے، کیونکہ یہ پوری زندگی پر محیط ہے اور اس سے اس کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

تین گھنٹے تک ہم آپس میں یہی باتیں کرتے رہے، آخر میں وُہ کہنے لگا: "اسلام کے بارے میں آپ جو کچھ کہتے ہیں، ممکن ہے، وُہ بالکل صحیح ہو، لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو جدید تہذیب کے ثمرات سے محرومی گوارا نہیں کر سکتا۔ مَیں ہوائی جہازوں میں سفر کرنا چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ریڈیو پر دلکش اور دلفریب موسیقی سے بے اعتنائی برت سکتا ہوں۔ آرام و آسائش کے اس سروسامان کو مَیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

اس کے جواب سے میں بہت حیران ہوا، اور مَیں نے کہا: لیکن آپ کی ان دلچسپیوں پر قدغن کون لگاتا ہے"؟

"تو کیا اسلام قبول کرنے کا مطلب خانہ بدوشی اور وحشت کے دور کی طرف پلٹ جانا نہیں ہے"؟

بے بنیاد اعتراضات

اسلام کے بارے میں مُعترضین بالعموم اب تک اسی طرح کے شبہات میں مبتلا نظر آتے ہیں جس طرح کے شبہات اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ جن لوگوں نے تاریخ مذاہب کا مطالعہ

کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان اعتراضات اور شبہات کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کیونکہ اسلام پر کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا، جب یہ ترقی اور تہذیب کی راہ میں سنگِ گراں بنا ہو۔ اسلام نے جس قوم کو اپنا مخاطب اوّل بنایا، وہ زیادہ تر بدوؤں پر مشتمل تھی، وہ تہذیب سے اس قدر دور، اور ایسے سنگدل تھے کہ خود قرآن پاک نے ان کے بارے میں کہا:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا (التوبہ، ۹۷)

یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں۔

اسلام کا عظیم معجزہ

اسلام کا ایک بہت بڑا معجزہ ان وحشی اور اُجڈ بدوؤں کو انسانوں کے ایک گروہ اور قوم میں تبدیل کرنا ہے۔ اس نے نہ صرف ان کو راہِ ہدایت دکھائی، اور حیوانیت سے بلند کر کے انہیں انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کیا، بلکہ انہیں دوسروں کے رہنما اور خدا کے دین کا داعی بھی بنا دیا۔ اسلام انسانوں کی تہذیب اور روح انسانی کی تطہیر کی جو معجز نما صلاحیت رکھتا ہے، یہ کارنامہ اس کی بڑی واضح اور روشن مثال ہے۔

اسلامی تہذیب اور روحانی و عملی زندگی

روح انسانی کی تطہیر بڑا پاکیزہ مقصد ہے۔ یہی تمام انسانی سعی و جہد کا حقیقی منتہائے مقصود ہے اور انسانی تہذیب کی غایت اصلی بھی، لیکن اسلام روح کی تطہیر ہی کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تہذیب کے ان تمام مظاہر کو بھی باقی رکھتا ہے جنہیں موجودہ زمانے میں زندگی کا اصل لطف سمجھا جاتا ہے؛ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مفتوحہ ممالک کی ان تمام تہذیبوں کی اسلام نے سرپرستی کی اور انہیں اپنے زیر سایہ پروان چڑھایا، جو عقیدۂ توحید کے منافی نہیں تھیں، اور نہ لوگوں کو نیکی اور اچھے کاموں سے روکتی تھیں۔

قدیم یونان اور اسلام

اسلام نے یونان سے ملنے والے اس سائنسی ورثے کی بھی حفاظت اور سرپرستی

کی، جو علم الادویہ، فلکیات، ریاضی، طبیعیات، کیمیا اور فلسفہ پر مشتمل تھا۔ اسلام نے اس ذخیرۂ معلومات کی صرف حفاظت ہی نہیں کی، بلکہ اس میں مزید اضافہ بھی کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو سائنس اور اس کی تحقیق سے کس قدر گہری دلچسپی تھی؛ چنانچہ یورپ کی تحریک احیائے علوم اور اس کی موجودہ سائنسی کامرانیوں کی اساس مسلمانانِ اندلس کی سائنسی تحقیقات ہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنی تاریخ کے کسی دور میں بھی کسی حقیقی خادمِ انسانیت تہذیب کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔

موجودہ مغربی تہذیب کے متعلق اسلام کا رویّہ

موجودہ مغربی تہذیب کے بارے میں بھی اسلام کا رویّہ وہی ہے، جو اس سے قبل دوسری تہذیبوں کے بارے میں رہا ہے۔ اسلام اس کی کسی خوبی سے انکار نہیں کرتا، مگر وہ اس کے لائے ہوئے فساد اور خرابیوں کو قبول کرنے کا روادار نہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کو مادی یا سائنسی میدانوں میں کبھی علیحدگی پسندی کی تعلیم نہیں دی۔ دوسری تہذیبوں کے خلاف اس کی کشمکش کی تہہ میں کوئی شخصی یا نسلی تعصبات کارفرما نہیں ہوتے، کیونکہ اسلام وحدتِ آدمیت کا علمبردار ہے اور چاہتا ہے کہ انسان کی مختلف نسلوں اور طبقوں کے درمیان گہرے برادرانہ روابط قائم ہوں۔

جدید سائنسی ایجادات اور اسلام

اسلامی تحریک جدید ایجادات کے خلاف نہیں ہے اور نہ مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ مختلف ہتھیاروں اور اوزاروں پر "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کے الفاظ کندہ ہونے چاہئیں، ورنہ وہ ان کو اپنے گھروں، کھیتوں اور کارخانوں میں استعمال نہیں کریں گے۔ اسلام جو کچھ چاہتا ہے، وہ بس اتنا ہے کہ ان ہتھیاروں اور اوزاروں کو اللہ کے لیے اور اس کی مرضی کے مطابق استعمال کیا جائے۔ کیونکہ یہ تو بے جان آلات ہیں۔ ان کا نہ کوئی مذہب ہو سکتا ہے، اور نہ کوئی وطن، مگر ان کے غلط یا صحیح استعمال

سے ساری دُنیا کے انسان متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک توپ کو دیکھئے کہ اس کا نہ کوئی مذہب ہے، نہ رنگ اور نہ کوئی وطن، لیکن اسلام کے نزدیک کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس کو غلط استعمال کر کے اس کی مدد سے دوسروں پر ظلم اور زیادتی کرنے لگے۔ کسی مسلمان کی بہر حال یہ شان نہیں ہے، بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ توپ کو ظالموں کی زیادتی سے لوگوں کو بچانے کے لیے کام میں لائے یا دُنیا میں خدا کے دین کا کلمہ بلند کرنے میں اس سے مدد لے۔

اسی طرح فلم بھی ایک جدید ایجاد ہے۔ اسلام اس کے بھی خلاف نہیں ہے۔ بلکہ ایک اچھے مسلمان سے اس کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ وہ فلم کو پاکیزہ جذبات، نیک کرداروں یا معاشرۂ انسانی میں خیر و شر کی کشمکش کی عکاسی کے لیے استعمال کرے۔ کسی مسلمان کے لیے یہ بات بہر حال جائز نہیں ہے کہ وہ فلم کو عریانی اور گندے خیالات اور جذبات کے اظہار اور اشاعت کا ذریعہ بنائے اور اس کے ذریعے معاشرے کے ان بگڑے ہوئے کرداروں کو نمایاں کرے جو ہر طرح کی اخلاقی، ذہنی اور روحانی گندگیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک اس طرح کی تمام فلمیں گندی اور سطحی ہیں کیونکہ ان میں زندگی کی بڑی سطحی اور گھٹیا تصویر پیش کی جاتی ہے۔ اور یہ انسان کے پست سفلی جذبات کو اپیل کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی فلمیں انسان کے روحانی ارتقا میں ممد و معاون نہیں بن سکتیں، بلکہ الٹا اس کے لیے انتہائی مضر ثابت ہوتی ہیں۔

اسلام نے انسان کی سائنسی ایجادات کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ مسلمانوں کو اس نے یہی تعلیم دی ہے کہ وہ تمام اچھے سائنسی علوم کو اپنے مقصد کی خدمت کے لیے استعمال کریں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے"۔ یہ کہنے کی غالباً یہاں ضرورت نہیں ہے کہ علم کی تعریف میں ہر قسم کا علم شامل ہے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کو علم اور سائنس کے ہر شعبے میں آگے بڑھنا چاہیئے۔

الغرض اسلام کسی ایسی تہذیب کی مخالفت نہیں کرتا جو انسانیت کی خادم ہو، لیکن اگر کوئی تہذیب میخواری، قماربازی، اخلاقی انحطاط، قحبہ گری اور نوآبادیاتی سامراج

اور دوسری قوموں کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے اپنا غلام بنانے کی ہم معنی بن کر رہ جائے تو اسلام اس تہذیب کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کرتا ہے، تاکہ دُنیا کے لوگ اس کی لائی ہوئی تباہیوں اور بیماریوں سے محفوظ رہیں۔

اسلام اور رجعت پسندی

اسلام کے بعض غلط بین معترضین اکثر یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ اسلامی نظامِ حیات دورِ جدید کی ضروریات اور تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے موجودہ زمانے کے لوگوں کے لیے یہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کے نزدیک اسلام کے احکام صرف زمانۂ ماضی کے لیے تھے۔ اب نہ صرف یہ کہ ان کی افادیت ختم ہو چکی ہے، بلکہ وہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

- "کیا تم اب بھی سود (جو دورِ جدید کی ناگزیر معاشی ضرورت ہے) کی حرمت کے قائل ہو؟"
- "کیا تم آج بھی یہ چاہتے ہو کہ زکوٰۃ کا روپیہ جس بستی سے جمع کیا جائے، لازماً وہیں کے باشندوں کی فلاح پر خرچ کیا جائے؟ اوّل تو زکوٰۃ ایک غیر ترقی یافتہ طریقہ ہے اور جدید حکومت کی ضروریات کو بھی پورا نہیں کرتا اور دوسرے جب کسی قصبے یا شہر کے غریبوں میں وہیں کے خوشحال لوگوں کی زکوٰۃ کا روپیہ بانٹا جاتا ہے تو اس سے ان کی خودی مجروح ہوتی ہے کیونکہ ان کے لیے اس روپیہ کی حیثیت خیرات سے زیادہ نہیں ہوتی۔"
- "کیا تم لوگ میخواری، قماربازی، اختلاطِ مرد و زن، رقص و سرود اور داشتائیں رکھنے اور آشنا بنانے پر بھی قدغن لگانا چاہتے ہو حالانکہ یہ سب چیزیں تو اب معاشرتی زندگی کے لوازم میں سے ہیں۔"

سود کو معاشی مجبوری کہنا غلط ہے

یہ صحیح ہے کہ اسلام سود کو ممنوع قرار دیتا ہے، مگر یہ کہنا غلط ہے کہ سود کوئی معاشی مجبوری ہے۔ موجودہ دور میں بھی دو نظام ہائے حیات یعنی اسلام اور اشتراکیت ایسے موجود

ہیں جو سود کو معاشی مجبوری تسلیم نہیں کرتے۔ بس فرق اتنا ہے کہ اشتراکیت کو اپنے نظریات پر عمل کرنے اور زندگی کو ان کے مطابق ڈھالنے کے لیے ضروری قوت و اقتدار حاصل ہے اور اسلام کو یہ قوت و اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اگر اسے حقیقی اقتدار حاصل ہوتا تو وہ بھی دکھا دیتا کہ سود ناگزیر معاشی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت سُودی بنیادوں پر استوار نہیں ہوتا، اُسی طرح جس طرح آج اشتراکی روس کا معاشی ڈھانچہ سُودی بنیادوں پر نہیں، بلکہ ان سے آزادی کی اساس پر استوار ہے۔

ماہرینِ اقتصادیات کی شہادت

سود کو کسی لحاظ سے بھی دورِ جدید کی ناگزیر اقتصادی ضرورت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ اگر ناگزیر ضرورت ہے، تو صرف سرمایہ داروں کے لیے، جو اس کے بغیر سرمایہ دار نہیں بن سکتے۔ خود مغرب کے چوٹی کے ماہرینِ اقتصادیات سود کے مخالف ہیں اور ہمیں متنبہ کرتے ہیں کہ اگر اس پر پابندی نہ لگائی گئی، تو رفتہ رفتہ تمام دولت سمٹ کر چند لوگوں کے قبضے میں چلی جائے گی اور غریب عوام اقتصادی لحاظ سے تباہ ہوکر سرمایہ داروں کے تابع اور غلام بن جائیں گے۔ مغرب کی تاریخِ سرمایہ داری میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے ماہرینِ اقتصادیات کے یہ خدشات بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ اسلام سود اور اجارہ داری کو جو نظامِ سرمایہ داری کی دو اہم بنیادیں ہیں۔ آج سے کوئی ایک ہزار برس قبل جب سرمایہ دارانہ نظام کا کہیں وجود ہی نہ تھا ممنوع قرار دے چکا ہے۔ اسلام کا نازل کرنے والا خدا سے قادر و علیم ہے، جو اگلی پچھلی نسلوں کے تمام حالات و واقعات پر نگاہ رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ سود سے کیا کیا برائیاں، معاشی خرابیاں اور الجھنیں پیدا ہوسکتی ہیں۔

ایک تحقیر آمیز مجبوری

جس ملک یا قوم کی معاشیات کا انحصار غیر ملکی امداد پر ہو، اس کے لیے تو سود ایک تحقیر آمیز مجبوری ہوسکتی ہے، لیکن اسلامی نظامِ معیشت آزاد ہوتا ہے۔ اور آزاد

اور پائیدار بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ دوسرے ملکوں سے اس کے تعلقات مساوات کے اصول پر مبنی ہوتے ہیں، اطاعت اور غلامی کے اصول پر نہیں۔ اسی طرح یہ اقتصادی معاملات میں رہنمائی اور روشنی ان اسلامی احکام اور اصولوں سے اخذ کرتا ہے، جن کی رُو سے سُود حرام ہے۔ ان اصولوں کی رہنمائی میں آزاد اسلامی معیشت کا جو نظام وجود پذیر ہوتا ہے، وُہ دُنیا میں ترقی اور سربلندی کا نشان بن جاتا ہے۔

زکوٰۃ کی صحیح حیثیت

جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ خیرات نہیں ہے، جو غریبوں کو دی جاتی ہے۔ بلکہ یہ خدا کا حکم ہے، اور ایک ایسا حق ہے جس کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہے۔

اس باب میں ہم زکوٰۃ کے بارے میں اس اعتراض کا جواب دینا چاہتے ہیں جو اس کی مقامی نوعیت یعنی جس مقام سے زکوٰۃ جمع کی جائے وہیں کے مستحقین میں تقسیم کرنے کے اصول پر کیا جاتا ہے۔

یہ بڑی افسوسناک صورتِ حال ہے کہ ہمارے ہاں کے اکثر دانشور مغرب سے آئے ہوئے ہر نظام اور طریقے کو تو تہذیب کا کمال سمجھ کر گلے سے لگا لیتے ہیں، مگر وہی چیز جب اسلام ان کے سامنے پیش کرتا ہے، تو وُہ اسے رجعت پسندی اور تاریک خیالی قرار دینے لگتے ہیں۔

امریکہ کی مثال

ان دانشوروں کو یہ یاد دلانا مفید ہوگا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا انتظامی ڈھانچہ کامل لامرکزیت (DECENTR ALISATION) کی اساس پر قائم ہے، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور انفرادی ریاستوں کے عمومی نظام میں ہر گاؤں اور قصبہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے بجائے خود ایک مکمل اور آزاد وحدت ہے۔ ان آزاد وحدتوں

کی میونسپل کونسلیں ہی اپنی حدود میں بسنے والوں پر ٹیکس عائد کرتی ہیں، انہیں جمع کرتی ہیں، اور پھر انہیں اپنے گاؤں یا قصبے کی تعلیمی، طبی، رسل و رسائل اور دوسری معاشرتی ضرورتوں پر صرف کرتی ہیں۔ اگر ان اخراجات کے بعد بھی کچھ بچ رہے، تو اسے شہر یا ریاست کے حکام بالا کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر قصبے کے مقامی اخراجات اس کی آمدنی سے زیادہ ہوں، تو خسارے کو ریاست پورا کرتی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بہت عمدہ نظام ہے، جس میں مختلف انسانی کوششوں کی اس طرح تنظیم کی جاتی ہے کہ اخراجات کا سارا بوجھ بٹ جاتا ہے اور یہ تنہا مرکزی حکومت کو برداشت نہیں کرنا پڑتا۔ مزید برآں اخراجات کی تقسیم چونکہ مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی ضروریات بھی بخوبی پوری ہوتی رہتی ہیں، کیونکہ مقامی لوگ اپنے علاقے کی ضرورتوں کو مرکز سے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

تیرہ صدی پیشتر

ہمارے ہاں کے دانشور اس امریکی نظام کے بڑے مداح ہیں، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام نے اس نظام کو آج سے تیرہ صدی پیشتر قائم کیا تھا۔ ہر گاؤں کے حکام اپنے گاؤں سے ٹیکس جمع کرتے تھے اور ان سے مقامی آبادی کی ضروریات پوری کرتے تھے اور اخراجات اور آمدنی میں جو فرق رہ جاتا تھا، وہ یا تو مرکز کے خزانۂ عامرہ میں جمع کرا دیا جاتا تھا، یا اس سے قرضہ کی صورت میں وصول کر لیا جاتا تھا۔

رہ گیا زکوٰۃ کی تقسیم کا مسئلہ، تو جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اسلامی قانون کی کوئی شق ایسی نہیں ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ زکوٰۃ لازماً نقد یا جنس کی صورت ہی میں لوگوں میں تقسیم کی جائے۔ زکوٰۃ غریبوں کے لیے تعلیمی، طبی یا معاشرتی سہولتیں فراہم کرنے پر بھی خرچ کی جا سکتی ہے، اور اس سے ان معذوروں کی نقد مالی امداد بھی کی جا سکتی ہے، جو بڑھاپے، کمزوری یا بچپن کی وجہ سے کوئی کام کرنے سے معذور ہوتے ہیں۔

آج اگر ہم اسلام کے معاشی اصولوں کو اپنے موجودہ معاشرے میں قائم کرنا چاہیں، تو اس غرض کے لیے ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑے گا کہ ہم اپنے ہاں ایسی چھوٹی چھوٹی انتظامی وحدتیں بنا دیں، جو ریاست، دنیائے اسلام اور دُنیا کے مجموعی نظام میں رہ کر اپنے مقامی مسائل اور معاملات کی خود نگرانی کریں، اور مقامی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار ہوں۔

اسلام اور معاشرتی فساد

جہاں تک قماربازی، مےخواری اور مرد وزن کے آزادانہ اختلاط کا تعلق ہے اسلام نام نہاد "ترقی پسندوں" کے لایعنی اعتراضات کے علی الرغم ان سب کی ممانعت کرتا ہے۔

مےخواری

مےخواری درحقیقت کسی نہ کسی معاشرتی یا انفرادی فساد کی علامت ہے شراب اور دوسری منشیات کی ضرورت صرف ایک بگڑے ہوئے معاشرے ہی کو پیش آتی ہے جس میں مختلف طبقوں کا درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ایک طرف لوگ عیش وعشرت میں اس قدر ڈوبے ہوتے ہیں کہ ان کے سارے انسانی حسیات مر جاتے ہیں اور دوسری طرف پورا ملک محرومی اور بےچارگی کی حالت میں مبتلا ہوتا ہے؛ چنانچہ محرومین کا یہ گروہ حقیقت سے گریز کی راہیں تلاش کر کے اپنی الگ دُنیا بسا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان معاشروں میں منشیات اور شراب کا رواج عام ملتا ہے جو جبر واستبداد تلے دبے ہوتے ہیں اور جہاں انسانی فکر پر پابندیاں عائد کر کے اس کی پرواز کو محدود کر دیا جاتا ہے اور جہاں لوگ اپنی معاش کی فکر میں کچھ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ انہیں اور کسی چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ اسی طرح یہ خرابیاں ان معاشروں میں بھی عام ملتی ہیں جو ہر وقت جدید مشینوں کے مکروہ اور بےمعنی شور وغوغا کی زد میں ہوتے ہیں۔

علامت مرض نہ کہ وجہ جواز

لیکن یہ تمام معاشرتی عوارض کسی طرح بھی شراب کی حلت کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں بن سکتے، البتہ چونکہ میخواری بیماری کی علامت ہے، اس لیے اس کی ممانعت سے پہلے اس معاشرتی فساد کی اصلاح ضروری ہے جس سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے اسلام نے اس کے انسداد کے لیے بالکل یہی فطری طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے تو ان تمام برائیوں اور اسباب کا خاتمہ کیا جو اس لعنت کے ذمہ دار تھے اور جب ادھر سے اطمینان ہو گیا، تو پھر شراب کی حرمت کا اعلان کیا۔ اسلام پر نکتہ چینی کرنے کے بجائے تہذیب جدید کے علمبردار اگر اس سے اپنے سیاسی، سماجی، ذہنی اور طبعی حالات کو بدلنے اور اس طرح انسانیت کے روحانی عوارض کے علاج کا طریقہ سیکھنے پر توجہ دیں تو یہ ان کے لیے زیادہ مفید ہو سکتا ہے اور وہ اسلام سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

جہاں تک قماربازی کا تعلق ہے، ہم اس کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنا نہیں چاہتے کیونکہ صرف احمق لوگ ہی اس کو پسندیدہ شے سمجھ سکتے ہیں۔

مرد و زن کا اختلاط اور اسلام

اب آیئے ذرا مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کے مسئلہ پر بھی جو بڑی گرما گرم بحثوں کا مرکز بنا ہوا ہے، ایک نگاہ ڈالتے چلیں۔

بہت سے سطحی طرز فکر رکھنے والے اسلام کو محض اس لیے رجعت پسند مذہب سمجھتے ہیں کہ وہ مردوں اور عورتوں کے خلاملا پر قیود عائد کرتا ہے۔ یہ لوگ تہذیب فرانس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، جس میں عاشق و محبوب شاہراہ عام پر دوسروں کی موجودگی سے بے خبر باہم بوس و کنار کر سکتے ہیں کوئی شخص ایسے جوڑے کو کچھ نہیں کہہ سکتا بلکہ اگر پولیس کا سپاہی انہیں یوں محبت و عشق کے نشے میں مدہوش پاتا ہے، تو وہ راہگیروں سے انہیں بچانے کے لیے باقاعدہ پہرہ دیتا ہے، تاکہ کوئی ان کے اس کیف و سرور میں

مخل نہ ہو۔ باقی رہے وہ تاریک خیال لوگ جو ایسے مناظر کو دیکھ کر چیں بجبیں ہوتے ہیں تو وہاں انہیں منہ ہی کون لگاتا ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جو امریکی طرز زندگی پر فریفتہ ہیں، کیونکہ وہاں کے لوگ اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیتے۔ وہ جنس کو انسان کی حیاتی ضرورت سمجھتے ہیں؛ چنانچہ وہاں پر انسان کی اس حیاتی ضرورت کو پورا کرنے کا اہتمام بھی موجود ہے۔ ہر لڑکی کا بوائے فرینڈ اور ہر لڑکے کی گرل فرینڈ ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے وقت کا بیشتر حصہ ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے ہیں۔ آبادی سے باہر پکنکیں مناتے ہیں، جہاں وہ فطرت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنا جنسی سکون بحال کرتے ہیں چنانچہ ان پکنکوں (PICNICS) سے وہ لوٹتے ہیں، تو اتنے آسودہ خاطر اور مطمئن ہوتے ہیں کہ اس کے بعد وہ پوری دلجمعی سے اپنی پڑھائی میں لگ جاتے ہیں یا دوسرے فرائض انجام دیتے ہیں اور یوں ملکی خوشحالی اور پیداوار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں اور پوری قوم ترقی کرتی جاتی ہے۔

اخلاقی دیوالیہ پن کے شیدائی

لیکن یہ سطحی اور ظاہر بین حضرات، جو مغرب کے اخلاقی دیوالیہ پن کے اس قدر شیدائی ہیں، یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم میں فرانس جرمنی کے پہلے حملہ کی بھی تاب نہیں لا سکا تھا اور اس نے جرمنوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ فرانس کی اس ذِلت آمیز شکست کی وجہ فرانسیسی فوج کی ناقص فوجی تربیت یا سامانِ جنگ کی کمی نہیں تھی، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ فرانسیسی قوم مادی لذات کی پرستار اور اخلاقی بے راہ روی کی شکار ہو کر قومی جذبے سے بالکل محروم اور اندر سے بالکل کھوکھلی ہو چکی تھی۔ انہیں یہ خدشہ تھا کہ جنگ جاری رہی، تو پیرس کی بلند و بالا عمارتیں اور عشرت کدے نمود کی نذر ہو جائیں گے۔ کیا تہذیبِ مغرب کے شیدائی دانشور اپنے یہاں بھی یہی ڈرامہ دہرانا چاہتے ہیں؟

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے، تو اس کی پُر فریب زندگی کا پردہ چاک کرنے کے لیے خود امریکی حکومت کے فراہم کردہ اعداد و شمار کافی ہیں، جن کے مطابق امریکہ کے ثانوی اسکولوں کی ۸۰ فیصد لڑکیاں حاملہ پائی گئی ہیں۔ یونیورسٹی کی نچلے درجات کی طالبات میں یہ تناسب نسبتاً بہت کم ہے۔ کیونکہ مانع حمل تدابیر اختیار کرنے میں وہ اسکولوں کی لڑکیوں سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہوتی ہیں۔

اچھے مقاصد، اچھے ذرائع

بلاشبہ جنسی تسکین کا حصول ایک قابل قدر مقصد ہے۔ اسلام اس مسئلہ پر بڑی توجہ دیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر انسان جنسی لحاظ سے ناآسودہ ہوں، تو وہ اسی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور کسی اور معاملے پر توجہ دینے کے قابل ہی نہیں رہتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی پیداوار میں کمی ہونے لگتی ہے، لیکن اچھے مقاصد اچھے ذرائع ہی سے حاصل کیے جانے چاہئیں۔ اس غرض کے حصول کے لیے پورے معاشرے کو اخلاقی روگ لگا دینا یا نوجوانوں کو جانوروں کی طرح ایک دوسرے پر پل پڑنے کے لیے آزاد چھوڑ دینا یقیناً کوئی پاکیزہ طریقہ نہیں ہے۔

امریکی زندگی کی ظاہری چمک دمک

جن غلط بین حضرات کا خیال ہے کہ امریکہ کی یہ تمام حیرت انگیز پیداوار جنسی بے راہ روی کا نتیجہ ہے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ امریکہ نے دنیا کو اب تک جو پیداوار دی ہے، وہ محض مادی پیداوار ہے، جس کی اگر یہی رفتار رہی تو انسانوں کی جگہ تھوڑے ہی دنوں میں ہر جگہ بے جان مشینیں کام کرتی نظر آئیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی مادی ترقی کے باوجود امریکہ ذہنی اور روحانی لحاظ سے اتنا پست ہے کہ وہاں آج بھی حبشیوں کی حیثیت غلاموں سے زیادہ نہیں۔ اور وہ آئے دن بدترین مظالم کا تختۂ مشق بنتے رہتے ہیں۔ یہ تو اس کے گھر کا حال ہے۔ جہاں تک بیرونی دنیا کا تعلق ہے۔ امریکہ آج دنیا میں ہر جگہ نوآبادیاتی نظام کا حامی

اور پشتیبان بنا ہوا ہے۔ امریکی زندگی میں حیوانی خواہشات کی یہ ہمہ گیر کارفرمائی، اس کا نوآبادیاتی سامراجی مزاج اور اس کے گھر میں غلامی کا یہ رواج دراصل امریکی قوم کے ایک ایسے روحانی انحطاط کا اظہار ہے، جس کی مثال کسی مہذب قوم کی تاریخ میں ملنی محال ہے۔

صنفی آوارگی کا انجام

آج کل کے مرد بالعموم خوب رُو اور بنی ٹھنی عورتوں سے خلا ملا اور میل جول کے دلدادہ ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وُہ اپنے جائز حق پر قناعت کرنے کے بجائے ہر کھیت میں منہ مارنے کے عادی ہو چکے ہیں، جو ہمیشہ سے انسان کی ایک بنیادی کمزوری رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا زندگی میں انسان کا مقصد صرف اپنی تسکین اور لذت و مسرت کی تلاش ہی رہ گیا ہے۔ خواہشات نفس کی تسکین سے حاصل ہونے والی لذت کا کون انکار کر سکتا ہے مگر یہ بیسویں صدی کی کوئی نئی دریافت ہرگز نہیں ہے۔ آج سے ہزاروں برس پیشتر یونانی رومی اور ایرانی بھی اس سے واقف تھے۔ اور سرتاپا اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مگر اسی حد سے بڑھی ہوئی لذت پرستی نے ان اقوام کو ان کے فرض منصبی سے غافل بنا دیا، اور وُہ رفتہ رفتہ اپنی حکومت واقتدار اور عظمت سب کچھ کھو بیٹھیں۔

جدید مغرب اور ہم

جدید مغرب کے پاس وسیع مادی وسائل حیات ہیں۔ سائنس کی ایجادات، کثیر پیداوار اور کام کی بے پناہ لگن بھی اس میں موجود ہے، مگر اس کے باوجود حیوانی خواہشات کی پرستش کی وجہ سے اس کے جزوی انحطاط کا آغاز ہو چکا ہے، مگر ہم لوگ جو گزشتہ دو صدی سے ناموافق حالات و واقعات کی بنا پر مغرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ پسماندہ چلے آ رہے ہیں، تہذیب و ترقی کے نام پر یا رجعت پسندی کے طعنے سے ڈر کر حیوانی لذات کی سرمستیوں میں اپنے آپ کو گم کر دیں، تو آخر ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ہمارے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے اور ہم کبھی ان پر قابو نہ پا سکیں گے۔ روشن خیالی

کے جو مدعی چاہتے ہیں کہ ہم اپنی تاریخی روایات سے اپنے آپ کو منقطع کر لیں، وہ دراصل نو آبادیاتی سامراج کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ نو آبادیاتی سامراج ایسے تمام نام نہاد "روشن خیال" ادیبوں اور مفکروں کی پیٹھ ٹھونکتا ہے، کیونکہ اسے خوب معلوم ہے کہ اپنی قوم کے اخلاق میں انتشار اور نوجوانوں کو لذت پرستی میں مبتلا کر کے یہ لوگ دراصل اسی کے مذموم مقاصد کی تکمیل کا سامان کر رہے ہیں۔

مغربی عورت کا تجربہ — ایک سوال

بہت سے فریب خوردہ لوگ کہتے ہیں: "مغربی معاشرے میں رہنے والی عورتوں کو دیکھو، کتنی ترقی یافتہ ہیں، انہیں معاشرے میں پورے حقوق حاصل ہیں اور وہاں کی معاشرتی زندگی میں ان کا گہرا عمل دخل ہے۔" بلاشبہ مغرب میں عورتوں کو باقاعدہ ملازمتیں کرنے، اور اس طرح دوسری جنس کے افراد سے میل جول کے جو مواقع ملے ہیں، ان سے انہیں ایسے تجربات حاصل ہوتے ہیں کہ جو گھر کی چار دیواری میں رہ کر بچوں کی دیکھ بھال کرنے کی صورت میں ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ گھر سے باہر عورت کو یہ جو تجربات حاصل ہوتے ہیں، ان کا اس کی نسوانیت سے کتنا کچھ تعلق ہے؟ کیا ان سے اس کی نسوانیت میں واقعی کوئی نکھار آیا ہے؟ اور کوئی نئی خوبیاں اس میں پیدا ہوتی ہیں؟ یا ان کی بدولت کچھ نسوانی خوبیاں دب گئی ہیں؟

ہم دوبارہ یہی سوال یوں بھی پوچھ سکتے ہیں کہ کیا عورت کے ان بیرونی تجربات سے انسانی زندگی کو واقعی کچھ ملا ہے؟ کیا انسانی زندگی نئی خوبیوں سے بہرہ ور ہوتی ہے یا ان کی وجہ سے بعض پرانی خوبیاں بھی ختم ہو گئی ہیں؟

مغرب کا معاشرتی المیہ

مغربی عورت مرد کی ایک اچھی دوست بن گئی ہے۔ جو اس کا دل بھاتی ہے، اس کی جنسی خواہش کی تسکین کرتی ہے، بلکہ اس کے بعض مسائل میں برابر کی شریک ہے، لیکن

وہ اب نہ ایک اچھی بیوی بن سکتی ہے، اور نہ اچھی ماں۔ اس دعویٰ کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں طلاق کی شرح چالیس فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ یورپ میں طلاق کی شرح اس سے کچھ کم ہے۔ مگر وہاں شادی شدہ جوڑوں کے لیے شادی کے بعد داشتائیں رکھنا اور غیروں سے عشق ومحبت کی پینگیں بڑھانا ایک عام سی بات ہے۔ اگر مغربی عورت ایک اچھی بیوی ہوتی، اور وہ اپنے گھر کی فلاح کے لیے اپنی عمر وقف کرنے کی صلاحیت رکھتی، تو امریکہ میں طلاقوں کی اس قدر بھرمار نہ ہوتی، اور نہ گھروں سے فرار اس قدر عام ہوتا۔ یہاں پر یہ بات بھی واضح کر دینی چاہیئے کہ ملازمت کرنے والی خواتین ان تجربات و احساسات سے تہی دامن ہوتی ہیں، جو اچھی مائیں بننے میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک اچھی ماں کے فرائض پورے کرنے کے لیے ان کے پاس نہ وقت ہوتا ہے، اور نہ نفسیاتی طور پر وہ اپنے ان فرائض کی بجا آوری کے لیے آمادہ ہی ہوتی ہیں۔

خطرے کا الارم

اس کے برعکس یہ واقعہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول سے سوائے وقتی لذت کے انسانیت کو اب تک کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ کچھ عورتوں کو پارلیمنٹ کا رکن، وزیر یا بعض ملکوں کا سربراہ بنا دینے سے دنیا کے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور نہ ہزاروں لاکھوں عورتوں کو کارخانوں، دکانوں اور دفتروں کی زینت بنانے سے دنیا کی بگڑی بن سکتی ہے۔ کیا معاشرے میں عورت کا موثر کردار پارلیمنٹوں میں تقریر کرنے اور مختلف ملکوں کے نام ہدایت نامے جاری کرنے تک ہی محدود ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی بھی معقول انسان انسانیت کی ماں کی حیثیت سے عورت کے کردار کی عظمت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس کی تربیت ہی سے دنیا کو اچھے شہری ملتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت پارلیمنٹ میں تالیوں کی گونج اور واہ واہ کے شور میں یہ حقیقت فراموش کر دے۔ مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ ماں سے محروم انسانی نسلیں اور انہیں ماں کی اس محبت و شفقت کا نہ ملنا، جو نفس انسانی کی برائیوں کا مداوا بنتی ہے، انسانیت کے لیے ایک بہت بڑے خطرے کا الارم ہے جس کے

مقابلے میں ان وقتی نعرہ ہائے تحسین کی یقیناً کوئی وقعت نہیں ہے. مگر ماں کی یہ محبت انسانیت کو صرف اُن ماؤں کی گود ہی میں مل سکتی ہے جنہوں نے اپنا سب کچھ اس مقدس فریضہ کی بجاآوری کے لیے وقف کر رکھا ہو۔

حقیقت بینی کا تقاضا

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ عورت پر اتنا بوجھ نہیں ہونا چاہیئے کہ وُہ دنیا کی ساری خوشیوں سے محروم ہو جائے اور اس کی شخصیت دب کر رہ جائے، مگر زندگی من مانی کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دیتی، نہ مرد کو اور نہ عورت کو۔ ہم زندگی میں اپنی مرضی نہیں چلا سکتے اور نہ ہمیشہ وہی کچھ کر سکتے ہیں جو ہمیں مرغوب اور دلپسند ہوتا ہے۔

لمحۂ فکریہ

ذرا سوچیئے تو سہی کہ اگر سارے انسان یہ خودغرضانہ اندازِ فکر اختیار کر لیں، اور اپنی خواہشوں اور لذتوں پر کسی قسم کی قدغن گوارا نہ کریں، تو انجام کیا ہوگا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوگا کہ ہماری خودغرضی اور بے راہ روی کی سزا ہمارے بعد آنے والی نسلیں طرح طرح کے آلام و مصائب کی صورت میں بھگتیں گی۔ ظاہر ہے کہ خود عورتوں کی اپنی بھلائی کا تقاضا بھی یہ نہیں ہے کہ آئندہ آنے والی تمام نسلوں کی عورتیں محض اس وجہ سے مصیبت اور دکھ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مبتلا کر دی جائیں کہ ایک خاص دور کی عورت لذت پرستی اور نفس پرستی میں اندھی ہو گئی تھی۔

اسلام نے جو نظامِ زندگی وضع کیا ہے، وُہ موجودہ اور آنے والی تمام نسل ہائے انسانی کی بہتری کے لیے ہے۔ اس میں وہ کسی نسل کو دوسری نسل یا نسلوں پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں ہے کیونکہ اس کے نزدیک انسانیت ایک وحدت ہے جو مختلف نسلوں سے مل کر وجود پذیر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی اس خصوصیت کے باعث اسلام کو کسی طرح بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ البتہ اگر اسلام انسان کے فطری تقاضوں کے خلاف ہوتا، یا بلا استثنا زندگی کی تمام خوشیوں اور مسرتوں کو ممنوع قرار دیتا تو البتہ اس پر اعتراض کرنے کا ایک جواز ہو سکتا تھا، مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

اسلام اور مسئلۂ جنس

ابدی گناہ کا تصوّر

مغربی ماہرینِ نفسیات مذہب پر یہ الزام دھرتے ہیں کہ وہ انسان کو اپنی قوتِ حیات کے کچلنے اور دبانے کا درس دیتا ہے اور بالآخر اسے دائمی احساسِ گناہ کی ایک ایسی دلدل میں جا گراتا ہے جہاں اسے اپنا ہر فعل گناہ معلوم ہوتا ہے جس کے کفارہ کی صورت صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ زندگی کی تمام مسرتوں اور خوشیوں سے کنارہ کش ہو جائے۔ اپنے اس دعویٰ کی تائید میں یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک یورپ مذہب کے چنگل میں گرفتار تھا اس کو ہر سُو جہالت کی تاریکیوں نے گھیرا ہوا تھا مگر جب وہ اس مذہبی استبداد سے آزاد ہوا تو امنگوں اور جذبات کا تھما ہوا سیلاب اُمڈ پڑا اور کشتِ آرزو کے ویرانوں میں فصلِ بہار آگئی۔

مذہب پر اعتراض

چنانچہ یہ ماہرینِ نفسیات اکثر یہ سوال کرتے ہیں: کیا تم ہمیں مذہب کی طرف لوٹ جانے کا مشورہ دیتے ہو؟ کیا تم ہماری ترقی کی راہ میں دوبارہ مذہبی عقائد کے روڑے بچھا دینا چاہتے ہو؟ اور کیا تمہاری یہ خواہش ہے کہ ہم اپنی ہونہار نسل کو قدم قدم پر ٹوک کر انکی زندگیاں اجیرن کر دیں؟

یہ ہے اہلِ مغرب کی رائے اپنے مذہب کے بارے میں۔ لیکن اس وقت چونکہ ہمارا موضوعِ سخن مذہب کی عمومی حیثیت نہیں ہے بلکہ صرف اسلام ہے اس لیے ہم ان کی اس رائے سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہتے اور نہ اس کے درست یا غلط ہونے کے متعلق کچھ

کہنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک اسلام اور مسئلہ جنس کا تعلق ہے اس پر گفتگو کرنے اور یہ معلوم کرنے سے پہلے کہ آیا اسلام جنسی جذبہ کو کچلنے اور دبانے کا درس دیتا ہے یا نہیں، یہ ضروری ہے کہ جنسی ناآسودگی (SEXUAL REPRESSION) کا صحیح مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ خواندہ اور نیم خواندہ سب اسے غلط معانی پہناتے رہتے ہیں اور مختلف حالات پر انطباق کرتے وقت بھی غلطی کرتے رہتے ہیں۔

جنسی ناآسودگی کا صحیح مفہوم

جنسی ناآسودگی (SEXUAL REPRESSION) جنسی فعل سے پرہیز کا نام نہیں ہے بلکہ قبیح اور گھناؤنا فعل سمجھنے کا شاخسانہ ہے۔ ایسا قبیح اور گھناؤنا کہ کوئی مہذب اور شائستہ انسان اس کے بارے میں سوچنا تک پسند نہ کرے۔ اپنے اس مفہوم میں جنسی ناآسودگی ایک غیر شعوری احساس کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور جنسی عمل کا بار بار اعادہ بھی اسے ختم نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جو شخص جنسی ناآسودگی کا شکار ہوتا ہے۔ وہ جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنسی فعل کا ارتکاب تو ضرور کرتا ہے۔ مگر اسے گندا اور شرمناک فعل سمجھ کر۔ ایسا شخص اگر دن میں بیسیوں مرتبہ اس فعل کو دہراتے تو بھی وہ جنسی لحاظ سے مریض ہی رہے گا اور جب بھی وہ اس کا مرتکب ہوگا۔ اس کے دل و دماغ میں یہ کشمکش شروع ہو جائے گی کہ اسے کرنا کیا تھا اور وہ کر کیا بیٹھا۔ اسی شعوری و غیر شعوری ذہنی خلفشار سے مختلف نفسیاتی الجھنیں اور عوارض جنم لیتے ہیں۔

فرائڈ کی شہادت

کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ جنسی ناآسودگی یا فاقہ مستی (REPRESSION) کی یہ تعریف مصنف نے خود اپنے ذہن سے گھڑ لی ہے۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ جنسی ناآسودگی کی یہ تعریف اور مفہوم ہم نے سگمنڈ فرائڈ سے لیا ہے جو عمر بھر مذہب کو یہ طعنہ دیتا رہا کہ وہ انسان کی قوت کار کو کچل دیتا ہے اور اس کی زندگی کو حرکت و عمل سے محروم کر دیتا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب [1] (THREE CONTRIBUTIONS TO SEXUAL THEORY) میں وہ

---

[1] صفحہ ۸۲

لکھتا ہے۔ "جنسی ناآسودگی اور جنسی فعل سے پرہیز میں جو کہ اس فعل کے عارضی تعطل سے عبارت ہے، امتیاز کرنا ضروری ہے"۔

اسلام کا نقطۂ نظر

یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد کہ جنسی ناآسودگی (REPRESSION) جنس کو مکروہ اور نفرت انگیز شے خیال کرنے کا نتیجہ ہے جس کا جنسی فعل کے عارضی تعطل سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں، آئیے اب ہم اس کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیں۔

اسلام فطرت کو تسلیم کرتا ہے

دُنیا کا کوئی اور مذہب ایسا نہیں ہے جو انسان کے فطری جذبات کو صحت مند اور پاکیزہ ٹھہرانے میں اس قدر فیاض واقع ہوا ہو جتنا کہ اسلام ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ (۳ : ۱۴)

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں۔

یہ آیت انسان کی تمام مرغوباتِ نفس کا ذکر کر کے انھیں ایک امرِ واقعہ کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ اس آیت میں نہ تو ان پر کوئی اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ کیوں انسانوں کو مرغوب ہیں اور نہ ان کے بارے میں انسانی جذبات کی مذمت ہی کی گئی ہے۔

بندگیٔ نفس کی مذمت

یہ صحیح ہے کہ اسلام خواہشات اور جذبات کی غلامی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا اور نہ یہ پسند کرتا ہے کہ انسان اس معاملہ میں غلو کا شکار ہو۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو زندگی کا سارا

نظام چوپٹ ہو جائے۔ انسانیت کا مطمح نظر ہمیشہ ترقی اور بہبود رہا ہے۔ مگر اس کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسانیت پر سرکش خواہشات اور جذبات کی حکمرانی ہے کیونکہ یہ انسانی قوتوں کے سرچشمہ کو برباد کر ڈالتی ہے اور انسان کو حیوانیت کی پست سطح پر گرا دیتی ہے۔

ضبطِ نفس اور جنسی ناآسودگی میں فرق

اسلام نہیں چاہتا کہ انسان اس پست سطح پر گر جائیں اور حیوانیت کے شکار بن جائیں۔ مگر اس اعلیٰ مقصد اور اُس غیر شعوری جنسی ناآسودگی (REPRESSION) اور جذبات کُشی میں زمین و آسمان کا فرق ہے جس میں جنس اور اس سے پیدا ہونے والے جذبات اور خواہشات کو گھناؤنا اور مکروہ خیال کرتے ہوئے انھیں رسمی طہارت اور روحانی سربلندی کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

معاشرے کی بہبود اور جذبات

انسانی رُوح کی پاکیزگی اور طہارت پر بحث کرتے ہوئے اسلام اصولی طور پر انسان کے تمام فطری جذبات کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ لاشعور ہی میں ان کا گلا گھونٹنے کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ عملی زندگی میں انھیں اظہار کا پورا پورا موقع دیتا ہے تاکہ ان سے ایک معقول حد تک مسرت تو حاصل ہو مگر فرد یا اجتماع کو ان سے کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہنچے۔ جو شخص ہر وقت خواہشات نفس ہی کی تسکین میں لگا رہتا ہے، اس کی قابلیتیں اور صلاحیتیں قبل از وقت ضائع ہو جاتی ہیں۔ جذبات کے رنگین دام میں پھنس کر وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور نہ اپنی نفسانی خواہشات کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی سکتا ہے۔

جب کسی معاشرے کے افراد کی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں مادی لذات اور خواہشات کی تسکین میں صرف ہونے لگتی ہیں، تو اس معاشرے کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کے بتائے ہوئے ضابطہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ بیوقوف لوگ اپنی توانائیوں سے زندگی

کے مختلف گوشوں کو بنانے اور سنوارنے کے بجائے انہیں اپنی زندگی کے ایک حقیر سے گوشہ پر ہی ضائع کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں خاندانی تعلقات تباہ اور معاشرتی زندگی انتشار و ابتری کی شکار ہو جاتی ہے اور پھر معاشرے میں وہ صورت رونما ہوتی ہے جس کو قرآنِ حکیم نے یوں بیان کیا ہے۔

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ۭ (۵۹ : ۱۴)	تو ان کو متفق (و متحد) خیال کرتا ہے حالانکہ ان کے دل غیر متفق ہیں۔

یہی وہ وقت ہوتا ہے جب غیروں کو ایسی قوم پر چڑھ دوڑنے اور اسے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جدید فرانس کی تاریخ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہے۔

اسلام انسان کو لذائذِ حیات سے محروم نہیں کرتا

اسلام فرد پر بعض پابندیاں محض اس لیے لگاتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کے بے جا استعمال سے اپنی ذات، اپنے خاندان یا معاشرے کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر زندگی کی مسرتوں سے بھرپور لطف اٹھا سکے بلکہ وہ صاف اور صریح الفاظ میں انسان کو لذائذِ حیات سے متمتع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ چند آیات ملاحظہ ہوں :۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ (۷ : ۳۲)	اے محمدؐ! ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟
وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۲۸ : ۷۷)	اور دنیا میں سے اپنا حصہ فراموش نہ کر۔
كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ (۷ : ۱۶۰)	کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ج (۷ : ۳۱)	کھاؤ، پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔

جنس کی اہمیت

اسلام جنس کی اہمیت کا اتنے صاف اور واضح الفاظ میں اعتراف کرتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہوا :۔

حبب الیّ من دنیاکم الطیب وَ	تمہاری دنیا میں مجھے سب سے زیادہ
النساء وجعلت قرۃ عینی	خوشبو اور عورت عزیز ہیں اور میری
فی الصلوٰۃ (تفسیر ابن کثیر)	آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

اس حدیث میں جنس (یعنی عورت) کو دنیا کی بہترین خوشبو کے مساوی مرتبہ دیا گیا ہے۔ نیز اس کا ذکر نماز کے ساتھ کیا گیا ہے جو کہ قربِ الٰہی کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

ایک اور موقع پر جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کو اپنی بیوی کے پاس جانے پر بھی ثواب ہوتا ہے، تو مسلمانوں نے حیران ہو کر پوچھا "کیا انسان کو اپنی شہوتِ نفسانی کی تسکین پر بھی ثواب ملتا ہے؟" اس پر آپ نے فرمایا۔ "کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ اگر وہ اپنی اس نفسانی خواہش کو حرام طریقے سے پورا کرتا تو اسے گناہ ہوتا۔ چنانچہ جب وہ جائز ذریعے سے اپنی یہ خواہش پوری کرتا ہے تو اس کو ثواب[1] ملتا ہے"۔ الغرض اسلامی نظام میں کسی انسان کی جنسی خواہشات ناآسودہ رہ ہی نہیں سکتیں۔ اگر عالمِ شباب میں انسان کو جنسی جذبے کی شدت کا احساس ہوتا ہے تو اس میں کوئی قباحت کی بات نہیں ہے اور نہ اس بات کی کوئی ضرورت ہے کہ وہ اسے کراہت انگیز شے سمجھ کر اسے دبانے یا مٹانے کی کوشش کرے۔

نوجوانوں سے اسلام کا مطالبہ

البتہ اسلام نوجوانوں سے صرف ایک مطالبہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے جنسی جذبے کا گلا گھونٹنے کے بجائے اسے لگام دیں۔ اسے اپنی مرضی اور شعوری ارادے کی مدد سے قابو میں رکھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ جنسی جذبے کو مٹانے یا دبانے کے

---

[1] مسلم

بجائے اس کی تسکین کو مناسب اور موزوں موقع ملنے تک ملتوی کر دیا جائے۔ اس طرح کا عارضی التوا، فرائڈ کے نزدیک بھی جنسی ناآسودگی کے ہم معنی نہیں ہے۔ اس سے نہ تو اعصاب پر کوئی مضر اثرات پڑتے ہیں اور نہ اس طرح کی نفسیاتی الجھنیں یا عوارض ہی پیدا ہوتے ہیں، جو جنسی ناآسودگی کے نتیجے میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

ضبطِ نفس کا حقیقی مقصد

ضبطِ نفس کا یہ مطالبہ محض تحکمانہ فرمان نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے گہری حکمت کارفرما ہے۔ اس کا منشا، انسان کو زندگی کی مسرتوں سے محروم کرنا نہیں ہے بلکہ انھیں صحیح زندگی گزارنے کے قابل بنانا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ جس قوم کے افراد اپنی خواہشات اور جذبات کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتے اور اپنی مرغوباتِ نفس سے ضرورت پڑنے پر بھی محرومی گوارا نہیں کر سکتے، اس قوم سے سیادت و قیادت کا منصب چھین لیا جاتا ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی کشاکش میں کامیابی اور سرخروئی صرف اس قوم کے حصے میں آتی ہے۔ جس کے افراد مصائب و آلام برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اگر ضرورت ہو تو اپنی مرغوباتِ نفس سے گھنٹوں، دنوں، بلکہ سالوں تک کنارہ کشی بھی اختیار کر سکتے ہوں۔ اسلام میں روزے کی اصل حکمت یہی ہے۔

دلدادگانِ آوارگی اور اسلام

بعض "آزاد" مشرب حضرات اور خواتین روزے پر بات کرتی ہیں تو اس انداز سے گویا وہ کوئی بہت بڑا انکشاف کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں: "روزہ ـــــ ہونہہ، یہ کیا ڈھکوسلا ہے۔ چند بے معنی احکام کی خاطر انسان کو خواہ مخواہ بھوکا پیاسا رکھنے سے آخر کیا حاصل، خصوصاً جب کہ ان احکام کو عقل سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کی پابندی اور تعمیل سے کوئی اور مفید مقصد ہی حاصل ہوتا ہے۔"

ان دلدادگانِ آوارگی سے ہم بس یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی بھلا کیا انسان ہے جو کسی

بلند مقصد کی خاطر چند گھنٹے کے لیے بھی اپنی خواہشات کے منہ زور گھوڑے کو لگام نہ دے سکے! اس قسم کے بندگانِ نفس کبھی انسانیت کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتے اور نہ ایسے لوگ جو اپنی مرغوبات کی قربانی دینے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، کبھی اس صبر و استقامت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں جو دنیا میں حق کا ساتھ اور باطل قوتوں سے لڑنے کے لیے ضروری شرط ہے۔

اشتراکیوں کی بوالعجبی

اگر روس کے اشتراکی اپنے مقصد کی خاطر جان گداز اور جاں گسل مصائب و آلام کی برداشت کی اس صلاحیت سے عاری ہوتے تو وہ اسٹالن گراڈ میں کبھی یوں جم کر مقابلہ نہ کر سکتے۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسلامی دنیا میں جو اشتراکی عناصر سرگرم عمل ہیں، وہ روزے اور ان تمام شعائرِ اسلامی کا تمسخر اڑاتے ہیں جن کا مقصد انسان میں ضبطِ نفس کی قوت پیدا کرنا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اشتراکیت کے علمبردار ریاست یعنی اس مخصوص قوتِ حاکمہ کی خاطر تو ہر وقت ضبطِ نفس پر آمادہ اور مستعد رہتے ہیں، مگر جب ریاست اور تمام ذی روح مخلوقات کے خالق اللہ کے نام پر اس کا مطالبہ کیا جائے تو وہ چیں بجبیں ہو جاتے ہیں اور ایک اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔

رحمت اور مغفرت کا دین

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مذہب اپنے پیرووں کے ذہنوں میں ان کے ازلی گنہگار ہونے کا تصور راسخ کر کے ان کی زندگیوں میں تلخیاں بھر دیتا ہے اور گناہ کا خیال بھوت بن کر ان کے قلب و ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض مذاہب کے بارے میں یہ خیال صحیح ہو مگر اسلام تو اس سے قطعاً بری ہے۔ کیونکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو سزا اور جہنم سے کہیں زیادہ مغفرت اور رحمت پر زور دیتا ہے۔

گناہ کا صحیح تصوّر

اسلام کے نزدیک گناہ کوئی بھوت نہیں ہے جو ہر وقت انسان کے سر پر منڈلاتا رہتا

ہو اور نہ یہ ایک ایسے غیر مختتم سائے اور تاریکی کا نام ہے جس میں انسان ساری عمر بھٹکتا رہے اور کبھی نکلنے کی کوئی راہ نہ پائے۔ حضرت آدمؑ سے جو لغزش سرزد ہوئی تھی، وہ ننگی تلوار کی مانند انسانیت کے سر پر معلق نہیں ہے اور نہ اس سے بریت کے لیے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کا کوئی مزید کفارہ ادا کریں۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ (۲ : ۳۷)

اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کر لی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا۔

یعنی حضرت آدمؑ کو اپنے گناہ سے توبہ کے لیے مراسم کے کوئی لمبے چوڑے ہفتخواں نہیں طے کرنے پڑے بلکہ ادھر انھوں نے سچے دل سے توبہ کی اور ادھر بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی۔

رحمتِ خداوندی اور اولادِ آدمؑ

اپنے جدِ امجد کی طرح اولادِ آدم پر بھی رحمتِ خداوندی سایہ فگن ہے اور جس طرح حضرت آدمؑ اپنی لغزش کے بعد بھی رحمتِ الٰہی سے محروم نہیں رہے، اسی طرح ان کی اولاد بھی گناہوں کے ارتکاب سے اس سے دور نہیں ہوئی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی فطری کمزوریوں اور محدودیتوں سے خوب واقف ہے اور وہ اُن پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا کہ وہ بآسانی اٹھا سکتے ہوں۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ (۲ : ۲۸۶)

اللہ کسی متنفس پر اس کی قدرت سے بڑھ کر ذمے داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

كل بنى آدم خطاء و خير الخطائين التوابون

(حدیث رواہ ترمذی)

تمام انسان (بنی آدم) خطاکار ہیں اور خطاکاروں میں سب سے افضل وہ ہیں جو اپنے گناہوں پر (نادم ہوتے ہیں اور ان سے) توبہ کرتے ہیں۔

رحمتِ خداوندی کی وسعت

یوں تو قرآن حکیم میں رحمت و مغفرت کے بارے میں بے شمار آیات ہیں مگر ہم یہاں

پر صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔

وَسَارِعُوٓا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ
وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا ٱلسَّمَٰوَٰتُ وَٱلْأَرْضُ
أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ
فِى ٱلسَّرَّآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَٱلْكَٰظِمِينَ
ٱلْغَيْظَ وَٱلْعَافِينَ عَنِ ٱلنَّاسِ ۗ
وَٱللَّهُ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ ۝
وَٱلَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَٰحِشَةً
أَوْ ظَلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا ٱللَّهَ
فَٱسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ
وَمَن يَغْفِرُ ٱلذُّنُوبَ إِلَّا ٱللَّهُ
وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا
وَهُمْ يَعْلَمُونَ أُولَٰٓئِكَ جَزَآؤُهُم
مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَ
جَنَّٰتٌ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا
ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ
وَنِعْمَ أَجْرُ ٱلْعَٰمِلِينَ ۝

دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ ان خدا ترس لوگوں کیلیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوشحال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں، تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔

(۳ : ۱۳۳-۱۳۶)

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دامن بہت وسیع ہے۔ وہ نہ صرف اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے بلکہ انہیں گناہوں کی آلائشوں سے پاک صاف کر کے انہیں اپنے

شرفِ قبولیت اور رحمت سے متقین اور نیکوکاروں کے برگزیدہ گروہ میں شامل کرلیتا ہے۔

رحمتِ خداوندی کا ایک حیرت انگیز پہلو

کیا ایسے رحیم اور شفیق خدا کی رحمت اور مغفرت کے بارے میں کوئی ذرا سا شک و شبہ بھی باقی رہ جاتا ہے۔ رحمتِ خداوندی کا یہ وسیع تصور رُوحانی کرب اور اذیت کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ یہ انسان کو بتاتا ہے کہ وہ ازلی گنہگار نہیں اور نہ اس کے رب کی رحمت کبھی اس کے حال سے غافل ہوتی ہے۔ بلکہ جب وہ اپنے گناہوں پر سچے دل سے نادم اور شرمسار ہوتا ہے تو وہ اسے اپنی پناہ میں لے لیتی ہے۔ اس کے لیے حقیقی اور مخلصانہ احساسِ ندامت اور شرمساری کے سوا اور کوئی شرط نہیں ہے۔ یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس کی تائید میں مزید کسی استشہاد کی ضرورت نہیں۔ تاہم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اس بے نظیر حدیث پر بھی ایک نظر ڈالتے جائیے۔ آپ نے فرمایا :۔

والذی نفسی بیدہ لولم تذنبوا لذھب اللہ بکم وجاء بقوم یذنبون ویستغفرون فیغفر لھم (رواہ مسلم)	اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اگر تم کوئی گناہ نہ کرتے تو اللہ تم کو مٹا ڈالتا اور تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آتا جو گناہوں کا ارتکاب کر کے اس سے معافی چاہنے والے ہوتے اور وہ انہیں معاف فرما دیتا۔

گویا انسان کی خطاؤں سے چشم پوشی اور درگزر عین منشائے الٰہی ہے! قرآن حکیم کی یہ عظیم الشان آیت بھی اسی حقیقت کی نقاب کشائی کر رہی ہے :

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ○ (۴:۱۴۷)	آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکرگزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدردان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ انسان کو مبتلائے اذیت نہیں دیکھنا چاہتا بلکہ اسے اپنی رحمت اور مغفرت سے نوازنا چاہتا ہے۔

اسلام اور آزادیٔ فکر

بحث کے دوران میں ایک صاحب نے کہا ــــ "تم سخت تنگ نظر اور لکیر کے فقیر واقع ہوتے ہو۔"
کیوں، میں نے پوچھا۔
"تم خدا کے وجود پر ایمان رکھتے ہو؟"
یقیناً،
"اس کی عبادت کرتے اور روزے رکھتے ہو۔"
بالکل،
"خوب! پھر میری بات درست ہے کہ تم تنگ نظر اور لکیر کے فقیر ہو۔"
اس پر میں نے ان سے پوچھا، "آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ میں تنگ نظر اور لکیر کا فقیر ہوں"؟
"کیونکہ تم جن چیزوں پر ایمان رکھتے ہو وہ سب کی سب ایک دم لغو اور بے بنیاد ہیں ان کی کوئی حقیقت اور وجود نہیں ہے۔" ان کا جواب تھا۔
"اور آپ؟ آپ لوگ کس شئے پر ایمان رکھتے ہیں؟ کیا تم جانتے ہو کہ یہ کائنات کس نے پیدا کی ہے اور زندگی کو کس نے وجود عطا کیا ہے"؟ میں نے سوال کیا۔
"فطرت"
"لیکن فطرت کیا ہے"؟
"فطرت وہ پوشیدہ اور لامحدود قوت ہے جس کا ادراک ہمیں اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔"
اس پر میں نے کہا "آپ کی باتوں سے میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ

مجھے ایک نامعلوم طاقت (خدا) کے تابع فرمان رہنے سے باز رکھ کر ایک دوسری یکساں نامعلوم اور پُراسرار قوّت (فطرت) کا اطاعت گزار بنانا چاہتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے حقیقی معبود کو جس کے یہاں مجھے ہر قسم کا ذہنی و جسمانی آرام و آسائش اور سکون حاصل ہے چھوڑ کر آخر آپ کے اس جھوٹے معبود "فطرت" کے دامن میں پناہ کیوں لوں جس کے ہاں نہ تو میری دلداری ممکن ہے اور نہ وہ میری کسی قسم کی حاجت روائی ہی پر قادر ہے"؟

آزادیٔ فکر کا ترقی پسندانہ مفہوم

اس مختصر سی گفتگو سے — آزادیٔ فکر کے داعی ترقی پسندوں کے ذہن کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک آزادیٔ فکر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے معبودِ حقیقی سے منہ موڑ لے۔ مگر یہ دہریہ پن ہے اسے آزادیٔ فکر ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ یہ لوگ اسلام کو محض اس لیے مطعون کرتے ہیں کہ یہ انسان کو وہ "آزادیٔ فکر" نہیں دیتا جو انسان کو کفر و الحاد کی گود میں جا ڈالتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا آزادیٔ فکر اور دہریت دونوں کا مطلب ایک ہے؟

ترقی پسندوں کی اصل غلطی

ان لوگوں کی اصل غلطی یہ ہے کہ وہ یورپ کی تحریک حریّت فکر (LIBERALISM) کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ اگر یورپ کے بعض مخصوص حالات و واقعات کی وجہ سے وہاں پر کفر و الحاد کو فروغ حاصل ہوا تو اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ دنیا میں ہر جگہ یہی کیفیت رونما ہو گی اور اسی طرح الحاد اور بے دینی کو فروغ نصیب ہو گا۔

اہل یورپ کے ترکِ مذہب کی وجہ

یورپ والوں کے سامنے اہل کلیسا نے عیسائیت کا جو تصور پیش کیا، اور

جس طرح انھوں نے واضح سائنسی حقائق کو جھٹلایا، سائنس دانوں کو مبتلائے آلام و مصائب کیا اور جھوٹ اور توہمات و خرافات کے پلندے کو خدائی مذہب کا نام دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد خیال یورپی منکرین کفر و الحاد کی گود میں جا پڑے۔ کیونکہ ان کے سامنے جو دو ناقابل مصالحت نقطہ ہائے نظر تھے، ان میں سے کسی ایک کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے خدا پر فطری ایمان کی راہ ترک کر کے سائنس اور اس کے فرمودات پر یقین کر لیا۔ اہلِ کلیسا نے یورپ کو جس مخمصے میں ڈال دیا تھا، اس سے جُزوی نجات کی صرف یہی صورت وہاں کے دانش وروں کو نظر آئی۔ قصہ مختصر یہ کہ انھوں نے چرچ سے کھلم کھلا اپنی علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے کہا: "ہم ایسے خدا سے باز آئے جس کے نام پر تم ہمیں غلام بنانا چاہتے ہو، ہم پر ناقابل برداشت ذمہ داریوں کے پہاڑ لادتے ہو، اور اپنے ظلم و استبداد کا تختۂ مشق بناتے ہو تمھارے اس خدا پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بن باس لے لیں اور دنیا جہان سے مُنہ موڑ کر ویرانوں اور جنگلوں میں جا رہیں۔ ہمیں ایسا خدا اور ایسا مذہب نہیں چاہیے۔ اس کے بجائے اب ہم اپنے لیے ایک نیا خدا بنائیں گے جس میں تمھارے خُدا کی صفات بھی ہوں گی، مگر اس کے پاس ہمیں غُلام بنا کر رکھنے کے لیے کوئی کلیسائی نظام نہیں ہوگا اور نہ وہ ہم پر اس طرح کی کوئی اخلاقی، رُوحانی یا مادی پابندیاں عائد کرے گا، جو تمھارے خدا کا طرۂ امتیاز ہے۔"

اسلام — ایک سیدھا اور سچّا دین

اس سے ظاہر ہے کہ یورپ میں مذہب کے خلاف جو ردِ عمل پیدا ہُوا وہ درحقیقت وہاں کے کلیسائی نظام کی خرابیوں کا فطری نتیجہ تھا لیکن اسلام میں نہ تو اس طرح کا کوئی نظام موجود ہے اور نہ اس میں عیسائیت کی طرح کوئی ایسے چیستان ملتے ہیں جن سے لوگوں میں دین سے بیزاری پیدا ہو اور وہ کفر و الحاد کی جانب مائل ہو جائیں۔ اسلام میں کوئی چرچ نہیں پایا جاتا بلکہ محض ایک خدا ہے جو کائنات اور مخلوقات کا تنہا خالق ہے

موت کے بعد سب انسان اسی کے حضور پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا صاف اور واضح عقیدہ ہے کہ اگر فطرت پرست اور ناستک بھی اس کو جھٹلانا چاہیں تو آسانی سے اور دیانت داری سے اسے جھٹلا نہیں سکتے"۔

مذہبی اجارہ داری کا خاتمہ

اسلام میں پادریوں کا کوئی طبقہ نہیں پایا جاتا اور نہ دین کسی خاص گروہ یا شخص کی اجارہ داری ہے بلکہ یہ سب انسانوں کی مشترکہ میراث ہے اور ہر کوئی اپنی فطری رُوحانی اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق اس سے مستفید ہونے کا یکساں حقدار ہے۔ اسلام کی نظر میں سب انسان آپس میں برابر ہیں۔ ان میں فرق اور امتیاز جو کچھ ہے وہ ان کے اعمال کے لحاظ سے ہے۔ عزت و تکریم کے حقیقی مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو خدا ترس ہوں خواہ اپنے پیشے کے لحاظ سے وہ انجینئر ہوں یا معلّم، معمولی مزدور ہوں یا کاریگر۔ مگر مذہب ان مختلف پیشوں میں سے کوئی ایک پیشہ نہیں ہے۔ نہ پیشہ ور مذہبی آدمیوں (یا پادریوں) کا کوئی طبقہ اسلام میں پایا جاتا ہے چنانچہ اسلامی عبادات بجالانے کے لیے کسی پادری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ معاشرے میں معاشرتی قوانین اور اصولوں کے ماہرین کا وجود ضروری ہے۔ مگر فقہ اسلامی اور آئین کے ان ماہرین کو اسلامی معاشرے میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو اس طرح کے ماہرین کو دُوسرے ممالک میں بالعموم حاصل ہوتی ہے۔ دُوسروں کے مقابلے میں انھیں نہ تو کوئی برتری حاصل ہوتی ہے اور نہ کوئی خصوصی مراعات۔ قانون کے ماہرین کی حیثیت سے یہ ریاست کے مشیروں کا کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جامعہ الازہر ایک دینی ادارہ ہے لیکن کلیسائے یورپ کی طرح اسے کبھی یہ اختیار حاصل نہیں رہا کہ وہ اپنے مخالفین کو زندہ جلائے یا انھیں اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دے۔ اس کا کام صرف اتنا ہے کہ افراد کے دینی فہم اور نظریات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھے اور ان میں جو خامی پائے اُسے دلیل سے واضح کرے۔ مگر دُوسری طرف افراد کو بھی یہی

حق حاصل ہے۔ وہ بھی جامعہ الازہر کے دینی مؤقف اور نظریات پر بحث کر کے دلائل سے اس کی غلطی واضح کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اسلام پر کسی فرد یا طبقہ کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ مسائلِ دین میں صرف ان لوگوں کو اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو دین کا گہرا علم رکھتے ہوں اور ساتھ ہی ان میں یہ صلاحیت بھی موجود ہو کہ وہ اپنی ذاتی پسند و ناپسند سے قطع نظر کر کے زندگی کے عملی مسائل میں دینی احکام کا بے لاگ انطباق کر سکیں۔

اسلامی نظام کا حقیقی مفہوم

چنانچہ اسلامی نظام کے قیام کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس میں علماء یعنی اسلامی قانون کے ماہرین کو اقتدار حاصل ہو گا اور وہ اس کے اندر تمام اعلیٰ مناصب پر قابض ہوں گے۔ نظام اسلامی کے قیام سے جو اہم تبدیلی وقوع پذیر ہوتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ نظام حکومت کی بنیاد شریعت اسلامی یا خدائی قانون قرار پاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انجینئر اور ڈاکٹر حسب سابق اپنے اپنے فرائض بجا لاتے رہتے ہیں۔ ماہرین معاشیات بھی حسب معمول اپنے دائرہ میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور واقع ہوتا ہے کہ اب ان کی معاشی سرگرمیوں کے بنیادی خطوط اسلامی نظامِ معیشت کی روشنی میں متعین ہوتے ہیں اور اسی کی مدد سے وہ معاشی اصلاح کے خاکہ میں رنگ بھرتے ہیں۔

عقیدۂ اسلامی اور سائنس

تاریخ گواہ ہے کہ عقیدۂ اسلامی اور اسلامی حکومت اور سائنس یا اس کے نظریات کے عملی انطباق کے درمیان کبھی کوئی آویزش نہیں رہی۔ اسلامی تاریخ میں کبھی کسی سائنس دان کو اس کے کسی سائنسی انکشاف یا ایجاد کی وجہ سے زندہ نہیں جلایا گیا اور نہ کبھی کسی کو اس طرح کے کسی "جرم" کی پاداش میں اذیتیں دی گئی

ہیں۔ سائنس اور اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کے درمیان کہ تمام کائنات کا خالق صرف ایک خدا ہے کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام بار بار انسان کو آسمان (فضا) اور زمین کے مطالعہ اور مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے تا کہ اس طرح اپنی اور کائنات کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کر کے انسان اپنے خدا کو پا سکے۔ یہی وہ مشاہدۂ کائنات ہے جس کے نتیجہ میں بہت سے ایسے مغربی سائنس دان بھی اب خدا کے وجود کو تسلیم کرنے لگے ہیں جو شروع شروع میں خدا کے وجود ہی کے منکر تھے!

دینِ الحاد کے کور چشم مبلغین

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں اسلام میں یورپی کلیسا کی طرح کا کوئی ایسا نظام نہیں پایا جاتا جو اس کے پیروؤں کو کفر و الحاد پر مجبور کر دے۔ مگر اس کے باوجود جب اسلامی ممالک میں ہم کچھ لوگوں کو کفر و الحاد کی دعوت دیتے دیکھتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں خود بخود یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے سابق نوآبادیاتی آقاؤں کے اندھے مقلد ہیں اور ان کی تقلید میں چاہتے ہیں کہ انھیں دین اور دینی عبادات پر الٹی سیدھی تنقید کرنے اور مسلمانوں کو مرتد بنانے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ اسی چیز کو یہ لوگ آزادیٔ فکر کا خوب صورت نام دیتے ہیں۔ یورپ والوں نے تو اس لیے اپنے مذہب والوں کے خلاف بغاوت کی تا کہ وہ چرچ کے مذہبی استبداد اور توہمات و خرافات سے آزاد ہوں اور حقیقی معنوں میں ذہنی آزادی سے بہرہ ور ہوں۔ اس طرح وہ لوگ ایک لحاظ سے اپنے اس طرزِ عمل میں حق بجانب بھی تھے اور مجبور بھی۔ مگر اسلام میں نہ تو چرچ کا سا استبداد ہے اور نہ اس میں توہمات و خرافات کے لیے کوئی گنجائش ہے۔ وہ تو انسان کو خود ہی آگے بڑھ کر وہ تمام ضروری آزادیاں عطا کرتا ہے جو اس کے لیے ضروری ہیں اور جن کے نام پر ہمارے یہ نام نہاد روشن خیال حضرات شور و غوغا کرتے نظر آتے ہیں۔ آخر اس ہنگامہ اور شور و غوغا کی وجہ کیا ہے؟

اور اسلام سے یہ حضرات اس قدر ناراض کیوں ہیں ؟

آزادیٔ فکر کا نعرہ کیوں ؟

اصل بات یہ ہے کہ آزادیٔ فکر کے ان نام نہاد علمبرداروں کو آزادیٔ فکر سے کوئی حقیقی دلچسپی نہیں ہے ، بلکہ ان کا اصل مقصود اس کی آڑ لے کر معاشرے کو اخلاقی انتشار اور جنسی انارکی کا روگ لگانا ہے ۔ آزادیٔ فکر کے نعرہ کو یہ لوگ محض اپنے مذموم مقاصد پر پردہ ڈالنے کے لیے بلند کرتے ہیں ۔ اخلاق اور مذہب کے خلاف ان لوگوں نے جو مکروہ جنگ چھیڑ رکھی ہے اس میں آزادیٔ فکر کے نعرے کا مُدعا محض دُوسروں کو فریب دینا ہے ۔ یہ لوگ اسلام کے اس لیے مخالف نہیں ہیں کہ وہ انسانی فکر پہ پابندی لگاتا ہے بلکہ ان کی دین دشمنی کی اصل وجہ اور محرّک یہ ہے کہ دین بنی نوع انسان کو گھٹیا اور پست جذبات و خیالات کی غلامی سے نجات دلانا چاہتا ہے ۔ اور یہی چیز ان دلدادگانِ آوارگی کو پسند نہیں ۔

اسلام پر آمریت کا الزام

آزادیٔ فکر کے حامی یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ اسلام کا سیاسی نظام دراصل ایک آمرانہ نظام ہے جس میں ریاست وسیع اختیارات کی مالک ہوتی ہے جنھیں وہ دین کے نام پر بے دریغ استعمال کرتی ہے اور لوگ مذہبی جنون میں سوچے سمجھے بغیر اپنے آپ کو اس کے جابرانہ اور ظالمانہ قوانین کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ اسلامی ریاست کے ہاتھوں میں اختیارات کا یہ اجتماع آمریت کو جنم دیتا ہے اور ایک ایسا نظام وجود پذیر ہوتا ہے جس میں عوام کی حیثیت غلاموں سے زیادہ نہیں ہوتی جنھیں اپنے نیک و بد کے بارے میں کچھ سوچنے سمجھنے ، کوئی رائے دینے یا فیصلہ کرنے کا سرے سے کوئی حق ہی حاصل نہیں ہوتا ۔ ان کی آزادی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھن جاتی ہے جس کے بعد اوّل تو کسی کو حکمرانوں کی زیادتیوں کے خلاف

آواز اٹھانے کا حوصلہ ہی نہیں پڑتا اور اگر کوئی قسمت کا مارا کبھی ایسی جرأت کر بیٹھتا ہے تو اسے دین اور خدا کا باغی قرار دے کر چپ کرا دیا جاتا ہے۔

الزامات کی حقیقت

ان بے بنیاد اور بے سروپا الزامات کا بہترین جواب خود قرآن حکیم ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص (۴۲ : ۳۸)	ان کا ہر کام باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ط (۴ : ۵۸)	اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

فان عصیت اللہ و رسولہ فلا طاعۃ لی علیکم

اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں ہے۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب کہا اگر تمہیں مجھ میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی اصلاح کر دو، تو ایک شخص نے کہا:

واللہ لو وجدنا فیک اعوجا لقومنا لحد السیف

خدا کی قسم اگر ہم تم میں کوئی خامی پاتے تو اپنی تلواروں سے اس کی اصلاح کر دیتے۔

کیا اسلام کی ان تعلیمات اور اس کے پیروؤں کی ان روشن مثالوں میں ان بے بنیاد الزامات کے لیے کچھ بھی وجہ جواز موجود ہے؟

مذہب اور استبداد

یہ سچ ہے کہ تاریخ میں مذہب کے نام پر بارہا ظلم و استبداد کا کھیل کھیلا گیا ہے

آج بھی بعض ممالک میں اس کے نام پر جور و ستم کا سلسلہ جاری ہے لیکن کیا جور و ستم صرف مذہب ہی کے نام پر روا رکھا جاتا رہا ہے؟ کیا ہٹلر کی آمریت کی بنیاد مذہب پر تھی؟ آج روس میں بھی کھلے بندوں یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ اسٹالن ایک ظالم اور جابر ڈکٹیٹر تھا اور اس کی حکومت محض ایک پولیس اسٹیٹ تھی لیکن کیا اسٹالن کی حکومت مذہب کے بل پر قائم تھی؟ کیا تمام آمرِ مطلق خواہ وہ ماؤزے تنگ ہو یا فرانکو، جنوبی افریقہ کا ڈاکٹر ملان ہو یا قوم پرست چین کا جنرل چیانگ کائی شیک محض مذہب کی شہ اور پشت پناہی کی بدولت سریر آرائے حکومت رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے انسان نے رُوحانی جبر و استبداد سے تو آزادی حاصل کرلی ہے مگر وہ اب بھی آمریت اور جبر و استبداد کی بعض انتہائی بھیانک اور مکروہ صورتوں کا شکار ہے جن پر انسانوں کو بے وقوف بنانے کے لیے طرح طرح کے خوبصورت لیبل چسپاں ہیں انھیں آج تقدیس کا بالکل وہی درجہ حاصل ہے جو کبھی مذہب کو حاصل تھا۔

قصُور وار کون ہے؟

کوئی ذی عقل اور ہوش مند انسان آمریت کی حمایت نہیں کرسکتا اور نہ اسے صحیح ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن پاکیزہ سے پاکیزہ اصولوں کو بھی مسخ کر کے انھیں ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ قصور ان اصولوں کا نہیں بلکہ ان خود غرض انسانوں کا ہے جو انھیں اپنے مذموم عزائم پر پردہ ڈالنے کے لیے ان کا نام استعمال کرتے ہیں۔

انقلاب فرانس کے دوران میں آزادی کے نام پر انتہائی مکروہ اور گھناؤنے مظالم توڑے گئے جس کا ظاہر ہے یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم ان مظالم کی آڑ لے کر آزادی کی تمام تحریکوں کی مخالفت شروع کردیں۔ اسی طرح تاریخ میں بارہا دستور اور آئین کے نام پر سینکڑوں بے گناہوں کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ انھیں

اذیتیں دی گئیں اور تباہ و برباد کر دیا گیا۔ مگر کیا یہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ دستور و آئین کو لغو اور فضول قرار دے کر اُسے ختم کر دیا جائے؟ اسی طرح اگر کچھ ملکوں میں مذہب کے نام پر جبر و استبداد کا دور دورہ ہے اور رہا ہے، تو کیا محض اس لیے ہمیں مذہب کو اپنی زندگی سے خارج کر دینا چاہیے؟ اگر مذہب ظلم و تعدی اور نا انصافی پر مبنی ہو تو ایسے مذہب کا تو بے شک ترک کر دینا ہی بہتر ہے، لیکن اسلام کی طرح جو مذہب عدل و انصاف کا علمبردار ہو اور ہر قسم کی زیادتی اور ظلم کو مٹانا چاہتا ہو، اس کی مخالفت کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ اسلام نے نہ صرف مسلمانوں کے درمیان عدل و انصاف کی اعلیٰ اور پاکیزہ مثالیں قائم کی ہیں بلکہ مسلمانوں اور ان کے بدترین دشمنوں کے معاملے میں بھی عدل و انصاف کی ایسی درخشندہ روایات اور مثالیں چھوڑی ہیں جن کی مثال ڈھونڈے سے بھی کہیں نہیں ملتی۔

جبر و استبداد کا بہترین علاج

جبر و استبداد کے مقابلہ کی بہترین صورت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ایمان باللہ کا عقیدہ راسخ کیا جائے اور انہیں دُوسروں کی ان آزادیوں (حقوق) کا احترام کرنا سکھایا جائے جن کی حفاظت کی خود مذہب نے ضمانت دی ہے۔ اس قسم کے خدا پرست معاشرہ کے افراد اپنے حکمرانوں کو کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ قانونی حدود کو پامال کر کے دوسروں پر ظلم و زیادتی کریں۔ اسلام نے جس طرح ایک عادلانہ نظامِ حیات کے قیام اور جبر و استبداد کی مخالفت پر زور دیا ہے اس کی مثال کسی اور نظام میں نہیں ملتی۔ اسلام کے نزدیک عوام کا یہ فرض ہے کہ اگر ان کے حکمران ظلم و زیادتی کا ارتکاب کریں تو وہ ان کی اصلاح کی کوشش کریں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ (متفق علیہ)

تم میں سے اگر کوئی بُرائی دیکھے تو اس کی اصلاح کرے۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:

ان من اعظم الجهاد عند الله کلمة عدل عند امام جائر (رواہ ابوداؤد والترمذی)

اللہ کے نزدیک سب سے بڑا جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔

یہی وہ مبادیاتِ حیات تھے جن کی وجہ سے جب لوگوں نے اپنی دانست میں خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے متعلق یہ سمجھا کہ وہ سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں تو وہ آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے گو کہ ان کے لائے ہوئے انقلاب کے نتیجے میں فتنہ وفساد اور زیادہ بڑھ گیا۔

"ترقی پسندوں" سے

آخر میں ہم اپنے "ترقی پسند" دوستوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حقیقی آزادی دین کو ترک کرنے میں نہیں بلکہ عوام میں ایک ایسا انقلابی جذبہ بیدار کرنے میں مضمر ہے جو کسی ظلم اور ناانصافی کو برداشت نہیں کرتا اور اگر کہیں کوئی خرابی پاتا ہے تو اس کی اصلاح کر دیتا ہے۔ یہی انقلابی جذبہ اسلام کا حقیقی اور امتیازی وصف ہے۔

کیا اسلام عوام کی افیون ہے؟

"مذہب عوام کی افیون ہے" کارل مارکس کا مشہور قول ہے جسے ممالک اسلامیہ میں اشتراکیت کے مبلغین اب تک آنکھیں بند کر کے دہراتے چلے آ رہے ہیں یہاں تک کہ اب اسلام بھی ان کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔

اہلِ یورپ کی مجبوری

کارل مارکس اور اشتراکیت کے دورِ اولین کے دوسرے رہنماؤں نے جس یورپی ماحول میں آنکھیں کھولیں، اس میں بعض ایسے اسباب و حالات موجود تھے جن کی وجہ سے وہ کلیسا اور اہلِ کلیسا کے خلاف بغاوت پر مجبور تھے۔ اس وقت یورپ میں بالخصوص روس میں جاگیرداری کا انتہائی وحشیانہ اور جابرانہ نظام قائم تھا جس کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں انسان بھوک اور سردی سے مر جاتے اور باقی رہ جانے والوں میں سے ایک کثیر تعداد تپ دق اور ایسے ہی دوسرے امراض کا شکار ہو جاتی تھی مگر کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا۔ اس کے برعکس جاگیرداروں کا طبقہ جس نے ان غریبوں کا خون چوس چوس کر اپنے لئے ہر طرح کے اسبابِ عیش و آسائش فراہم کر رکھے تھے، اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے نیاز دل کھول کر دادِ عیش دیتا تھا۔

اہلِ مذہب کا کردار

پھر ستم بالائے ستم یہ تھا کہ اگر کبھی غریب اور محنت کش عوام اس معاشرتی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتے یا انہیں اپنی محرومی کا احساس ہوتا تو اہلِ مذہب یعنی پادری نہیں تھپکیاں دے کر دوبارہ سلا دیتے۔ محنت کش اور مظلوم عوام کی مدد کرنے کے

بجائے وہ انہیں یہ کہہ کر صبر و شکر کی تلقین کرتے کہ "جو کوئی تمہارے دہنے گال پر طمانچہ مارے۔ دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور کوئی تم پر نالش کر کے تمہارا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے"۔ یہ ان سے کہتے کہ جو لوگ اس دنیا میں بے انصافی اور ظلم کا شکار ہیں، انہیں اس کے بدلے میں دوسری دنیا میں جنت اور امن و سکون سے بھرپور دائمی زندگی عطا ہو گی۔ اس لئے انہیں صبر کرنا چاہیئے اور اپنے حقوق کی خاطر کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کرنی چاہیئے۔ اس طرح ان لوگوں نے مظلوم عوام کو طفل تسلیاں دے کر انہیں اپنے حقوق کے حصول کی جد و جہد سے باز رکھا اور انقلابی راستہ پر آگے نہ بڑھنے دیا۔

طفل تسلیاں اور دھمکیاں

اگر اُخروی مسرت اور شادمانی کے ان وعدوں سے کام نہ چلتا، اور مظلوم اپنے حقوق پر اصرار کرتے تو اہل کلیسا دھمکیاں دے کر ان کا منہ بند کر دیتے۔ وہ کہتے کہ جو شخص اپنے جاگیردار آقا کے حکم سے سرتابی کرتا ہے وہ خدا، کلیسا اور پادریوں کا بھی باغی اور دشمن ہے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں کلیسا خود بہت بڑا جاگیردار تھا اور ہزاروں لاکھوں مزدور اس کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ اس لئے یہ بالکل فطری امر تھا کہ محنت کشوں اور جاگیرداروں کے درمیان کش مکش چھڑی، تو کلیسا نے روس کے شاہی خاندان اور اس کے حامی جاگیرداروں کا ساتھ دیا۔ کیونکہ یہ سب دراصل ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے اور اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ جب بھی کوئی عوامی انقلاب آیا تو اس کے احتساب سے نہ جاگیردار بچ سکیں گے اور نہ پادریوں کا گروہ۔ چنانچہ اگر اخروی کامیابی کے وعدوں اور دھمکیوں سے بھی بات نہ بنتی تو ڈنڈے سے خدا اور مذہب کے باغیوں کی خبر لی جاتی۔ اس معاملہ میں جاگیرداروں کو کلیسا کی مکمل حمایت حاصل ہوتی تھی۔ اہل کلیسا کے یہی وہ کارنامے ہیں جن کی وجہ سے یورپ کے لوگ رفتہ رفتہ یہ سمجھنے لگ گئے کہ انسان کا حقیقی دشمن مذہب ہے۔ کارل مارکس کے قول

"مذہب عوام کی افیون ہے" میں اسی تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

حکمرانوں کے ساتھی

اشتراکیت کے علمبردار مذہبی طبقے کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لوگ محنت پیشہ طبقات کے خلاف ہمیشہ حکمرانوں کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔ دائمی جنت کی امید میں یہ عوام کو تمام ذلتوں اور ناانصافیوں پر صبر و شکر کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ ان کا احساس زیاں مردہ ہو جائے اور ظالم بلاغل وغش ان کا خون چوس سکیں۔

جامعہ الازہر کی مثال

اس سلسلہ میں جامعہ الازہر کے بعض علماء کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے، جو بادشاہوں اور سلاطین کے ہاتھوں کو چومتے تھے اور ان کے حسب منشاء قرآن کی تاویل کر کے دین کا حلیہ بگاڑنے سے بھی باز نہ آتے تھے تاکہ حکمرانوں کی سلطنت اور دبدبہ قائم رہے اور عوام کو ان کے خلاف بغاوت سے باز رکھا جائے۔ چنانچہ یہ لوگ عوام کو کہتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنے حکمرانوں کے خلاف بغاوت یا ان کے حکم سے سرتابی کی تو خدا کے باغی اور گنہگار ہوں گے۔

اصل سوال

ممکن ہے کہ یہ سب باتیں صحیح ہوں مگر سوال تو یہ ہے کہ آیا ان پیشہ ور مذہبی رہنماؤں نے جو کچھ کیا وہ دین کے احکام کی پابندی کا نتیجہ تھا یا ان کی اپنی خود غرضی یا طالع آزمائی کی پیداوار؟

دنیا پرست علماء کی مثال

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں جو دنیا پرست علماء گزرے ہیں۔ ان کا

طرزِ عمل اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف تھا۔ ان کی مثال ویسی ہی تھی جیسی کہ موجودہ زمانے کے گمراہ شعراء، ادیبوں اور صحافیوں کی ہے جو مادی فائدے کی خاطر کسی بڑی سے بڑی غلاظت کو بھی گوارا کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہبی رہنماؤں کا یہ جرم سنگینی اور شناعت کے لحاظ سے دنیا پرست ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے کہیں زیادہ شدید نوعیت کا ہے کیونکہ علم دین کے امین ہونے اور روح دین سے آگاہی رکھنے کی وجہ سے ان سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ دین کے محافظ اور نگران بن کر کھڑے ہوں اور خدا کے دین کو مسخ کر کے وہ جس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، اس کی سنگینی اور شناعت سے خود وہ بھی بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

پیشہ ور مذہبی طبقہ اور اسلام

آگے بڑھنے سے پیشتر اس مقام پر ہم یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام میں اول تو کسی پیشہ ور مذہبی طبقہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ دوسرے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ مذہبی رہنما جو کچھ کہتے یا کرتے ہوں، وہی اسلام کا بھی منشا ہو۔ مسلمانوں کی بدنصیبی کی اصل وجہ ان کی اپنے دین سے بیگانگی اور بے پروائی ہے۔

اسلام ایک زبردست تحریکِ آزادی ہے

اسلام کے خلاف یہ الزام کہ وہ جبر و استبداد کے خلاف محنت کش عوام کو احتجاج یا بولنے کا حق ہی نہیں دیتا محض جھوٹ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ چنانچہ مصر کے سابق مطلق العنان بادشاہ سے جس تحریک نے مصریوں کو نجات دلائی اپنے آغاز کے لحاظ سے وہ در اصل ایک دینی تحریک تھی۔ یہی نہیں بلکہ اسلامی ممالک میں اٹھنے والی آزادی کی تمام تحریکیں اسلام ہی کی پیدا کردہ روح آزادی کی پیداوار تھیں۔ فرانس کے خلاف جب مصریوں نے آواز اٹھائی تو اس میں مسلمان علماء ہی پیش پیش تھے۔ محمد علی کی ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند

کرنے والے بھی ایک دینی رہنما عمر مکرام تھے۔ سوڈان میں انگریزوں کے خلاف تحریکِ آزادی کی قیادت المہدی نے کی جو وہاں کے ممتاز دینی عالم تھے۔ اسی طرح لیبیا میں اطالوی اور مراکش میں فرانسیسی سامراج کے خلاف جد و جہد کی روح رواں بھی اسلام ہی تھا۔ برطانوی شہنشاہیت کے خلاف کاشانی کی انقلابی تحریک بھی اسی روح اسلام کا ایک کرشمہ تھا۔ آزادی کی یہ تحریکیں اس بات کا بہت بڑا ثبوت ہیں کہ اسلام ایک زبردست تحریک آزادی ہے جو ہر قسم کی معاشرتی ناانصافیوں اور انسانی تذلیل و تحقیر کے خلاف ہے۔

قرآن سے اشتراکیوں کا غلط استدلال

اشتراکی مبلغین قرآن کی ان دو آیات کا اکثر حوالہ دیتے ہیں اور ان سے اپنے حسب منشا مطلب نچوڑ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام لوگوں کو ہر قسم کی ناانصافی اور ذلت صبر و شکر سے برداشت کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ (۴: ۳۲)	اور تم کسی ایسی چیز کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے
وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۲۰: ۱۳۱)	اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھئے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کیلئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ محض دنیوی زندگی کی رونق ہے اور آپ کے رب کا عطیہ (جو آخرت میں ملے گا) بدرجہا بہتر اور دیرپا ہے

قرآن کا صحیح مفہوم

پہلی آیت کی شان نزول تو مفسرین یہ بیان کرتے ہیں کہ جب مردوں پر جہاد فرض کیا گیا تو ایک عورت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مردوں کی طرح

عورتوں کو راہِ خدا میں قتال کے شرف سے کیوں محروم رکھا گیا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک دوسرا قول جو نسبتاً زیادہ مشہور ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں در اصل انسان کو آرزؤں اور تمناؤں کی خیالی دنیا میں بسنے سے روکا گیا ہے اور ایسے خیالی قلعے تعمیر کرنے کے مرض سے خبردار کیا گیا ہے جو انسان کی قوائے عمل کو بالکل کھوکھلا کر دیتا ہے اور انسان کینہ اور حسد جیسی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے جو مادی لحاظ سے بھی انسان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں ان سے بچنے اور ایسے کاموں پر انسان کو ابھارا گیا ہے جن کے نتیجے میں اس کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے اور اسے حقیقی عزت اور شرف حاصل ہوتا ہے۔

دوسری آیت انسان کو مادی سطح سے بلند ہونے کی دعوت دیتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ محض دنیاوی سرو سامان کی کثرت اور فراوانی کسی کی بڑائی اور عظمت کی دلیل نہیں ہے۔ ایسے لوگ درحقیقت نہ باعثِ رشک ہیں اور نہ انسان کے لئے قابلِ تقلید، جن کا دامن مادی خوشحالی کے سوا باقی تمام خوبیوں سے خالی ہو۔ اس آیت کے اولین مخاطب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس میں آپ کو یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خوشحال اور متمول کفار کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں ہے، کیونکہ وہ دولتِ ایمان سے محروم ہیں بلکہ اہمیت جو کچھ ہے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جو کہ حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہیں اور اس لئے حقیقی عزت و تکریم کے مستحق ہیں۔

صبر و قناعت کا مفہوم اور محل

یہ ہے ان دو آیات کا حقیقی مفہوم۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے اس سے قطع نظر آئیے (جیسا کہ اسلام کے معترضین کہتے ہیں) یہی فرض کر لیں کہ ان آیات میں انسان کو صبر و قناعت کی تعلیم دی گئی ہے اور دوسروں کو جو نعمتیں حاصل ہیں ان پر رشک کرنے سے روکا گیا ہے۔ پھر بھی سوال یہ ہے کہ ان احکام کا صحیح موقع و محل کیا ہے؟

اور وہ کون سے مواقع ہیں جب ان کی پابندی مطلوب ہے؟

تصویر کے دو رُخ

اس سوال کے جواب کو سمجھنے کے لئے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کی پیروی اور تعمیل کا منشا صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب اس کے پورے کے پورے نظام کو اس کی تمام تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ قبول کیا جائے، تبھی اس کی حقیقی روح جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ اسلام غریبوں اور محرومین کے گروہ کو صابر و شاکر رہنے کی تلقین کرتا ہے اور انہیں سکھاتا ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ دولت مندوں کی دولت اور خوشحالی پر حسد اور رشک نہ کریں، بلکہ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف وہ خوشحال اور کھاتے پیتے لوگوں سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ خود غرضی سے بچیں اور خدا کی دی ہوئی دولت زیادہ سے زیادہ اس کی راہ میں خرچ کریں۔ یہی ان کے لئے نجات کی راہ ہے ورنہ آخرت میں انہیں شدید عذاب بھگتنا پڑے گا۔ تصویر کے ان دونوں پہلوؤں کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے جو راہ اختیار کی ہے، دراصل وہی اعتدال اور انصاف کی راہ ہے۔

اسلام کی معاشی پالیسی

اسلام کی معاشی پالیسی یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو انسان کو اپنی ذات سے بالاتر ہو کر پوری بے لوثی اور بے غرضی سے خرچ کرنے کی راہ دکھاتا ہے اور دوسری طرف اسے کینہ اور حسد سے بچنے کی تاکید کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو ابنائے جنس میں ذلیل نہ کرتا پھرے۔ اس طرح اسلام معاشرے کو حقیقی روحانی سکون سے بہرہ ور کرتا ہے جو معاشی انصاف کے تقاضوں سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے کیونکہ وہ

دولت کو معاشرے کے تمام افراد میں اس طرح پھیلا دینا چاہتا ہے کہ نہ تو کچھ لوگوں کو اتنا زیادہ ملے کہ وہ بدمستیوں میں مبتلا ہو جائیں اور نہ یہ صورت حال رونما ہو کہ غریب طبقے دائمی محرومی اور بدبختی کا شکار رہیں۔

اسلامی معاشرے کی خصوصیت

اسی لئے جب کوئی معاشرہ اسلامی بنیادوں پہ استوار ہوتا ہے تو اس میں سے ناانصافی اور معاشی محرومیوں کی ان تمام ظالمانہ صورتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو غیر اسلامی معاشروں میں بالعموم مظلوم اور زیر دست طبقات کی تقدیر کا حصہ بن جاتی ہیں مگر یہ صرف اسی معاشرہ کے بارے میں صحیح ہے جس میں امیر اور متمول افراد اپنے فرائض سے آگاہ ہوں اور انہیں ادا کرنے کے لئے بھی پوری طرح آمادہ ہوں۔ کیونکہ اگر امیر اور خوشحال طبقہ اپنے فرائض کی ادائیگی سے پہلوتہی کرے اور اللہ کی راہ میں اپنا مال اور دولت خرچ نہ کرے تو غریبوں اور مظلوم عوام کو صبر و سکون سے اپنی محرومیوں اور ان ناانصافیوں کو گوارا کرنے کی تعلیم کیسے دی جا سکتی ہے۔ اور انہیں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم اور ناانصافی کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بھی بلند نہ کریں۔ یقیناً اسلام کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ اس کے نزدیک وہ تمام لوگ جو ناانصافی اور ظلم کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ان کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کرتے اس دنیا اور آخرت دونوں جگہ شدید عذاب کے مستحق ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے انکی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنکا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۙ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا (۴ : ۹۷، ۹۸)

ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتے۔ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف کردے اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔

ایک ناقابل معافی جرم

ناانصافی اور ظلم کو محض کمزوری کی وجہ سے قبول کر لینا قرآن کے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ چنانچہ وہ ایسے لوگوں کو ظَالِمِیْ اَنْفُسِہِمْ یعنی اپنے نفس پر ظلم کرنے والے کہہ کر پکارتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ انسانی عزت و شرف کے اس اعلیٰ مقام سے گر کر پستیوں پر قانع ہو جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے مقرر فرما دیا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اس کے حصول کی خاطر اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں کھپا دے۔

ظلم اور ناانصافی اسلام کی نظر میں

ہجرت کا یہ حکم جب نازل ہوا تو مسلمان کفار کے درمیان گھرے ہوئے اور ان کے ظلم وستم کے شکار تھے۔ مذہبی تشدد اور عدم رواداری نے ان کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ اس وقت ہجرت کا حکم نازل ہوا۔ مگر ہجرت ظلم وستم کے مقابلے کی محض ایک صورت اور ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ذرائع سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس موقع پر ہم جو حقیقت بالخصوص قارئین کرام کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام ناانصافی اور ظلم کو چپ چاپ برداشت کرنے کو انتہائی بھیانک فعل سمجھتا ہے اور اس پر اسے اس حد تک اصرار ہے کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ واقعی کمزور، بے بس اور مظلوم تھے اور جن کو ظلم اور ظالموں کے مقابلے کے لئے کوئی قوت اور ذریعہ

بھی حاصل نہیں تھا۔ ان کے لئے بھی مندرجہ بالا آیت میں محض مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے اور وہ بھی یقینی مغفرت کا نہیں۔ حالانکہ ان کا عذر حقیقی اور معقول تھا۔ اور ان کی کمزوری اور مظلومی ایک امر واقعہ۔ اس آیت میں دراصل جس حقیقت پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر آدمی کو ظلم اور ناانصافی کا مقابلہ کرنے کی ذرہ بھر قوت بھی حاصل ہو، تو اس کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ اسے گوارا کرلے اور اسے ختم کرنے اور مٹانے کے لئے کوئی کوشش نہ کرے۔

رہے کمزور، بے بس اور مظلوم مسلمان تو اسلام انہیں بھی تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ ساری امت مسلمہ کو ان کی حفاظت اور امداد کے لئے ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اس مقصد کے لئے ظالموں سے لڑنے اور جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا (۴:۷۵)	آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار بنا دے

اس آیت سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم اور ناانصافی کے آگے سر نہیوڑا دینے والے لوگوں کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ ہر اس انسان سے جو اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ حق پسندوں کے ساتھ مل کر ناانصافی اور ظلم کے خلاف صف آرا ہو جائے تاکہ جو لوگ ظالموں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوں، انہیں اس سے نجات ملے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ممکن ہے بعض ذہنوں میں یہ خیال ہو کہ محولہ بالا آیات کا تعلق تو صرف دین اور

ایمان سے ہے اور ان کا اطلاق صرف اس حالت پر ہوتا ہے جب مسلمان زبردست، مظلوم، کمزور اور بے بس ہوں، کفار میں گھر گئے ہوں اور انہیں اپنے دینی فرائض کی بجاآوری کی آزادی بھی حاصل نہ ہو۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ ایک جامع نظام ہونے کی حیثیت سے اسلام مذہبی مراسم عبودیت کی ادائیگی اور معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کی اصلاح اور فلاح و بہبود کو یکساں اہمیت دیتا ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں سمجھتا کیونکہ ان سب کی بنیاد عقیدۂ اسلامی پر ہے اور یہیں سے انکے سوتے پھوٹتے ہیں۔ چنانچہ اسلام کی نگاہ میں اسلامی عبادات کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالنے والے ہوں یا اسلامی نظام حیات کے قیام کی راہ روکنے والے سب برابر ہیں۔ خواہ یہ لوگ عمل اور نام دونوں کافر ہوں یا نام کے تو مسلمان ہوں اور عمل میں خدا کے باغی اور کافر! یہی قرآن عزیز کا فیصلہ ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵: ۴۴)	اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی کافر ہیں۔

بہر حال اسلام چاہتا ہے کہ دولت محض چند گھرانوں ہی میں محدود نہ رہے بلکہ سارے معاشرے میں گردش کرتی رہے۔ اس کے ساتھ ہی ریاست اسلامی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو روزگار فراہم کرے اور اگر ایسا نہ کر سکے یا کوئی شہری کسی جسمانی معذوری یا کمزوری کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہے تو خزانۂ عامرہ سے اس کی دست گیری اور اعانت کرے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد[1] کے مطابق اسلامی حکومت اپنے ملازمین

---

[1] فاضل مصنف کا اشارہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی جانب ہے جس میں آپ سے مروی ہے کہ "جو شخص ہمارے (یعنی اسلامی ریاست کے) عامل کی حیثیت سے کسی خدمت پر مامور ہے اگر اس کی بیوی نہیں ہے تو اس کی شادی کرائی جائے گی۔ اگر اس کے پاس مکان نہیں تو اسے مکان مہیا کیا جائے گا، اور اگر اس کے پاس کوئی خادم نہیں تو اسے خادم بھی دیا جائے گا۔" (مترجم)

کو بعض خصوصی تحفظات دینے کی بھی پابند ہے۔ ان تحفظات کا اطلاق ان ملازمین پر بھی ہوتا ہے جو کسی پرائیویٹ یا پبلک ادارہ میں کوئی خدمت انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ زندگی کے یہ سارے پہلو اسلامی نظام ہی کے مختلف شعبے اور اس کے اجزائے غیر منفک ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی پہلو میں بھی خدا کے قانون کو نظر انداز کرے، وہ سچا مسلمان نہیں ہے۔ وہ اپنے دعویٰ ایمان میں صرف اسی صورت میں مخلص ہو سکتا ہے۔ جب وہ خدا کی زمین پر اس کا قانون نافذ کرنے کی جدوجہد کرے۔ چنانچہ جو لوگ اسلام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کو دنیا میں غالب کرنے کی جدوجہد میں کوئی حصہ نہیں لیتے قرآن انہیں برضا ورغبت ظلم اور ناانصافی اور استبداد سے مصالحت کا مجرم قرار دیتا ہے اور انہیں ظَالِمِىٓ اَنْفُسِهِمْ کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

جو لوگ قرآن کی آیات وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اور وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام ظلم اور ناانصافی کو خاموشی سے برداشت کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے ان لوگوں کی اس بات کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی نتائج سے خود بخود ان کے دعویٰ کی تردید ہو جاتی ہے، کیونکہ اس سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں، وہ اسلام کی عین ضد واقع ہوئے ہیں۔

ان لوگوں کے مزعومہ مفہوم آیات کا پہلا نتیجہ یہ ہو گا کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے گی۔ اور باقی سب اس کے فوائد اور ثمرات سے محروم ہو جائیں گے (جیسا کہ فی الواقع جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظاموں میں ہوتا ہے) مگر یہ صورت حال منشائے الٰہی کے صریحاً خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم میں صاف صاف حکم موجود ہے:

كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ — تاکہ دولت، دولت مندوں ہی میں نہ گردش کرتی رہے۔ (۵۹:۷)

دوسرا نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ مالدار لوگ اپنی دولت پہ سانپ بن کر بیٹھ جائیں گے اور خرچ کریں گے بھی تو صرف اپنی ذات اور ذاتی عیش و عشرت پہ۔ ایسے لوگوں ہی کے

متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (۹ : ۳۴)

درد ناک عذاب کی خوشخبری دو۔ ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے

جس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ صورت بھی انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر عیاشی اور عیش پرستی کی مذمت کی گئی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ (۳۴ : ۳۴)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو ان احکام کے منکر ہیں جو تم کو دیکر بھیجا گیا ہے۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ○ (۱۷ : ۱۶)

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۙ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۙ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ○ (۵۶ : ۴۱ تا ۴۵)

اور بائیں والے! بائیں والے کیسے بُرے ہیں! وہ لوگ آگ میں ہوں گے اور کھولتے ہوئے پانی میں اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں جو نہ ٹھنڈا ہو گا اور نہ فرحت بخش ہو گا۔ وہ لوگ اس سے پہلے دنیا میں بڑی خوشحالی میں رہتے تھے۔

الغرض اگر معاشرتی ظلم اور ناانصافی کے خلاف لوگ جہاد چھوڑ دیں تو اس سے سوائے برائی اور تباہی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے متعلق یہ کہنا

کہ وہ لوگوں کو خدا کی خوشنودی اور رضا کی خاطر سر نیہوڑا کر معاشرتی ظلم اور ناانصافی کو گوارا کرنے کی تعلیم دیتا ہے محض جھوٹ اور بہتان ہے۔ قرآن کے نزدیک معاشرتی برائیوں کو پھیلتے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہنا اور انہیں روکنے کے لئے کچھ نہ کرنا دراصل کفر کی علامت ہے، جس سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اور پوری قوم اس کی لعنت اور عذاب کی مستحق قرار پاتی ہے:

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ○ کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ○ (۵: ۷۸، ۷۹)	بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے۔ اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ برا طرز عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من رای منکم منکراً فلیغیرہ

تم میں سے جو شخص کسی برائی کا ارتکاب ہوتے دیکھے تو اسے ختم کرنے کی کوشش کرے۔

افضل الجهاد عند الله كلمة حق عند امام جائر

بہترین جہاد ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔

آنحضورؐ کے ان دو ارشادات کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ اہم حقیقت سامنے آتی ہے کہ معاشرتی ناانصافی اور برائیاں صرف اسی وقت کسی معاشرے میں سر اٹھاتی ہیں جب اس کے حکمران عدل و انصاف اور بھلائی کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ ایسے حکمرانوں کے خلاف جہاد اسلام کے نزدیک ہر مسلمان کا فرض ہے اور یہی رضائے الٰہی کے حصول کی راہ ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ کیسے دانشور ہیں جو اسلام کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ وہ انسان کو خاکساری اور عاجزی سے ہر طرح کی ناانصافی اور ظلم برداشت کرنے

کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسی باتیں صرف وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو مذہبی تعصب میں اندھے ہو چکے ہوں یا اپنی خواہشاتِ نفس اور جذبات کے بندے ہوں۔ اور اسلام کے خلاف ہر طرح کی جھوٹی باتیں پھیلانے کے مرض میں مبتلا ہوں۔

ان آیات کا ایک قابلِ غور پہلو

متذکرہ بالا آیات میں انسان کو خیالی قلعے تعمیر کرنے سے جو روکا گیا ہے اس میں سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ انسان اس طرح کے جتنے بھی خیالی پلاؤ پکاتا ہے، ان کی وجہ سے اس کی عملی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں کیونکہ ان میں کسی حقیقی تخلیقی کوشش کا دخل نہیں ہوتا۔ ان آیات کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ یہ انسان کو بتاتی ہیں کہ ریاست، معاشرہ یا قوم کا وجود حقیقی اور فطری ہے۔ اگر انسان چاہے تو بھی وہ انہیں ختم نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کے لئے بہترین رویہ یہی ہے کہ وہ ان کے وجود کو تسلیم کر کے اپنے طرزِ عمل کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔

خیالی آرزوؤں کی تباہ کاری

بہرحال جہاں تک خیالی آرزوؤں میں ہر وقت مگن رہنے کا سوال ہے، یہ حقیقت ہے کہ ان سے فائدہ کے بجائے نقصان ہی ہوتا ہے کیونکہ دنیا میں بعض افراد ایسی خداداد صلاحیتیں اور قابلیتیں لے کر آتے ہیں جن کی بدولت انہیں شہرت بھی حاصل ہوتی ہے اور عزت اور ہر دلعزیزی بھی۔ اس کے برعکس کچھ اور لوگ ہوتے ہیں جن کے دل میں شہرت اور ناموری کی تمنا تو ہوتی ہے مگر اس تک پہنچنے کے لئے جن صلاحیتوں اور قابلیتوں کی ضرورت ہوتی ہے ان سے محروم ہونے کی وجہ سے وہ نہ اسے حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اس کے اہل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بے بنیاد آرزوؤں کی تسکین کے لئے ریاست چاہے بھی تو کچھ نہیں کر سکتی اور نہ انہیں مختلف ذہنی عوارض اور حسد و کینہ کا رنگ اختیار کرنے سے روک سکتی ہے۔ وہ ان لوگوں کو

قابلیت اور صلاحیت کا وہ جوہر کہیں سے لا کر نہیں دے سکتی جس سے وہ محروم ہوتے ہیں۔

مسرت و حُسن میں مساوات

مزید وضاحت کے لئے فرض کیجئے، دو عورتیں ہیں جن میں سے ایک تو پیکرِ حسن و جمال اور دیکھنے والوں کے لئے جنتِ نگاہ ہے اور دوسری میں نہ حسن ہے، نہ دلکشی اور نہ سنجیدگی اور وقار۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ چاہتی ہے کہ لوگ اس کے حسن و جمال کی تعریف میں رطب اللسان ہوں، اور اسے اپنی تمام دلچسپیوں اور توجہ کا مرکز بنائیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ریاست ان دونوں کو حسن و جمال اور دلکشی کے لحاظ سے ایک سطح پر لا سکتی ہے؟ اسی طرح دو شادی شدہ جوڑوں کی مثال سے بھی اس حقیقت کی وضاحت کی جا سکتی ہے جن میں سے ایک میں میاں بیوی باہمی الفت و محبت اور اعتماد کی فضا میں مسرور زندگی بسر کر رہے ہیں، اولاد کی نعمت سے بھی بہرہ ور ہیں جو ان کی ازدواجی زندگی کے حسن و مسرت کو دوبالا کرتی ہے۔ مگر دوسرا جوڑا ازدواجی زندگی کی تمام خوشیوں اور شادمانیوں سے محروم ہے۔ اور باوجود ہر طرح کا علاج کرانے کے اولاد کی نعمت سے بھی اس کا دامن خالی ہے۔ دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی کیا اس جوڑے کی ازدواجی زندگی کو خوشی اور اطمینان سے ہمکنار کر سکتی ہیں؟

واحد معقول راہ

الغرض انسانی زندگی کے بے شمار ایسے پہلو ہیں جن میں نہ تو کوئی اقتصادی حل کام دیتا ہے اور نہ سماجی انصاف کا کوئی منصوبہ۔ اس قسم کے تمام حالات میں انسان کے لئے واحد معقول راہ ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ مشیت ایزدی پر صابر و شاکر رہے اور قناعت کو اپنا شیوہ بنائے اور یہ سمجھے کہ اس دنیا میں انسان کو جن پیمانوں کے مطابق ملتا ہے وہ زمینی پیمانوں سے مختلف ہیں، اور ان میں اس دنیا کی محرومیوں کی اُخروی کامرانیوں اور شادمانیوں کی صورت میں تلافی کی پوری پوری گنجائش موجود ہے۔

روس کے دعویٰ کی حقیقت

خالص معاشی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی کون کہہ سکتا ہے کہ اس دنیا میں کامل مساوات ممکن ہے۔ آج دنیا میں کسی ایک ملک کی بھی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جس کے باشندے اجرتوں اور مناصب کے لحاظ سے آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہوں۔ سوویت روس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کامل مساوات قائم کر دی ہے لیکن کیا وہاں کوئی معاشرتی اونچ نیچ نہیں پائی جاتی؟ فرض کیجیئے روس کا کوئی کاریگر آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی شدید خواہش رکھتا ہے اور انجینئر بننا چاہتا ہے مگر اپنی ناقص ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے تمام سہولتوں اور مواقع کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا، تو آخر ریاست اس کی کیا مدد کر سکتی ہے؟ اسی طرح اگر کوئی مزدور جسمانی کمزوری کے باعث متعین اوقاتِ کار کے بعد کام کرنے کے قابل نہ ہو مگر اُس کے باوجود زائد اوقات میں کام کرنے کی اجرت کا آرزومند ہو جو صرف ایک مضبوط اور توانا مزدور ہی کا حصہ ہے تو ریاست اس کی آرزو کیسے پوری کر سکتی ہے؛ ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاملات میں ریاست کچھ نہیں کر سکتی۔ اب اگر اس قسم کے لوگ اپنی ناتمام آرزوؤں اور تمناؤں کو دلوں میں پالتے رہیں مگر عملاً کچھ نہ کر سکیں تو اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی زندگی دائمی تفکرات میں گھر جائے اور وہ خواہشات آرزوؤں اور غیر صحت مند کینہ و حسد کے جذبات سے کبھی آزاد نہ ہو سکیں۔ ایسے پراگندہ خاطر اور پریشان خیال لوگ اپنا کوئی فرض بھی اطمینان بخش طریقے پر انجام نہیں دے سکتے کیونکہ ہوسِ اقتدار اور بھاری تنخواہوں کا لالچ انہیں کبھی امن و چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ حرص و ہوس کی اس بیماری کو قتل و غارت اور جبر و تشدد کے ذریعہ ختم کرنا بہتر ہے یا یہ زیادہ بہتر ہے کہ آدمی اپنی داخلی تحریک اور ارادے کی مدد سے اس پر قابو پا لے؟ یہی وہ حکمت ہے جو اوپر کی آیات میں صبر و شکر کی تلقین میں پائی جاتی ہے۔

خلاصۂ بحث

یہ ہے اسلام کی دعوت کا خلاصہ۔ وہ انسان کی تمام جائز خواہشات اور ضروریات کا لحاظ کرتا ہے اور انہیں پورا کرنے کی راہیں نکالتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان تمام حقائق کو بخوشی تسلیم کرتا ہے جن میں تغیّر و تبدل انسان کے بس سے باہر ہے مگر جہاں کوئی ظلم اور ناانصافی پائی جائے اور اس کا تدارک بھی ممکن ہو تو آدمی کے ایمان اور رضائے الٰہی کے حصول کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسے مٹانے اور ختم کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے:

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا
فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ	جائے گا یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجرِ عظیم
اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۴ : ۷۴)	عطا کریں گے۔

بہرحال اگر دنیا میں کوئی ایسا مذہب ہے، جسے عوام کی افیون کہا جا سکتا ہے، تو یقیناً اسلام وہ مذہب نہیں ہے، کیونکہ وہ ظلم اور ناانصافی کی تمام صورتوں کا دشمن ہے اور اس سے سمجھوتہ یا مصالحت کرنے والوں کو دردناک عذاب کا مستحق سمجھتا ہے۔

اسلام اور غیر مُسلم اقلیّتیں

بعض لوگوں کے نزدیک اسلامی حکومت کے بارے میں غیر مسلم اقلیتوں کا رویہ ایک بہت نازک موضوع ہے جس کو چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ اس سے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں منافرت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے لوگ اس موضوع پر کچھ کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔

اقلیتوں کا بے بنیاد خوف

مگر ہم چاہتے ہیں کہ مشرق میں رہنے والے عیسائیوں سے کھل کر بات کریں اور ان سے پوچھیں کہ انہیں اسلام کی حکومت سے ڈر کیوں لگتا ہے؟ کیا وہ اسلامی قوانین سے خائف ہیں یا عملی زندگی میں ان کے انطباق سے ڈرتے ہیں؟

قرآن اور اقلیتیں

جہاں تک نصوص قرآنی کا تعلق ہے، ہم ان کی توجہ ذیل کی آیات کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۶۰:۸)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ

آج تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں

اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (۵:۵)

اور اہل کتاب کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں اور پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں۔

فقہِ اسلامی کا اصول

اس سلسلے میں ہم اسلامی فقہ کے اس اصول کی طرف بھی قارئین کی توجہ دلانا چاہتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ان پر (یعنی غیر مسلموں پر) ویسی ہی ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہوں گے، جیسے کہ ہم (یعنی مسلمانوں) پر عائد ہوتے ہیں۔

قرآن مسلمانوں کو یہ ہدایت بھی کرتا ہے کہ وہ غیر مسلموں سے رحمدلانہ اور منصفانہ سلوک کریں، عبادت کے معاملے میں وہ نہ صرف مسلمانوں کی طرح آزاد ہوتے ہیں بلکہ اسلامی ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے معاشرتی حقوق و فرائض سے بھی اسی طرح فائدہ اٹھاتے ہیں، جس طرح مسلمان آبادی ان سے بہرہ مند ہوتی ہے۔ مزید برآں اسلام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کو مضبوط بناتا ہے اس غرض کے لیے وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے گھر جانے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی اجازت دیتا ہے، جیسا کہ انتہائی عزیز دوستوں کے ہاں کھایا جاتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ اسلام مسلمانوں کو غیر مسلموں سے شادی بیاہ تک کی اجازت دیتا ہے جو سماجی رشتوں میں سے مضبوط ترین رشتہ اور تعلق ہوتا ہے۔

سر آرنلڈ کی شہادت

رہ گیا اسلام کی ان تعلیمات پر عمل، تو اس معاملے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے ہم یورپ کے عیسائی مصنفین ہی کا حوالہ دیں گے جن کے متعلق کسی کو یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خواہ مخواہ اسلام کی حمایت کریں گے، یا اسلام کی عقیدت اور تعصب

میں مبتلا ہوں گے۔ سر آرنلڈ اپنی کتاب (THE PREACHING OF ISLAM) میں لکھتے ہیں:

"یہ بات کہ ان لوگوں کا قبولِ اسلام کسی طاقت یا جبر کا نتیجہ نہیں تھا ان خوشگوار تعلقات سے بھی واضح ہوتی ہے جو اس زمانے کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان موجود تھے۔ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی ایک عیسائی قبائل سے معاہدات کیے جن کی رُو سے آپؐ نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا اور انہیں اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرنے کی ضمانت دی اور ان کے مذہبی پیشواؤں کے ان تمام حقوق اور اقتدار کو قائم رکھا جو انہیں اسلام سے قبل حاصل تھا۔" (صفحہ ۴۸)

آگے چل کر وہ کہتے ہیں:-

"پہلی صدی ہجری کے مسلمان فاتحین نے عربی النسل عیسائیوں سے جس رواداری کا مظاہرہ کیا، اور جس کا سلسلہ ان کے بعد آنے والی نسلوں نے بھی جاری رکھا، ان کو دیکھتے ہوئے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جن عیسائی قبائل نے اسلام قبول کیا، انہوں نے برضا و رغبت ایسا کیا۔"

(صفحہ: ۵۱)

"جب مسلمانوں کی افواج وادیٔ اردن میں پہنچیں، اور حضرت ابو عبیدہؓ نے فحل کے مقام پر اپنا خیمہ لگایا، تو اس علاقے کے عیسائی باشندوں نے عربوں کو لکھا: "اے مسلمانو ہم تمہیں بازنطینیوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں۔ کیونکہ تم نے ہمارے ساتھ اپنا عہد زیادہ اچھی طرح نبھایا ہے، تم ہم پر زیادہ مہربان ہو، کوئی بے انصافی نہیں کرتے، اور ہم پر تمہاری حکومت ان کی حکومت سے بہتر ہے کیونکہ انہوں نے ہمارا مال و اسباب اور گھر سب کچھ لوٹ لیا ہے۔" (صفحہ ۵۵)

مسٹر آرنلڈ آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"یہ تھا شام کے صوبے میں عوامی جذبات کا عالم ۶۳۳ء ۶۳۹ء کی مہم کے دوران جب عربوں نے رومیوں کو بتدریج شام سے نکال باہر کیا۔ ۶۳۵ء میں دمشق نے عربوں سے بعض شرائط پر صلح کر لی اور اس طرح جب اپنے آپ کو نہ صرف ان کی یلغار سے بچا لیا بلکہ کچھ مزید فوائد بھی حاصل کر لئے تو اس کے جلد ہی بعد شام کے دوسرے شہروں کے باشندوں نے بھی اس کی مثال پر عمل کیا۔ حمص (EMESSA) آرتھسا (ARTHUSA) آریتھیسا (ARETHUSA)، ہیروپولس (HIEROPOLIS) اور دوسرے شہر یکے بعد دیگرے معاہدے کر کے عربوں کے باجگزار بن گئے۔ یروشلم کے بزرگ پادری (PATRIARCH) نے بھی اسی طرح کی شرائط پر شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ بد عقیدہ شہنشاہ کے مذہبی جبر و تشدد کی وجہ سے انہیں سلطنتِ روما اور اس کی عیسائی حکومت سے تعلق کے مقابلے میں مسلمانوں کی مذہبی رواداری زیادہ خوش آئند معلوم ہوئی۔ حملہ آور فوج کے ابتدائی خوف کی لہر کے گزر جانے کے بعد ان لوگوں میں عرب فاتحین کے حق میں ایک گہرا جذباتی ردعمل وقوع پذیر ہوا۔" (صفحہ ۵۵)

یہ ہے ایک عیسائی عالم کی شہادت اسلامی حکومت کے بارے میں۔ اس کے بعد عیسائیوں کے لئے اسلامی نظام سے خوف زدہ ہونے کی کیا وجہ باقی رہ جاتی ہے؟

مذہبی "جنون" کا شکار کون ہے — مسلمان یا غیر مسلم

ہو سکتا ہے کہ عیسائی مسلمانوں کے "مذہبی جنون" سے خوفزدہ ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی تعصب و جنون کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ اگر وہ اس کا صحیح مفہوم معلوم کرنا چاہتے ہیں تو وہ انہیں مندرجہ ذیل مثالوں میں ملے گا:

مذہبی عدالتیں

کلیسا نے جو مذہبی عدالتیں (INQUISITION COURTS) قائم کی تھیں،

ان کا اصل مقصد اسپین کے مسلمانوں کی بیخ کنی تھا۔ ان عدالتوں نے مسلمانوں کو بھیانک سزائیں دیں اور انہیں ستانے کے ایسے ایسے مکروہ طریقے اختیار کئے جو اس سے قبل کہیں نہیں دیکھے گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو زندہ جلوا دیا، ان کے ناخنوں کو کھینچ کر گوشت سے جدا کر دیا، آنکھیں نکالی گئیں اور ان کے اعضا کاٹے گئے۔ اس ساری کارروائی کا مقصد مسلمانوں کو اپنے دین سے منحرف کر کے انہیں عیسائیت کے ایک خاص عقیدہ کا حلقہ بگوش بنانا تھا۔

کیا مشرق کے اسلامی ممالک میں رہنے والے عیسائیوں کو بھی کبھی اس طرح کے سلوک سے واسطہ پیش آیا ہے؟

مسلمانوں کا قتل عام

آج بھی تعصب کے پجاری یوگوسلاویہ، البانیہ، روس اور اہل یورپ کے زیر اثر ممالک مثلاً شمالی افریقہ، سمالی لینڈ، کینیا اور زنجبار اور ملایا اور بھارت میں کبھی امن و سلامتی کے نام پر اور کبھی قوم کی تطہیر کے نام پر مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہتے ہیں۔

ایتھوپیا ــــ مذہبی جنون اور تعصب کی ایک مثال

مذہبی تعصب کی ایک اور مثال ایتھوپیا ہے جو زمانۂ قدیم سے مصر کے ساتھ تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی اور مذہبی رشتوں میں منسلک چلا آرہا ہے۔ اس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی مخلوط آبادی ہے۔ مسلمان کل آبادی کا ۳۵-۶۵ فیصد ہیں مگر اس کے باوجود پورے ملک میں ایک بھی ایسا سکول نہیں جس میں ان کے بچوں کے لئے اسلامیات یا عربی زبان پڑھانے کا کوئی انتظام موجود ہو۔ مسلمانوں نے اپنی کوشش سے جو تھوڑے بہت پرائیویٹ مدرسے کھولے ہیں ان پر بھاری ٹیکس عائد ہیں اور ان کے لئے طرح طرح کی مشکلات پیدا کی جاتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ ناکام ہو جاتے ہیں اور پھر کسی کو نئے مدرسے کھولنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس طرح کوشش کی جاتی ہے کہ اسلامی تعلیم کوئی ترقی نہ کر

سکے اور اس کے پڑھانے والے تدریس کے فرسودہ اور پامال طریقوں سے کبھی اوپر نہ اٹھ سکیں۔

مسلمانوں کی حالتِ زار

اطالوی حملے سے پہلے ایتھوپیا میں یہ حال تھا کہ اگر کوئی مقروض مسلمان اپنے عیسائی قرضخواہ کا قرضہ وقت مقررہ پر لوٹانے میں ناکام رہتا تھا، تو قرضخواہ اس کو اپنا غلام بنا لیتا تھا۔ اور اس طرح حکومت کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کو غلام بنا کر بیچا جاتا، اور طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا کیا جاتا تھا۔

پھر باوجودیکہ مسلمان حبش کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ہیں، ان کی نمائندگی کے لیے نہ کابینہ میں کوئی مسلمان وزیر ہے اور نہ کسی اور کلیدی عہدے پر کوئی مسلمان فائز ہے۔

کیا اسلامی ممالک میں بسنے والے عیسائیوں کو کبھی اس طرح کے برتاؤ سے واسطہ پڑا ہے؛ اور آج ان کے ہم مذہبوں نے مسلمانوں کے متعلق جو سلوک اختیار کر رکھا ہے کیا وہ اپنے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جانا پسند کریں گے۔

بہرحال یہ ہے مذہبی تعصب و جنون کا صحیح مفہوم!

اقلیتیں اور معاشی آزادی

اشتراکیوں کے نزدیک انسان کی زندگی اصل میں معاشی آزادی سے عبارت ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس مفروضہ کو صحیح مان لیا جائے تو اسلامی ممالک میں رہنے والے عیسائی کیا کبھی زندگی کی اس اصل قدر سے محروم ہوئے ہیں؟ کیا انہیں کبھی اسلامی حکومتوں نے جائیدادیں بنانے، خریدنے، بیچنے اور مال و دولت جمع کرنے سے منع کیا ہے؟ کیا محض اختلاف مذہب کی بنا پر انہیں تعلیم، عہدوں اور حکومت میں اعلیٰ مناصب سے محروم رکھا گیا ہے؟

انگریز کی شرارت

جہاں تک اخلاقی اور روحانی زندگی کا تعلق ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں عیسائیوں کو کبھی روائتی مذہبی تشدد (PERSECUTION) سے سابقہ پیش نہیں آیا۔ دورِ جدید میں اس کی جو اکا دکا مثالیں ملتی ہیں، ان کی اصل وجہ انگریزی سامراج تھا جس نے جان بوجھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی تاکہ مختلف گروہوں میں انتشار و افتراق کے بیج بوئے جاسکیں۔

جزیہ اور اس کی حقیقت

بعض مخالفین جزیہ کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ غیر مسلموں سے اس کی وصولی کی اصل وجہ مذہبی عدم رواداری تھی۔ اس الزام کا بہترین جواب سر آرنلڈ نے دیا ہے۔ وہ اپنی اس کتاب[1] میں لکھتے ہیں:۔

"اس کے برعکس مصری کسانوں کو جو مسلمان تھے، جب فوجی خدمت سے مستثنیٰ کیا جاتا تھا تو اس کے عوض ان پر ویسا ہی ایک ٹیکس عائد کیا جاتا تھا جیسا کہ عیسائیوں پر عائد ہوتا تھا۔ (صفحہ: ۶۳)

آگے چل کر مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں:۔

"جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے جزیہ صرف تندرست مردوں سے اس فوجی خدمت کے عوض وصول کیا جاتا تھا جو انہیں مسلمان ہونے کی صورت میں انجام دینی پڑتی۔ اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب عیسائی مسلمان فوج میں شامل ہو کر فوجی خدمت انجام دیتے تھے، تو انہیں اس ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ الجراجمہ کے عیسائی قبیلے کے ساتھ جو کہ انطاکیہ (ANTIOCH) کے نواح میں آباد تھا، مسلمانوں نے

---

[1] THE PREACHING OF ISLAM

نے اس شرط پر صلح کی تھی کہ وہ ان کے حلیف ہوں گے اور جنگ میں ان کی طرف سے لڑیں گے۔ اس کے بدلے میں انہیں جزیہ نہیں دینا پڑے گا بلکہ مالِ غنیمت میں سے انہیں مناسب حصہ دیا جائے گا۔" (صفحہ: ۶۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جزیہ مسلمانوں کی عدم رواداری کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک ایسا ٹیکس تھا جو ان تمام لوگوں سے بلالحاظ مذہب و ملت وصول کیا جاتا تھا جو فوجی خدمت انجام نہیں دیتے تھے۔

قرآن میں جزیہ کا حکم

اس معاملہ سے متعلق آیت کریمہ پر ایک نظر ڈال لینا خالی از فائدہ نہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (۹:۲۹)

جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو صرف ان غیر مسلموں سے جنگ کرنے پر ابھارا گیا ہے جو اسلام کے خلاف نبرد آزما ہوتے ہیں۔ اس کا مسلمان ممالک میں بسنے والے غیر مسلم باشندوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

موجودہ اختلاف و افتراق کے ذمہ دار

آخر میں ہم یہ حقیقت بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں اور اسلامی ممالک کے غیر مسلم باشندوں میں اختلاف اور افتراق کی موجودہ فضا نوآبادیاتی سامراجیوں اور

کمیونسٹوں کی پیدا کردہ ہے۔

اشتراکی شرارت

اشتراکی مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کی دکھتی ہوئی رگ سے واقف ہیں چنانچہ جب وہ مزدوروں سے ملتے ہیں، تو ان سے کہتے ہیں "اگر تم اشتراکی تحریک کا ساتھ دو تو ہم تمام کارخانے تمہارے حوالے کر دیں گے"۔ کسانوں کو زمینوں کی ملکیت کے سنہرے باغ دکھاتے ہیں اور بے کار گریجوایٹس سے کہتے ہیں "اگر تم اشتراکیت قبول کر لو، تو تم سب کو تمہاری قابلیتوں و صلاحیتوں کے مطابق ملازمتیں مہیا کر دی جائیں گی"۔ جنسی آوارگی کے شکار نوجوانوں کو وہ آزاد معاشرہ مہیا کرنے کا وعدہ کر کے پرچاتے ہیں، جہاں قانون اور روایت کی کسی رکاوٹ کے بغیر وہ اپنی تمام خواہشات نفس بآسانی پوری کر سکیں گے۔

دوسری طرف عیسائیوں سے بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں: "اگر تم اشتراکیت کا ساتھ دو، تو ہم اسلام کو، اس مذہب کو، جو انسانوں میں ان کے مذہب کی بنا پر تفریق کرتا ہے، تباہ کر دیں گے۔ مگر

کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ○ (۱۸:۵)	بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے وہ محض جھوٹ بکتے ہیں۔

اسلام پر بہتان

الغرض یہ کہنا اسلام پر محض بہتان ہے کہ وہ مذہب کی بنا پر انسانوں میں تفریق و امتیاز کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام تو بلالحاظ مذہب و عقیدہ تمام انسانوں کو ان کے بنیادی انسانی حقوق عطا کرتا ہے۔ وہ انسانوں کو ایک خالص انسانی بنیاد پر جمع کرتا ہے، اور انہیں اپنی پسند کے مذہب کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی مکمل آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔

بنا بریں مجھے توقع ہے کہ مسلمانوں کی طرح اسلامی ممالک میں بسنے والے مسیحی بھی اپنے ہمسایوں کے ساتھ پُرامن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ اپنے تاریخی روابط بدستور استوار رکھنے کے متمنی ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ان کے اور مسلمانوں کے مفادات یکساں طور پر محفوظ رہیں. امید ہے کہ ہمارے یہ مسیحی بھائی ان اشتراکی اور سامراجی فتنہ پردازوں کی باتوں میں نہیں آئیں گے.

اسلام اور اشتراکیت

"بے شک اسلام زندگی کی تمام اچھائیوں اور خوبیوں کا مجموعہ اور صحت مند اقدارِ حیات کا نام ہے۔ یہ ایک دائمی مذہب اور ہر نسل اور معاشرے کے لیے دستورِ حیات ہے۔ لیکن گزشتہ چار صدی سے اسلامی معاشرہ جس طرح مسلسل اضطراب میں مبتلا رہا ہے، اس کی وجہ سے قانونِ اسلامی کا وہ حصہ جو معاشی مسائل سے متعلق ہے جمود اور تعطل کا شکار رہا ہے اور اپنا مسلسل ارتقا جاری نہیں رکھ سکا۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اپنی روحانی اور فکری تطہیر کے لیے اسلام کو اپنا عقیدہ بنائیں اور معاشی مسائل میں اشتراکیت کو رہنما بنائیں کیونکہ اس طرح ہماری معاشی مشکلات بھی حل ہو جائیں گی اور ہمارے معاشرتی نظام یا اس کے کسی پہلو پر اس کا کوئی مضر اثر بھی نہیں پڑے گا۔ اس طرح ہم نہ صرف اپنے اخلاق، معاشرتی روایات اور اقدار کا تحفظ کر سکیں گے بلکہ موجودہ دور کے جدید ترین معاشی نظریے سے استفادہ بھی کر سکیں گے۔"

اشتراکی تکنیک اور منطق

یہ اشتراکی حضرات کا محبوب طرزِ استدلال ہے۔ یہ وہ شیطانی کھیل ہے، جو وہ عرصۂ دراز سے کھیل رہے ہیں۔ پہلے پہل تو ان لوگوں نے اسلام کے خلاف کھُلم کھُلا جارحانہ اور معاندانہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کر کے اس کی قدر و قیمت کو گھٹانے کی کوشش کی مگر جب دیکھا کہ ان کی اس مخالفت نے مسلمانوں کے اسلامی جذبے کو اور زیادہ ابھار دیا ہے، تو انہوں نے اپنا طریقۂ کار بدل کر فریب اور دھوکا بازی سے اپنا کام نکالنا چاہا؛ چنانچہ اب انہوں نے

جو طرزِ استدلال اپنایا وہ کچھ اس طرح کا تھا "اشتراکیت لوگوں کے اسلام میں کوئی مداخلت نہیں کرتی کیونکہ جوہری لحاظ سے یہ تو سماجی انصاف ہی کا دوسرا نام ہے اور ریاست کی ان ذمہ داریوں کو واضح کرتی ہے جو اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے سلسلے میں اس پر عاید ہوتی ہیں۔ اس لیے اسلام کو اشتراکیت کا مخالف ثابت کر کے کیا تم مسلمان دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہو کہ اسلام سماجی انصاف کا دشمن ہے۔ یقیناً اسلام سماجی انصاف کے خلاف نہیں ہے اور نہ وہ کسی ایسے نظامِ حیات کی مخالفت کر سکتا ہے جو سماجی انصاف کا علمبردار ہو۔"

مغرب کے سامراجیوں کے نقشِ قدم پر

یہ شیطانی طرزِ استدلال مغرب کے سامراجیوں کے طرزِ استدلال سے ذرا بھی مختلف نہیں۔ اشتراکیوں کی مانند سامراجیوں نے بھی شروع شروع میں اسلام پر کھلم کھلا حملے کیے لیکن جب دیکھا کہ مسلمانوں کو ان کے حملوں نے اور زیادہ چوکنا کر دیا ہے، تو انھوں نے اپنی تکنیک بدل لی اور یہ کہنا شروع کر دیا: "اہلِ مغرب تو بس یہ چاہتے ہیں کہ مشرق کو تہذیب سے روشناس کرائیں۔ اس لیے اسلام جو تمام تہذیب کا نقطۂ آغاز ہے، کبھی اس کے ــــ یعنی تہذیب کے، خلاف نہیں ہو سکتا۔" انھوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ وہ اپنے روزے، نمازیں اور صوفیانہ مشاغل کو ترک کیے بغیر اس نئی تہذیب کو اپنا سکتے ہیں، حالانکہ انھیں خوب معلوم تھا کہ ایک بار ان کی تہذیب کا نخچیر ہو جانے کے بعد مسلمانوں میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہے گی کہ وہ اپنے اسلامی مزاج و کردار کو زندہ و باقی رکھ سکیں، بلکہ چند نسلوں کے بعد مکمل طور پر اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کی تہذیب کے غلام بن جائیں گے۔ ان کا اندازہ بالکل صحیح تھا؛ چنانچہ مسلمانوں میں نئی تہذیب کے زیرِ اثر پرورش پا کر ایسے افراد بھی نکلے جو اسلام کے بارے میں بالکل بے خبر تھے، بلکہ بغیر کسی معقول وجہ اور علم کے انھیں اسلام سے نفرت اور کد بھی تھی۔

اشتراکیوں کا اصل مقصد

ٹھیک یہی کھیل ہے، جو اس وقت اشتراکیت کے علمبردار مُسلمان ممالک میں کھیلنا چاہتے ہیں۔ وہ مُسلمانوں سے کہتے ہیں کہ اشتراکیت کو ایک معاشی نظام کے طور پر قبول کر لینے کے بعد بھی تم مسلمان رہو گے۔ تمہاری نمازوں، روزوں اور صوفیانہ اعمال پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی، کیونکہ اشتراکیت تو محض ایک معاشی نظام ہے۔ یہ انسان کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرتا، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان اشتراکیت سے بدکیں یا اس کے حل کو قبول کرنے سے انکار کریں لیکن انہیں خوب معلوم ہے کہ اگر مسلمانوں نے ایک بار اشتراکیت کے معاشی حل کو اپنا لیا، تو ان کے لیے مُسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنا ممکن نہیں رہے گا، وہ چند برسوں کے اندر اندر ہی انہیں ذہنی غسل دے کر اپنے فلسفۂ حیات کے مطابق ڈھال لیں گے اور اسلام اور اس کے تمام بچے کھچے اثرات ان کی زندگیوں سے مٹا ڈالیں گے، کیونکہ موجودہ دَور انتہائی تیز رفتاری اور حرکت کا دَور ہے اور اس میں بڑی بڑی دور رس تبدیلیاں مختصر سی مدت میں اور بڑی آسانی سے لائی جا سکتی ہیں، مگر افسوس ہے کہ ان تمام حقائق کے موجود ہوتے ہوئے بھی بے شمار مسلمان برضا و رغبت اشتراکیوں کی ان چکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں کیونکہ اس طرح انہیں اپنے بے مزہ اور خشک اسلامی فرائض کی بجا آوری سے بچنے کا ایک بہانہ ہاتھ آجاتا ہے اور اپنا راستہ آپ بنانے غور و فکر کرنے اور تعمیری کاموں میں اپنی قوتیں کھپانے کی کھکھیڑ سے انہیں آزادی مل جاتی ہے۔ وہ تو بس یہی چاہتے ہیں کہ ہر وقت فارغ بیٹھے رہیں اور افیونیوں کی مانند سوائے خواب دیکھتے رہنے کے انہیں کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ نہ کسی مسئلہ پر خود سوچنا پڑے، بلکہ دوسرے لوگ ہی ان کے مسائل پر سوچیں اور ان کی رہنمائی کریں۔ اور ان کا کام بس اتنا ہو کہ دوسروں کے کہنے پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے جائیں۔

اِسلام اشتراکیت کی ضد ہے

یہاں پر ہم یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اصولی طور پر اسلام کسی ایسے نظام کی مخالفت نہیں کرتا جو اپنی بنیادوں کے لحاظ سے اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہو اور بدلے ہوئے حالات میں مسلمان معاشرے کے کسی اجتماعی مسئلے کا حل اپنے دامن میں رکھتا ہو' لیکن جہاں تک اشتراکیت کا تعلق ہے' اس کا اسلامی نظام سے اصولی اور جوہری اختلاف ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں بعض سطحی مشابہتوں کے باوجود ایکدوسرے سے بالکل مختلف اور الگ الگ ہیں۔ مسلمان اسلام کے بہترین نظام حیات کو چھوڑ کر اشتراکیت، سرمایہ داری یا مادہ پرستانہ سوشلزم کو اختیار کر ہی نہیں سکتے' کیونکہ ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں' بلکہ گہرا اور بنیادی اختلاف ہے' خواہ بظاہر بعض پہلوؤں میں ان میں اسلام سے مماثلت بھی پائی جاتی ہو' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں صاف صاف فرمادیا ہے :-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵:۴۴) اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق حکم نہ کریں' وہ بالکل کافر ہیں۔

کیا اشتراکیت کو قبول کرنے کے بعد ہم مسلمان رہ سکتے ہیں؟ اس کا جواب ایک زوردار نفی کے سوا کچھ نہیں ہے' کیونکہ اشتراکیت محض معاشی اصلاح کا پروگرام نہیں ہے۔ جو لوگ اس کو اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں' وہ یا تو فریب خوردہ ہیں یا بددیانتی میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت اپنے نظریہ اور عمل دونوں میں اسلام کی عین ضد واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا ان میں تصادم ناگزیر ہے۔

اختلاف کے نظریاتی پہلو

نظریاتی طور پر اسلام اور اشتراکیت میں اختلاف کے جو گوناگوں پہلو پائے جاتے ہیں' ان کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے :

مادہ پرستانہ نظریہ

پہلی بات تو یہ ہے کہ اشتراکیت ایک خالص مادہ پرستانہ نظریہ ہے اور اس کے نزدیک حقیقت بس وہی کچھ ہے جس کو ہم اپنے حواس خمسہ کے ذریعے معلوم کر سکیں۔ جو حقائق ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہیں وہ توہمات و خرافات کا پلندہ ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس لیے ان کے متعلق انسان کو کسی قسم کا تردّد کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اینجلز (ENGELS) نے لکھا تھا: "مادہ ہی زندگی کی واحد حقیقت ہے۔" اسی طرح ان مادہ پرستوں کا یہ بھی خیال ہے کہ "انسانی ذہن مادے ہی کا ایک مظہر ہے اور اپنے گرد و پیش کے بیرونی مادی ماحول کا عکس۔" ان کے خیال میں انسانی رُوح کی بھی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ خالص مادی حالات کی پیداوار ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اشتراکیت ایک خالص مادہ پرستانہ نظریہ ہے جس کے نزدیک انسانی زندگی کے تمام روحانی مظاہر سامانِ تمسخر ہیں اور غیر معقول (غیر سائنٹیفک) نظریات اور خیالات کا نتیجہ ہیں۔

انسانیت کا پست تصوّر

انسانی زندگی اور انسانی سعی و جہد کا یہ اتنا پست اندازہ ہے کہ اسلام کبھی اس سے متفق نہیں ہو سکتا۔ اس کے نزدیک انسان کا مقام بہت اعلیٰ و ارفع ہے، اور باوجودیکہ اس کا جسم مادی ہے اور وہ زمین پر چلتا ہے، اس کی روح اور فکر کی پرواز لامحدود ہے؛ چنانچہ اس کی بنیادی انسانی ضروریات بھی بقول کارل مارکس صرف خوراک، مکان اور جنسی آسودگی ہی تک محدود نہیں ہیں۔

ایک مغالطہ

ممکن ہے اس مقام پر بعض قارئین کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اشتراکیت

کا یہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہماری زندگیوں پر کیونکر اثر انداز ہو سکتا ہے، جب کہ ہم اس کے صرف معاشی پروگرام کو اختیار کریں گے اور خدا اور رسولؐ کے بارے میں اپنے کسی بنیادی عقیدے اور نظریے سے دست بردار نہیں ہوں گے اور نہ اپنے روحانی نظام کو ترک کریں گے، کیونکہ اشتراکیت تو محض معاشی اصلاح کا ایک پروگرام ہے اور اس لحاظ سے اس کا ان چیزوں پر کوئی اثر پڑنا ناممکن ہے، مگر یہ محض مغالطہ ہے اور خوش فہمی، کیونکہ خود اشتراکیت کے نظریے کے مطابق کسی قوم کا معاشی پروگرام اور اس کے بنیادی عقائد اور نظریات حیات دو الگ الگ چیزوں کا نام نہیں ہوتا، بلکہ ان کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے سمجھا ہی نہیں جا سکتا، کیونکہ دونوں کی اساس ایک ہی معاشی نظام پر ہوتی ہے جس کا خمیر خالص مادہ پرستانہ نظریۂ حیات سے اٹھتا ہے۔ اس حقیقت کو اشتراکی اہلِ قلم نے اپنی تحریروں میں وضاحت سے پیش کر دیا ہے اور نہیں تو مارکس اور اینجلز ہی کی تصنیفات پر ایک نگاہ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

تاریخ کا جدلیاتی تصوّر

اشتراکیت جدلی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) میں یقین رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک اضداد کی کشمکش ——— سرمایہ داروں اور مزدوروں کی طبقاتی کشمکش۔ ہی وہ پُراسرار عامل ہے، جو انسان کی تمام اقتصادی اور مادی ترقی کا اصل باعث ہے، اب تک جو ترقی ہوئی ہے، وہ اسی طبقاتی کشمکش کا ثمرہ ہے۔ اب تک اپنے ارتقاء کے دوران انسانیت کو جو غلامی جاگیر داری اور سرمایہ داری کے مختلف ادوار میں سے گزرنا پڑا ہے، وہ بھی اسی کا نتیجہ تھا اور اسی کے ذریعے وہ اپنی منزل یعنی اشتراکی انقلاب تک پہنچے گی۔ جدلی مادیت کا یہی وہ نظریہ ہے جس کی روشنی میں اشتراکی اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی وہ نظریاتی بنیاد ہے جس کے پیش نظر انہیں یقین ہے کہ موجودہ نظریاتی جنگ میں بالآخر اشتراکیت ہی کو فتح حاصل ہو گی،

وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اشتراکیت اور جدلی مادیت کے اس نظریہ میں ایک (سائنٹیفک) ربط و تعلق ہے، جس میں خدا' اس کے رسولؐ یا دین کی کوئی گنجائش سرے سے ہے ہی نہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ ساری چیزیں محض اقتصادی عوامل کی پیداوار ہیں اور اپنے اقتصادی پس منظر سے الگ ان کی کوئی مستقل حیثیت اور اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے انسانی زندگی کے حقیقی نصب العین کے تعین یا اس کے مظاہر کی تشریح کے نقطۂ نظر سے بھی یہ بے کار ہیں۔ زندگی میں اصل قدر و قیمت جو کچھ ہے' وہ معاشی وسائل پیداوار کی ہے جن کی تبدیلی سے انسانی زندگی متاثر ہوتی ہے اور اس میں انقلابات جنم لیتے ہیں' مگر اس اشتراکی نظریہ کی تغلیط اور تردید اس امر سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ اپنے تمام بلند بانگ دعاوی کے باوجود یہ اسلام کے لائے ہوئے انقلاب سے پہلے جزیرہ نمائے عرب میں کسی معاشی انقلاب کی نشاندہی نہیں کر سکتا اور نہ عربوں کے وسائل معاش میں کسی ایسی تبدیلی کو ثابت کر سکتا ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے انقلاب کا پیش خیمہ کہا جا سکے' اور جو دنیا کو ایک بالکل نئے نظام حیات سے متعارف کرانے کا باعث بنی ہو۔

بے خدا نظریۂ حیات

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں ان کو ایک ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسلام کی نظر میں خدا کی رحمت اور شفقت اس کی تمام مخلوقات پر محیط ہے' جس سے سب کو یکساں فیض پہنچ رہا ہے' اور یہ خدا ہی کی ذات ہے جو اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے پیغمبروں کو بھیجتی رہی ہے' تاکہ وہ انہیں اسلام کی صراطِ مستقیم پر جو کہ معاشی حالات و واقعات سے زیادہ بڑی اور اعلیٰ حقیقت ہے' چلائیں۔ اس کے برعکس اشتراکیت کے نزدیک انسانی ترقی کے تمام مراحل باہم مخالف قوتوں کی کشمکش اور آویزش کا نتیجہ ہیں' اس میں مشیتِ ایزدی یا کسی دوسرے محرک یا عامل کو قطعاً کوئی دخل حاصل نہیں ہے۔ دخل جو کچھ ہے' وہ بس

اقتصادی یا معاشی حالات اور ان کے دباؤ یا اس کے تحت اُبھرنے والی انسانی ضرورتوں کو ہے۔ کوئی مسلمان مسلمان رہتے ہوئے اور اسلام کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہوئے اشتراکیت کے اس فلسفہ پر کیسے ایمان لا سکتا ہے؟ اور اس کا مخلص خادم کیسے بن سکتا ہے؟

اشتراکیت کا منفی نظریۂ انسان

دوسرا اہم اور نمایاں فرق اسلام اور اشتراکیت میں یہ ہے کہ اشتراکیت کا نظریۂ انسان خالصتاً منفی نوعیت کا ہے جس کے مطابق انسان مادی اور اقتصادی حالات و واقعات کے سامنے ایک بے کس کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کارل مارکس لکھتا ہے:

"انسان کی سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی ویسی ہی بنتی ہے جیسی کہ مادی حالات اور واقعات اس کو بناتے ہیں۔ انسانی شعور اپنے معاشرتی حالات و واقعات کو پیدا نہیں کرتا، بلکہ معاشرتی حالات انسانی شعور کو وجود میں لاتے ہیں"

اسلام کا نظریۂ انسان

اس کے برعکس اسلام کا نظریۂ انسان مثبت انداز کا ہے جس میں انسان ایک آزاد ارادے اور اختیار کا مالک ہے اور سوائے خدائے برتر و بزرگ کی مشیّت کے اور کسی کے تابع فرمان نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ	اور جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔
وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا	ان سب کو اس (خدا) نے اپنی طرف سے
مِّنْهُ ط (۴۵:۱۳)	تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔

اس طرح اسلام اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ اختیار اور قوت کے لحاظ سے دنیا میں انسان کو بلند ترین مقام حاصل ہے اور یہاں کی باقی ساری چیزیں اس

کی خادم ہیں۔ مثال میں ہم خود اسلام کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کی ترقی جدلی مادیت کے کسی قانون اور اصول کی کبھی پابند نہیں رہی ہے۔ صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ محض اقتصادی حالات کو انسانی تقدیر کے بنانے میں اصل اور فیصلہ کُن اہمیت حاصل ہے، جس کے سامنے بقول مارکس انسان بے بس اور مجبور محض ہے۔ ان مسلمانوں نے اپنے ارادے سے اور شعوری طور پر اپنے اقتصادی نظام کو خدا کی ہدایت اور اس کے رسولؐ کی رہنمائی کے مطابق استوار کیا۔ یہی حال ان کے دوسرے معاشرتی تعلقات کا بھی تھا؛ چنانچہ جب انہوں نے غلاموں کو آزادی دی، تو اس کے پیچھے بھی کوئی اقتصادی اور مادی منفعت کا جذبہ کام نہیں کر رہا تھا، بلکہ یہ اسی اسلامی تعلیم کا کرشمہ تھا کہ دنیائے اسلام میں جاگیردارانہ نظام کبھی قائم نہیں ہُوا، حالانکہ یہ نظام صدیوں سے یورپ اور دُنیا کے دوسرے حصّوں میں رائج چلا آ تا تھا۔

اجتماع یا معاشرہ کی مبالغہ آمیز اہمیت

تیسری بات جو اسلام اور اشتراکیت کے مسئلہ پر گفتگو کرتے وقت ہمارے ذہنوں میں رہنی چاہیے، یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے "ذاتی ملکیت" کے باب میں کہا ہے، کسی اقتصادی نظام کو اس کے معاشرتی فلسفہ سے جدا اور الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لیے اشتراکیت کو بحیثیت ایک نظامِ معیشت اختیار کرنے کے بعد ہم اشتراکی فلسفۂ حیات کو یعنی اس فلسفۂ حیات کو جو انسان کو اقتصادیات کا بے بس کھلونا سمجھتا ہے اور صرف اقتصادی عوامل کو تمام معاشرتی انقلابات کی واحد کارفرما قوّت مانتا ہے، اپنانے سے بچ ہی نہیں سکتے۔ اشتراکی نظامِ معیشت کا لازمی نتیجہ اشتراکی فلسفۂ حیات ہے، جس کے نزدیک انسانی زندگی میں اجتماع یا معاشرے ہی کو اصل فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے اور افراد کی حیثیت اس کے بے بس خادموں سے زیادہ نہیں۔

اسلام میں فرد کی اہمیت

یہ نقطۂ نظر اسلامی نظریہ کے بالکل خلاف پڑتا ہے۔ اسلامی نظریہ کی رُو سے اصل اہمیت

معاشرہ کو نہیں فرد کو حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے معاشرے کے مقابلے میں فرد کو اوّلیں اہمیت دیتا ہے۔ اسلام انسان کے اندرون کو اس قدر روشن اور مہذب بنا دینا چاہتا ہے کہ وہ برضا و رغبت اپنی تمام معاشرتی ذمہ داریاں انجام دینے لگے۔ گویا وہ فرد کو معاشرے کے باشعور رکن کے اعلیٰ مقام پر فائز دیکھنا چاہتا ہے، جو اپنی آزاد مرضی سے اپنی معاشرتی ذمہ داریاں بجا لاتا ہے اور اپنے پیشے کا انتخاب کرتا ہے، کیونکہ وہ نہ کسی خاص پیشے کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور نہ کسی کے ترک کرنے پر۔ اگر حکمران خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کریں، تو اسلام ہر فرد کو یہ حق بھی دیتا ہے کہ وہ اس کے احکام کی اطاعت سے انکار کر دے۔ یوں اسلام اپنے زیر سایہ ہر فرد کو معاشرے کے اخلاقی اصولوں کا پاسبان بنا دیتا ہے اور تمام معاشرتی برائیوں کا دور کرنا اس کا فرض قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا یہ منشا کسی ایسے معاشرے میں پورا نہیں ہو سکتا جس میں فرد کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہو اور اس کو مطلق العنانہ اختیارات کی حامل حکومت کے سامنے جو تمام اقتصادی ذرائع پیداوار پر کنٹرول کرتی ہے، بے بس بنا کر رکھ دیا گیا ہو۔

معاشرتی تعلقات کی اشتراکی بنیاد

آخری بات اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اشتراکی فلسفہ میں، جہاں تک معاشرتی تعلقات اور روابط کی تنظیم اور ترتیب کا تعلق ہے، اصل اور اساسی اہمیت صرف اقتصادی عامل کو حاصل ہے۔ انسانی زندگی میں اقتصادیات کو جو اہمیت حاصل ہے، اسلام نہ تو اس کی نفی کرتا ہے اور نہ اس کو گھٹاتا ہے۔ کسی قوم کی زندگی میں اس کی مستحکم معاشی حالت کو جو دخل حاصل ہے، اسلام اس کو بھی نظر انداز نہیں کرتا اور نہ اخلاقیات اور معاشرت پر اس کے اثرات کا منکر ہے، لیکن وہ اس خیال کا شدید مخالف ہے کہ زندگی معاشیات کے سوا کچھ بھی نہیں اور نہ اشتراکیت کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ اگر انسان کے اقتصادی مسائل حل ہو گئے، تو اس کے

باقی تمام مسائل بھی خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اس حقیقت کی وضاحت عملی زندگی کی مندرجہ ذیل مثالوں سے بخوبی ہوتی ہے:

معاشی مسئلہ انسان کے دُکھوں کا حل نہیں ہے

ایک ہی جیسی اقتصادی حیثیت کے دو ایسے نوجوانوں کی مثال لیجیے' جن میں سے ایک تو اپنی اندھی بہری خواہشاتِ نفس کا بندہ اور عیش و عشرت کا دلدادہ ہے اور دوسرا بجائے عیاشی کے فراغت کے اوقات پڑھنے لکھنے' اپنی معلومات بڑھانے اور اپنے ذہنی اُفق کو وسیع کرنے میں صَرف کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں نوجوان ایک جیسے سلوک کے مستحق ہیں؟ اور ان کی حالتوں میں کوئی فرق نہیں ہے؛ کیا ان دونوں کی زندگیوں کو یکساں طور پر نیکی' اچھائی اور کامیابی کا حامل سمجھا جائے گا؟

اسی طرح ایک اور آدمی کی مثال لیجیے جو بڑی مضبوط شخصیت کا مالک ہے' لوگ اس کی ہر بات خوشی اور احترام سے سنتے اور مانتے ہیں۔ کیا اس قدو قامت کے انسان کو اس نکھٹو کے مساوی قرار دیا جا سکتا ہے' جو نہ شخصیت رکھتا ہے' اور نہ معاشرے میں اس کو عزت کا کوئی مقام حاصل ہے' بلکہ دوسروں کا نشانۂ تضحیک بنا رہتا ہے۔ کیا محض اقتصادی مسئلہ ہی اس نکھٹو' روزگار شخص کا واحد اور اصل مسئلہ ہے کہ اگر یہ حل ہو گیا' تو اس کے باقی مسائل بھی حل ہو جائیں گے؟ کیا اس طرح اس کی زندگی اس حسن اور خوبی سے آراستہ ہو سکتی ہے جو اوّل الذکر کی زندگی میں نظر آتا ہے؟

اسی طرح کیا ایک حسین اور باوقار خاتون اور وہ عورت جو نہ حُسن رکھتی ہے اور نہ وقار آپس میں برابر ہو سکتی ہیں؟ اور کیا اقتصادی مشکلات دُور ہو جانے سے مؤخرالذکر عورت کی ساری مشکلات از خود ختم ہو جائیں گی اور وہ پہلی خاتون کے ہم پلہ ہو جائے گی؟

اخلاقی اقدار کو اوّلین اہمیت حاصل ہے

انسانوں میں یہی وہ فرق ہے جس کے پیشِ نظر اسلام نے اوّلین اہمیت اقتصادی

اقدارِ حیات کے بجائے اخلاقی اقدار کو دی ہے کیونکہ اس کی نگاہ میں انسانی زندگی کی اساس اقتصادی اقدار پر نہیں بلکہ کچھ غیر اقتصادی اقدار پر قائم ہوتی ہے۔ جن کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے اتنی ہی محنت اور جد وجہد کی ضرورت ہے جتنی کہ اقتصادی اقدار کو زندگی میں قائم کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام خدا اور انسان یعنی آقا اور غلام کے درمیان ایک دائمی رشتہ پر زور دیتا ہے کیونکہ خدا اور انسان کا یہی وہ روحانی رشتہ ہے جو عملی زندگی میں اخلاقی اقدار کے بھرپور نشوونما کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ انسان کو مادی زندگی کی پست سطح سے جہاں وہ اپنی مادی ضروریات کے تابع اور تباہ کن کشاکش نفرت اور حسد کا شکار نظر آتا ہے، بلند کر کے انسانیت کی ایک ایسی بلند منزل پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ اپنی خواہشاتِ نفس کا محض بندہ نہیں رہتا، بلکہ ایک ایسی دنیا کا باسی ہوتا ہے، جہاں نیکی، بھلائی اور محبت کی حکمرانی ہوتی ہے۔

روحانی اقدار کی برتری کا ایک اور پہلو

اسلام کے نزدیک ایک اور لحاظ سے بھی انسانی زندگی میں اساسی اہمیت روحانی قوت اور اقدار کو حاصل ہے۔ اس دنیا میں یہ روحانی اقدار انسانیت کا بہت قیمتی ورثہ ہیں اور انسان کی زندگی پر گہرے اثرات کی حامل ہیں۔ اگر ان کی طرف مناسب توجہ دے کر ان کی صحیح تنظیم کی جائے، تو یہ انسانی معاشرے میں اتنی ہی مؤثر ثابت ہو سکتی ہیں، جتنا کہ کوئی اور اقتصادی یا غیر اقتصادی عامل ہو سکتا ہے بلکہ معاشرتی تبدیلیوں کے لحاظ سے ان کا دائرہ دوسرے عوامل سے وسیع تر ہے۔

تاریخ کے آئینے میں

مسلمانوں کی اپنی تاریخ اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتنۂ ارتداد کے خلاف خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ تن تنہا ڈٹ گئے، حالانکہ حضرت عمرؓ بن الخطاب جیسے جلیل القدر صحابہ بھی ان مرتدین سے جنگ کرنے کے خلاف تھے مگر

اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی اور وہ مضبوطی سے اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ آپ کے اس استقلال اور ثابت قدمی کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما تھا؟ کیا یہ کسی مادی منفعت کا خیال تھا؟ محض دنیاوی فائدے کا لالچ تھا یا کسی خوشحالی کا تصور جس نے ان مشکل حالات میں بھی آپ کے اندر یہ قوت اور حوصلہ بھر دیا اور بالآخر کامیابی نے آپ کے قدم چومے۔ یقیناً ان مشکل حالات میں آپ کا سہارا اس طرح کی کسی مادی منفعت، خوشحالی یا کامیابی کا جذبہ نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ اتنا بڑا کارنامہ کبھی انجام نہ دے سکتے اور نہ تاریخ اسلام کے اس کٹھن دور میں اپنے فرائض سے اس خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہو سکتے۔ آپ کا یہ استقلال اور مشکلات کے ہجوم پر یوں قابو پانا آپ کے روحانی جذبہ ہی کا اعجاز تھا۔ یہ انسانی تاریخ کا بڑا اہم باب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحانی قوت اپنے اندر اتنی زبردست اقتصادی اور مادی قوت رکھتی ہے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اسی طرح کی مثال حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی بھی ہے۔ آپ نے اپنے زبردست روحانی جذبے کی مدد سے اموی خلفاء کے مظالم کا خاتمہ کر کے نئے سرے سے سماجی اور سیاسی انصاف کو قائم کیا، پرانی بے انصافیوں کی تلافی کی اور اسلام کے معاشرتی اصولوں کو پھر سے معاشرے میں جاری و ساری کر دیا، تا آنکہ وہ عظیم الشان تاریخی اور اقتصادی معجزہ بھی رونما ہو کر رہا جس کے بعد اسلامی معاشرے میں خیرات لینے والا کوئی مستحق ہی نہیں ملتا تھا۔

روحانی پہلو کی اہمیت کی اصل وجہ

اسی لیے اسلام اس روحانی پہلو کو بنیادی اہمیت دیتا ہے کیونکہ وہ انسان کو اس کے حیرت انگیز اور عظیم فوائد سے محروم کرنا نہیں چاہتا اور نہ اس کو روحانی ترقی کے نام پر مادی ذرائع و وسائل اختیار کرنے سے روکتا ہے۔ اسلام معجزات کا منکر نہیں ہے مگر ان کے انتظار میں بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہنے کا قائل نہیں بس

کے برعکس اس سلسلے میں اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ:

ان اللہ یزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن۔ (قول حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث)

بے شک اللہ تعالیٰ قوت سے ان چیزوں کا سدباب کرتا ہے، جن کا سدباب قرآن سے نہیں ہو سکتا۔

اشتراکیت کا مضر انسانی پہلو

اشتراکیت کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق جو شخص اپنی مادی اور اقتصادی ضروریات پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی اخلاقی اور روحانی زندگی پر بھی کوئی توجہ دے سکے، کیونکہ اشتراکیت میں ساری اہمیت زندگی کے ایک ہی پہلو یعنی اقتصادی پہلو کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کو مان لیا جائے تو انسانی زندگی کا ہمہ جہتی ارتقا جاری رہ ہی نہیں سکتا، صرف یک رُخی ارتقا ہی ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے انسانی جسم کا کوئی عضو۔ دل یا گردہ۔ بہت زیادہ بڑھ جائے۔ ایسی حالت جسم کے دوسرے اعضا کی ترقی کے لیے ہمیشہ مضر ثابت ہوتی ہے اور وہ اپنا کام نہیں کر سکتے۔ یہی حال اشتراکیت میں زندگی کے اقتصادی پہلو کا ہے، اس کی غیر معمولی اہمیت سے زندگی کے باقی شعبوں کا ارتقا رُک جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ بعض حضرات کو اسلام اور اشتراکیت کا اس طرح کا فلسفیانہ تقابل پسند نہیں کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح کی نظری بحثیں سطحی ہوتی ہیں اور ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت زندگی کے عملی مسائل کو حاصل ہے، لہٰذا انہیں نظری مسائل اور بحثوں پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے، چنانچہ کسی نظام کو قبول یا رد کرتے وقت ہم کو غیر ضروری بحثوں میں نہیں الجھنا چاہیے بلکہ اس میں اپنا مطمح نظر یہ رکھنا چاہیے کہ زیر بحث نظام عملی زندگی میں کس قدر مفید اور قابل عمل ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب ان حضرات کو نظری بحثوں سے واسطہ

پڑتا ہے، تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ عملی زندگی میں آخر اسلام اور اشتراکیت کے درمیان تصادم کیونکر پایا جاسکتا ہے، چنانچہ وہ ان دونوں میں کسی قسم کے تصادم کا ہی سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔

اسلام اور اشتراکیت میں اختلاف کے عملی پہلو

ہمارے نزدیک یہ اندازِ فکر صحیح نہیں ہے، کیونکہ کسی مسئلے کے عملی اور نظریاتی پہلوؤں کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جاسکتا، مگر اشتراکیت اور اسلام میں صرف نظریاتی اختلاف ہی نہیں ہے، بلکہ گہرا عملی اختلاف بھی موجود ہے۔ اس اختلاف کے چند پہلو ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

خاندان کی تباہی

(۱) اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کا اصل وظیفۂ حیات نسلِ انسانی کی افزائش ہے۔ اسی لیے اسلام عورت کا گھر کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا اور نہ سوائے غیر معمولی اور ہنگامی حالات کے اس کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کارخانوں اور کھیتوں میں مزدوری کرتی پھرے۔ ہاں اگر کوئی مرد یعنی اس کا خاوند، باپ، بھائی یا کوئی عزیز رشتہ دار خاندان میں ایسا نہ رہے جو اس کی کفالت کر سکے، تو تب البتہ وہ مزدوری کرنے کے لیے گھر کو چھوڑ سکتی ہے۔ اس کے برعکس اشتراکیت مردوں کی طرح عورتوں پر بھی کارخانوں اور کھیتوں میں مزدوری کرنا لازمی قرار دیتی ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ اشتراکی فلسفۂ حیات عورت اور مرد میں کسی بنیادی نفسیاتی امتیاز کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے اور نہ اس لحاظ سے دونوں جنسوں کے طبعی وظائف میں کسی قسم کا فرق روا رکھتا ہے، اشتراکی نظامِ معیشت کی طبعی اساس ہی مادی ذرائع پیداوار کو تا حدِ مقدور بڑھانے اور فروغ دینے کے تصور پر قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد صرف اسی وقت حاصل

ہوسکتا ہے جب مملکت کے تمام افراد مرد بھی اور عورتیں بھی گھروں سے نکل کھڑے ہوں اور اپنی تمام صلاحیتیں اور قابلیتیں اس کے لیے وقف کر دیں اور کارخانوں اور کھیتوں کو اپنی جولانگاہ بنالیں۔ اس مہم میں عورت کو بھی معاشرے کے دوسرے افراد کے پہلو بہ پہلو برابر کا شریک ہونا پڑے گا اور انہی جیسے فرائض انجام دینا پڑیں گے۔ اس معاملہ میں وہ کسی رعایت کی مستحق نہیں ہوگی اور سوائے ایام زچگی کے وہ کبھی اپنے کام سے غیر حاضر بھی نہیں ہوسکے گی۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ بچے ماں کی شفقت اور تربیت سے محروم ہو جائیں گے اور پھر وہ بھی مملکت کے کارخانوں[1] میں دوسرے سامانِ تجارت کی طرح کھیپ در کھیپ تیار ہوا کریں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اشتراکی نظامِ معیشت اپنانے کی صورت میں ہماری عورتوں کو اپنے گھروں کی چار دیواری چھوڑ کر لازماً باہر کام کرنا پڑے گا۔ اس سے خاندانی نظام درہم برہم ہو جائے گا، حالانکہ خاندان ہی اسلامی نظامِ اخلاق اور معیشت کی بنیاد[2] ہے اور اسلامی نظامِ زندگی میں اس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اگر اس کے جواب میں کوئی صاحب یہ کہتے ہیں کہ اشتراکی نظامِ معیشت اختیار کرنے کے بعد بھی عورتوں کو کارخانوں اور کھیتوں میں جاکر کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا تو

---

[1] بچوں کی تربیت کے بارے میں ہم "اسلام اور عورت" والے باب میں بہ تفصیل گفتگو کر چکے ہیں۔

[2] مگر اس سے خاندان کے اندر مرد و عورت کے باہمی تعاون کی نفی لازم نہیں آتی جس طرح معاشرے کے افراد مختلف کام کرنے کے باوجود ایک دوسرے سے تعاون و اشتراک کے رشتہ میں بندھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا حال خاندان کے اندر مرد اور عورت کا ہے۔ ان کے دائرہ ہائے کار اگرچہ مختلف ہیں مگر اس کے باوجود ان میں تعاون و اشتراک کا رشتہ قائم رہتا ہے۔

یہ ان کا خانہ ساز نظریہ ہوگا اشتراکی نظریہ ہرگز نہیں ہے اور نہ کوئی اشتراکی اس سے متفق ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں کمیونسٹوں نے کبھی کسی لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیا۔ جہاں تک معاشی ذرائع اور وسائل کو ترقی دینے اور بڑھانے کا تعلق ہے ہم انسانی زندگی میں اس کی ناگزیر ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، مگر اس غرض کے لیے اس اشتراکی نظام معیشت کو اپنانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ خود اشتراکیوں نے اپنی معیشت کو جو ترقی دی ہے وہ ان کے خانہ ساز معاشی وسائل کی مرہونِ منّت نہیں، بلکہ ان معاشی ذرائع پیداوار کی بدولت انہیں حاصل ہوئی ہے، جو انہوں نے دوسرے یورپی ممالک سے مستعار لیئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک اشتراکی ریاست دوسروں کے ترقی یافتہ ذرائع پیداوار مستعار لے کر ترقی سے ہمکنار ہو سکتی ہے، تو اس راہ پر چل کر ایک اسلامی ریاست کیوں ترقی یافتہ نہیں ہو سکتی ؟ خصوصاً جب کہ اسلامی مملکت دنیاوی فوائد کی خاط اصولی لحاظ سے زراعت ور صنعت کے جدید ترین طریقے استعمال کرنے کی کسی طرح بھی خلاف نہیں ہے۔

پرولتاری آمریّت

(۲) اشتراکی نظامِ معیشت کی عمارت پرولتاری طبقے کی آمریت مطلق کی بنیاد پر اُٹھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اس نظام میں صرف حکومت ہی کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرے کہ ان میں سے کون کیا اور کیسا کام کریگا؟ خواہ وہ اس کام کے لیے ضروری صلاحیتیں رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں اور خواہ وہ ان کے ذوق اور مزاج سے ہم آہنگ ہو یا نہ ہو۔ اس دنیا میں خیالات اور اعمال پر حکومت کی جانب سے کڑے پہرے بٹھا دیے جاتے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر کچھ سوچا جا سکتا ہے نہ لکھا جا سکتا ہے۔ معاشرتی

لہ اشتراکی نظام کے ابتدائی دَور میں روس صنعتی لحاظ سے انتہائی پسماندہ ملک تھا۔ اس کے بعد اس نے یورپ سے مادی وسائل اور ذرائع پیداوار کے طریقے اپنائے اور ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو گیا۔

انجمنوں کا ڈھانچہ بھی حکومت بناتی ہے اور صرف وہی ان کے مقاصد اور طریق کار وضع کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔ اشتراکیت کی یہ پرولتاری طبقہ کی آمریت' ایک فرد کی آمریت سے کئی لحاظ سے بدتر ہے۔ ان دونوں کا فرق بھی قارئین کو ملحوظ رکھنا چاہیے جہاں فرد کی آمریت قائم ہوتی ہے' وہاں اگر آمر شریف الطبع اور متوازن طبیعت کا مالک ہو اور اسے قوم اور ملک کا مفاد عزیز ہو' تو کسی وقت بھی یہ توقع ہو سکتی ہے کہ کوئی قانون بنانے یا فیصلہ کرنے میں وہ عوام کے صحیح یا غلط نمایندوں کو بھی شریک مشورہ کر لے گا' اور ان کی مرضی کے مطابق کام کرے گا۔ مگر پرولتاری آمریت سے اس طرح کی خوش آئند توقعات بھی وابستہ نہیں کی جا سکتیں' کیونکہ اس کا تو اولین اور واحد مقصد معاشی ہوتا ہے اور وہ صرف انہی کاموں میں دلچسپی رکھتی ہے جو اس کی آہنی گرفت کو اور زیادہ مضبوط کرنے میں۔ خود "پرولتاری آمریت" کی اصطلاح بھی اسی حقیقت کی غماز ہے۔

اشتراکیت کی نظریاتی پسپائی

اشتراکیت کی ان خامیوں کے علاوہ اس میں ایک اور بڑی خامی بھی پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی کوئی ٹھوس اور صحت مند نظریاتی بنیاد موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت نظریہ اور عمل دونوں میں دوسرے نظاموں سے مصالحت کی روش پر گامزن نظر آتی ہے؛ چنانچہ اول اول اس نے ذاتی ملکیت کے قطعی خاتمہ کا نعرہ لگایا اور یک بیک تمام کارکنوں کے معاوضوں کو برابر کر دیا' مگر جلد ہی اس کو دونوں کے بارے میں مصالحت کرنی پڑی' کیونکہ بعد میں تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ ذاتی ملکیت اپنے کام سے لگاؤ اور محنت کی بنیاد پر معاوضوں میں فرق اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے' کیونکہ اس سے کارکنوں میں اپنے کام سے لگن اور دلچسپی اور نتیجۃً پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذاتی ملکیت اور معاوضوں میں فرق کو تسلیم کر کے اشتراکیت کے علمبرداروں نے کارل مارکس کے فلسفہ کے دو اہم اور بنیادی ارکان سے انحراف کیا اور ایک ایسا موقف اختیار کیا جو اسلامی نقطۂ نظر سے قریب تر تھا۔

سوال یہ ہے کہ جب انسانیت دوسرے نظریات سے مایوس ہو کر یوں بار بار اسلام کی طرف پلٹ رہی ہے، تو ہم مسلمان کیوں اپنے واحد اور صحیح ضابطۂ حیات کو ترک کر کے اشتراکیت کی گود میں جا بیٹھیں؟

اسلام اور مثالیت[1]

اشتراکی پروپیگنڈہ

ہم سے اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ "وہ اسلام کہاں ہے جس کا تم مسلمان تذکرہ کرتے ہو؟ اس کی حقیقی صورت کو عملی زندگی میں کب اپنایا گیا ہے؟ تمہارا دعویٰ ہے کہ یہ ایک مثالی نظام ہے، مگر کیا اس کا عملی زندگی میں بھی وجود رہا ہے؟ اس کے جواب میں تم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین بلکہ ان میں سے بھی پہلے دو خلفاء کے دور کی طرف اشارہ کر دیتے ہو، کیونکہ تم تاریخ میں اس کی اور کوئی مثال نہیں پا سکتے۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ بن الخطاب کو تم مثالی حکمران سمجھتے ہو اور انہیں روح اسلام کا پیکر گردانتے ہو، مگر ان کے دورِ حکومت میں بھی ہمیں سوائے جاگیرداری، معاشی ناہمواری، عدم مساوات، جبر و استبداد اور جہالت و پسماندگی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ تم کہتے ہو کہ اسلام نے مسلمانوں کو یہ حق دیا ہے کہ اگر ان کے حکمران اپنی ذمہ داریاں بجالانے میں ناکام رہیں تو وہ ان سے جواب طلبی کر سکیں، مگر یہ تو خیر بڑی بات ہے ہاں بے چاروں کو خلافت راشدہ کے بعد اپنے حکمران آپ چننے کا موقع ہی کب دیا گیا ہے؟ تم یہ دعوےٰ بھی کرتے ہو کہ اسلام ایک عادلانہ نظام معیشت کا حامل ہے، جو منصفانہ تقسیم دولت کے اصول پر مبنی ہے، لیکن خلافت راشدہ کے مثالی دور میں بھی معاشی عدمِ توازن کی خلیج کو کب پاٹا گیا تھا؟ تم یہ بھی کہتے ہو کہ عوام کو روزگار مہیا کرنا اسلامی ریاست کا فرض ہے، مگر مبتلا ان لاکھوں ستم رسیدہ بے روزگاروں کے بارے

---

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

میں کیا خیال ہے جو مفلسی اور فاقہ کشی کے ہلاکت خیز بھنور سے نکلنے کی خاطر کاسۂ گدائی تھامنے پر مجبور ہو گئے یا زندگی بھر محرومیوں اور افلاس کا شکار رہے ؟ تمہیں اس بات پر فخر ہے کہ اسلام نے عورت کو تمام حقوق عطا کیے ہیں، مگر اپنے ان حقوق سے عورت فی الواقع کبھی فیض یاب بھی ہوئی ہے ؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ غیر موافق اقتصادی اور معاشرتی حالات نے اسے ان سے مستفید ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا ؟ تم انسان کے روحانی ارتقاء کے متعلق بڑی باتیں بناتے ہو جو بقول تمہارے خوف خدا کا نتیجہ تھا۔ تمہارے خیال میں اسی خوف خدا کی بدولت حاکم و محکوم اور قوم کے مختلف طبقات کے درمیان باہمی تعاون و اشتراک، عدل اور نیکی کی بنیادوں پر تعلقات استوار ہوئے۔ لیکن نسبتاً ایک بہت مختصر سے وقفہ کے سوا اس روحانی ارتقاء اور

---

(۱) مثالیت (IDEALISM) کا لفظ اہل مشرق اچھے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اسے اس وقت بولتے ہیں جب کسی نظام کی جملہ خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مگر زیر نظر مضمون میں یہ لفظ اپنے اس اچھے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا کیونکہ اس کتاب میں ہمارے پیش نظر اسلام کے خلاف پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا تجزیہ ہے۔ یہاں پر یہ لفظ اپنے مغربی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اہل مغرب کے نزدیک " مثالیت " خیالات و افکار کی دنیا میں مگن رہنے اور زندگی کے عملی مسائل مثلاً غربت، بھوک، مصائب و آلام اور ظلم و بے انصافی سے آنکھیں بند کر لینے کا نام ہے۔ جب غریب عوام کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اور نہ ان کے مصائب و آلام کو دور کرنے کی کوئی عملی تدبیر کی جاتی ہے۔ وہ ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہتے ہیں اور انہیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ کو بجا طور پر اس لفظ سے نفرت ہو گئی، کیونکہ یہ ایک طرف لوگوں کو جاگیرداری، آلام اور تحقیر و تذلیل کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور دوسری طرف انہیں بے معنی فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھانے کی کوشش کرتا ہے جن کا ان کی عملی زندگی اور اس کے مسائل سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی فلسفیانہ موشگافیوں کا جواب انسانی فطرت صرف نفرت ہی کی صورت میں دے سکتی ہے یہی وہ ذہنی پس منظر ہے جس کی وجہ سے اب اہل یورپ " مثالیت " کی تمام اقسام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر اشتراکیت کے علمبردار اسلام کو بھی اسی طرح کی ایک بے نتیجہ مثالیت اور خالی خولی نظریہ قرار دیتے ہیں، جس سے اور تو کچھ نہیں ان کی اپنی جہالت اور ذہنی افلاس ضرور ظاہر ہوتا ہے۔

سربلندی کی جھلک اور کہاں نظر آتی ہے؟ اس روحانی ترقی و سربلندی نے حکمرانوں کو بے بس رعایا کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے سے کیوں باز نہ رکھا؟ اور انہوں نے ان کی آزادیاں کیوں سلب کیں! دراصل تم جس دنیا کی باتیں کرتے ہو وہ سراسر ایک خیالی دنیا ہے۔ خلافت راشدہ کے جس مختصر سے دور پر تم فریفتہ ہو، اس سے محض اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں چند غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے لوگ موجود تھے جنہوں نے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے مگر یہ افراد اور ان کے کارنامے زندگی میں استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد ایسے کارنامے اور ایسے افراد کبھی دیکھنے میں نہیں آئے اور نہ آئندہ کبھی اس کا کوئی امکان ہے"

یہ ہیں وہ اعتراضات جو اشتراکی اور ان کے حواری اسلام پر کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں سے بھی بہت سے لوگ اس گمراہ کن پروپیگنڈے کا شکار ہیں۔ کیونکہ وہ اسلامی تاریخ سے بالکل بے خبر ہیں اور اس کے بارے میں بس اتنا کچھ ہی جانتے ہیں جتنا کہ انہوں نے اپنے سامراجی آقاؤں سے سیکھا ہے۔

مثالیت کی دو اقسام

اصل مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے ہم "مثالیت" کی دو بنیادی قسموں کے فرق کو واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ مثالیت یا مثالی نظاموں کی ایک قسم تو وہ ہے، جو محض خیالات کی دنیا تک محدود ہوتی ہے اور عملی زندگی میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اور نہ تاریخ میں اس بات کی کوئی شہادت موجود ہوتی ہے کہ یہ زندگی کے عملی مسائل کو سلجھا سکتی ہے یا قابل عمل بھی ہے۔ اس کے برعکس "مثالیت" کی ایک اور قسم بھی ہے، جو صرف خیالی دنیا تک ہی محدود نہیں ہوتی، بلکہ تاریخ سے اس کے قابلِ عمل ہونے کی واضح شہادت ملتی ہے۔ اور انسان کی عملی زندگی پر اس کی گہری چھاپ پائی جاتی ہے۔

بنیادی سوال

مثالیت کی ان دو قسموں کو ذہن میں رکھ کر مسئلہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ

بحث کا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اپنے فطری مزاج کے لحاظ سے اسلام محض ایک خالی خولی نظریہ ہے جس کا عمل کی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ اور نہ اس پر عمل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا سارا تانا بانا خیالی اور نظریاتی عناصر سے مل کر بنا ہے؟ یا، اسلام بنیادی طور پر ہے تو زندگی کا ایک عملی نظام، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر دور میں عملی نتائج کے اعتبار سے اسے ایک ہی طرح کی کامیابی حاصل ہو؟

مثالیت کی ان دو اقسام میں جو عظیم فرق ہے وہ محتاج وضاحت نہیں۔ اگر اسلام مجرد نظریہ اور خیال ہے تو پھر تو اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کبھی اس پر انسان کماحقہٗ عمل کر سکے، خواہ بیرونی طور پر معاشرتی حالات و واقعات میں آئندہ چل کر کتنا ہی عظیم تغیر کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر یہ ایک قابل عمل نظامِ حیات ہے محض بعض خارجی عوامل اس کے مکمل نفاذ کی راہ میں حائل ہیں تو پھر معاملے کی صورت بالکل بدل جاتی ہے۔ اس صورت میں اگر ناساعد حالات بدل جائیں یا اسلام کے لیے ساز گار ہو جائیں تو اس کے عملی نفاذ کی امید جاں فزا بار آور ہو سکتی ہے۔

اسلام عملی نظام ہے

اسلام ”مثالیت“ کی کس قسم کے تحت آتا ہے؟ اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے کیونکہ یہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ تاریخ میں اسلام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ عملاً جلوہ گر ہو چکا ہے، جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ ایک عملی نظامِ حیات ہے۔ جب پر انسان چاہے تو آج بھی عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ یہ مجرد خیال یا نظریہ نہیں ہے۔ دوسری طرف انسان اب بھی وہی انسان ہے جو ماضی میں تھا۔ اس کی فطرت بھی وہی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس لیے جو انسان ایک بار پہلے اسلام پر کامیابی سے عمل کر چکا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ آج اس کو اپنی عملی زندگی میں جگہ نہ دے سکے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو نہ ڈھال سکے

تحریک احیائے دین

دورِ جدید کے بعض "ترقی پسندوں" کا دعوٰی ہے کہ اس زمانے میں اسلام کا احیاء ممکن ہی نہیں۔ ان کے نزدیک احیائے دین کی کوششیں بے کار ہیں کیونکہ ان کی کامیابی کی کوئی امید نہیں۔ مگر ہم اپنے ان "ترقی پسند" دوستوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا انکے اس قول کا یہ مطلب ہے کہ اسلام کی بدولت صدرِ اوّل کے مسلمانوں کو اخلاقی فضیلت و برتری کا جو مقام بلند حاصل ہوا تھا، اس تک دوبارہ رسائی جدید انسان کے بس ہی میں نہیں ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ان کے وہ ترقی کے نعرے کیا ہوئے اور ان کا وہ دعوٰی کہاں گیا کہ انسان مسلسل ارتقاء کر رہا ہے اور اپنی اخلاقی اور ذہنی حالت کے اعتبار سے پہلے سے کہیں زیادہ بہتر اور ارفع مقام پر فائز ہے۔

خلافت راشدہ کے اختصار پر اعتراض

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خلافت راشدہ کا مثالی دور انتہائی مختصر تھا جس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی مثالیں خال خال اور ہمیشہ بہت قلیل وقفوں (مثلاً حضرت عمر بن عبد العزیز کا دور) پر مشتمل رہی ہیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام بحیثیت نظام حیات قابل عمل نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے آیئے ذرا گہرائی میں اتر کر اصل مسئلے کا جائزہ لیں کیونکہ اس کا جواب تاریخ کے صفحات پر کہیں تو دنیائے اسلام کے مقامی مظاہر کی صورت میں اور کہیں اقوام عالم کے تجربات اور عالمگیر صداقتوں کے روپ میں بکھرا ہوا ہے

یاد رکھنے کی دو باتیں — پہلی بات

مسئلہ کے اس پہلو پر غور کرتے ہوئے ہمیں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ پہلی تو یہ کہ خلافت راشدہ کے دور میں اسلام کے زیر اثر انسانیت نے جو زبردست ترقی کی، اور جس طرح اسلام نے اسے پستیوں سے اٹھا کر تہذیب اخلاق کی انتہائی سربلندیوں سے

روشناس کیا، وہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی طبعی قوانین کی روشنی میں کوئی تشریح یا توجیہ ممکن ہی نہیں۔ یہ بھی منجملہ ان بہت سے معجزات کے ایک عظیم معجزہ تھا، جو اسلام کی بدولت اس کرۂ ارض پر رُونما ہوئے۔ لیکن یہ معجزہ یونہی رونما نہیں ہو گیا تھا بلکہ اس کے لیے مسلمانوں کو اخلاقی انقلاب اور تعمیر نو کے طویل مراحل میں سے گزرنا پڑا۔ تب کہیں جا کر وہ لوگ پیدا ہوئے جو اس معجزے کی زندہ مثال تھے اور ان کی زندگیاں اس کی عملی تفسیر۔ جس برق رفتاری سے اسلام کو دنیا میں فروغ حاصل ہوا، اس کی کوئی اور نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ مادی یا معاشی تعبیر تاریخ کی مدد سے اسلام کی اس حیرت انگیز ترقی کی کوئی تشریح کرنا محال ہے۔ بہر حال اسلام کے اس زبردست پھیلاؤ کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بہت سی ایسی قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئیں، جو ابھی نہ اچھی طرح اسلام کی روح اور حقیقت سے آشنا تھیں اور نہ انہیں اس کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کی قدر و قیمت ہی کا کوئی صحیح اندازہ تھا۔ ان نو واردوں کی معلومات اسلام کے بارے میں نہ ہونے کے برابر تھیں پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس وقت کی مسلمان حکومتوں نے بھی ان لوگوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا جس طرح کا انتظام عرب کے ابتدائی مسلمانوں کے لیے کیا گیا تھا۔

چنانچہ اسلامی سلطنت کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں اور مسلمانوں کی گنتی بھی بڑھتی گئی، مگر نومسلموں کی اکثریت اسلام کے اصولوں اور اس کی تعلیمات سے پہلے کی طرح بے خبر رہی، چنانچہ پہلی بار مسلمانوں کے حکمرانوں کو کھلے بندوں احکام اسلامی کی خلاف ورزی کی جرأت ہوئی۔ کیونکہ اس وقت اسلامی معاشرے میں کوئی باخبر اور تربیت یافتہ رائے عامہ موجود نہیں تھی۔ اب انہیں غلطیوں پر روک ٹوک کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کے حقوق غصب کر لیے اور انہیں ہر طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ بنی امیہ، بنی عباس، ترکوں اور مملوک بادشاہوں کی تاریخ جور و ستم کے انہی مظاہر سے داغدار ہے۔ یہی وہ دور تھا جب مسلمان حکمرانوں نے اسلام کو کھلونا بنا لیا اور مسلمانوں کے حقوق کو بے دریغ پامال کیا۔

دوسری بات

دوسری بات جو اس سلسلے میں یاد رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ سلام کی وجہ سے انسانیت کو جو زبردست ترقی حاصل ہوئی، وہ کسی مادی یا محض قدرتی عامل کی پیداوار نہیں تھی۔ جس طرح اسلام نے انسانیت کو ایک ہی جست میں غلامی اور جاگیرداری کے قعر مذلت سے اٹھاکر معاشرتی انصاف کی انتہائی بلندیوں تک پہنچادیا اس کی کہیں اور مثال نہیں مل سکتی۔ انسانیت کو اندھی بہری خواہشات اور شہوات کی غلامی سے نجات ملی اور وہ اخلاقی تکمیل کے نقطۂ عروج پر فائز ہوئی۔

صدرِ اول کے مسلمانوں کی یہ حیرت انگیز اخلاقی سربلندی اسلام ہی کا اعجاز تھا۔ کیونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ اعلیٰ ترین روحانی قوت کے نمائندہ تھے۔ اسی روحانی قوت کی بدولت ان لوگوں نے ایسے ایسے کارنامے کر دکھائے جو آج معجزہ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جب ان کی قوت کا یہ روحانی سرچشمہ خشک ہونا شروع ہوا، تو وہ زوال اور انحطاط کا شکار ہو گئے۔ تاہم ان کے دلوں میں الہامی ہدایت کا یہ نور کسی نہ کسی حد تک ہر دور میں موجود رہا۔ اپنے اس مضمون میں ہم اپنے ابنائے نوع کی توجہ اسلامی تاریخ کے انہی روشن ادوار کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

جدید دور میں نظام اسلامی کا قیام زیادہ آسان ہے

لیکن جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اب عملی زندگی میں اسلام کے صدر اول کی طرح کا کوئی روحانی انقلاب برپا کیا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ اس وقت نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود ہیں اور نہ ان کے برگزیدہ صحابہ رضی اللہ تعالے عنہم اجمعین۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ گزشتہ تیرہ صدی کے دوران میں امت مسلمہ اور انسانیت کو جو وسیع تجربات اور ترقی حاصل ہوئی ہے ان کی وجہ سے سیاسی اور اقتصادی روابط کی دنیا میں جو باتیں پہلے معجزہ سمجھی جاتی تھیں وہ اب معجزہ نہیں رہیں اور نہ ان کا حصول اب ناممکن رہا ہے۔ ان کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے آج کا انسان ان سے پوری طرح مسلح ہے۔ اس لیے صدر اول کے مسلمانوں کی روشن مثال کو اپنے سامنے

رکھ کر جدید دور میں اسلامی نظام کو بروئے عمل لانا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کیونکہ آج کی دنیا پہلے کے مقابلے میں اسلام کے زیادہ قریب آچکی ہے۔ چنانچہ اب نسبتاً بہت تھوڑی سی کوشش سے ہم اپنے گوہرِ مقصود کو پا سکتے ہیں۔

حکمرانوں کا جمہوری انتخاب اور اسلام

مثال کے طور پر جدید دور میں اکثر و بیشتر قومیں اپنے حکمرانوں کو عام انتخابات کے ذریعے چنتی ہیں۔ اور انہیں یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اگر ان کے منتخب نمائندے اپنی مفوضہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام رہیں، تو وہ انہیں معزول کر دیں یا انہیں ان کے مناصب سے الگ کر دیں۔ مگر دراصل یہ اسلامی نظام ہی کی ایک خصوصیت کا جدید انطباق ہے، جس کو اس نے آج سے تیرہ صدی قبل دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ بلاشبہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں اس اصول کی کارفرمائی ایک معجزہ تھا، مگر آج یہ معجزہ نہیں رہا، واقعہ بن چکا ہے۔ اور اس کا حصول پوری طرح ہمارے بس میں ہے بشرطیکہ ہم اخلاص اور دیانت داری سے اسے اپنی زندگیوں میں جاری و ساری کرنا چاہیں۔ اس اصول کو اگر ہم غیروں کی خوشہ چینی کر کے امریکہ اور انگلستان سے درآمد کر سکتے ہیں، تو آخر اسلام کے نام پر اسے کیوں اختیار نہیں کر سکتے، خصوصاً جب کہ ہمارے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اسلام میں پہلے سے موجود ہے؟

بنیادی ضروریات کا مسئلہ

اسی طرح ریاست کی طرف سے اپنے ملازمین کی بنیادی ضروریات زندگی کی ضمانت کا مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے ملازمین کی بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس اسلامی اصول کو اپنانے کے لیے بیسویں صدی میں اشتراکیت کو پرولتاری آمریت کا سہارا لینا پڑا، حالانکہ اس سے بہت پہلے اسلام آمریت کی مدد کے بغیر ہی اس

پر کامیابی سے عمل کر کے دکھا چکا تھا۔ اس لیے اگر آج ہم مملکت کے ملازمین کی بنیادی ضروریات کا تحفظ چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اشتراکیت کی طرف دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام کی رہنمائی اور روشن مثال ہی کافی ہے۔

بحث کا بنیادی نکتہ

بہرحال مسئلہ زیر بحث میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ آیا کوئی خاص معاشرتی اقتصادی اور سیاسی نظام قابلِ عمل ہے یا نہیں؟ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کسی نظام کو پرکھ کر اس کے قابلِ عمل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اس کسوٹی پر ہر طرح سے پورا اترتا ہے اس لیے کہ درحقیقت یہ ایک عملی نظامِ حیات ہے یہ پہلا نظام تھا جو پوری کامیابی سے اس زمین پر چلا اور اپنایا گیا۔

کیا اسلام محض جذبات اور خواہش کی پیداوار ہے

اشتراکی مصنفین اور ان کے حواریوں کے اس دعویٰ میں ذرہ بھر صداقت نہیں ہے کہ جدید تمدن کی عمارت سائنسی حقائق کی بنیادوں پر استوار ہے جب کہ اسلام محض نیک خواہشات اور جذبات کے سہارے قائم ہے۔ اسلامی قانون پر ایک نظر اس اشتراکی دعوے کے بودا پن کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ اسلام نے جو قانونی نظام وضع کیا ہے، وہ محض نیک خواہشات یا جذبے پر نہیں بلکہ ٹھوس شہادتوں اور واقعات پر مبنی ہے۔ اسی طرح خلفائے راشدین کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے مجلس مشاورت سے مشورہ کرتے وقت یا قانون اسلامی کے کسی پہلو کی تشریح یا تطبیق کرتے وقت اپنے فیصلوں کی بنیاد کبھی محض خواہشات، تمناؤں یا خوش فہمیوں پر نہیں رکھی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے لیے ایک نظام قانون دینے کے باوجود اسلام صرف قانون پر بھروسہ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ سب سے پہلے انسان کے اندرون کی تہذیب

پر توجہ دیتا ہے اور اس میں اخلاقی شعور کو اس حد تک بیدار کر دیتا ہے کہ وہ خود بخود قانون کی اطاعت کرنے لگتا ہے اور اس غرض سے اسے کوئی بیرونی خوف یا لالچ دینے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ سیاسیات کے میدان میں یہ انسان کی سب بڑی کامیابی ہے۔ اسلامی معاشرے میں قانون کو صرف اس وقت حرکت میں لایا جاتا ہے جب معاشرے کی اجتماعی بہبود اس کا تقاضا کرے اور جب اصلاح کے باقی تمام ذرائع ناکام رہیں۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مشہور قول یزع اللہ با لسلطان ما لا یزع با لقرآن یعنی " اللہ تعالیٰ ان خرابیوں کا سدِ باب قوت سے کرتا ہے جن کا سدِ باب قرآن سے نہیں ہوتا"، قانونِ اسلامی کی اسی اہم خصوصیت کو واضح کرتا ہے۔

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اب بھی ممکن ہے۔ چند مثالیں

جو لوگ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو ناممکن سمجھتے ہیں وہ اکثر یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جیسی قد آور شخصیتیں تاریخ میں روز روز پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ع ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے تب کہیں جا کر کسی دیدہ ور کا ظہور ہوتا ہے۔ مگر اس قسم کی باتوں سے دراصل ان لوگوں کا اپنا ذہنی افلاس ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ جہاں تک اسلامی نظام کے قیام اور اسلامی قانون کے عملی نفاذ کا تعلق ہے اس کے لیے آج ہمیں حضرت عمرؓ جیسے مثالی انسانوں کی نہیں، بلکہ ان کے چھوڑے ہوئے قوانین اور قانونی نظائر کی ضرورت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر ہم مخلص ہوں، تو آج ان پر عمل پیرا نہ ہو سکیں۔ مثال کے طور پر حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ حکم جاری کیا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی اقتصادی یا معاشرتی مجبوری کے تحت چوری کا ارتکاب کر بیٹھے، تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے۔ کیا اس قانونی نظیر کے انطباق کے لیے آج حضرت عمرؓ کا بنفسِ نفیس موجود ہونا واقعی ضروری ہے؟ یقیناً نہیں، کیونکہ آپ کا یہ حکم دراصل آپ کا اجتہاد تھا اور فقہِ اسلامی کے اس بنیادی اصول سے ماخوذ تھا کہ:

ادرأوا الحدود بالشبہات ۔ شک کی صورت میں حد نافذ نہ کرو

اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ ضابطہ بھی بنایا تھا کہ مسلمانوں کا حاکم امیروں کی زائد دولت کو ان سے لے کر معاشرے کے پست حال لوگوں میں بانٹنے کا پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ جدید انگلستان میں آج ٹھیک اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ انگلستان کو یہ قانون بنانے اور اسے نافذ کرنے کے لیے کسی عمرؓ کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ دراصل موجودہ زمانے میں اسلامی قانون کے قابلِ عمل ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے، کیونکہ یہ ضابطہ بھی حضرت عمرؓ کا اپنا بنایا ہوا نہیں تھا بلکہ قرآن کے اس مشہور حکم پر مبنی تھا کہ:

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم

تاکہ دولت تمہارے دولت مند لوگوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتی رہے

حضرت عمرؓ نے بحیثیت خلیفہ اپنی اس رائے کا بھی اظہار کیا تھا کہ حکومت کو اپنے ملازمین اور عہدیداروں کی جائیداد اور ذرائع آمدنی کے بارے میں تحقیقات کرنے کا بھی پورا اختیار حاصل ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ دولت انہوں نے جائز ذرائع سے کمائی ہے یا ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس اصول کو تمام دنیا تسلیم کرتی ہے اور اسی کے مطابق عمل بھی ہو رہا ہے، حالانکہ اب ہمارے درمیان کوئی عمرؓ موجود نہیں ہیں۔

حضرت عمرؓ نے یہ قانون بھی بنایا تھا کہ ناجائز بچوں کی (ان بچوں کی جن کے ماں باپ کا سراغ نہ ملے) پرورش اور نگہداشت کی ذمہ دار حکومت ہے۔ اور وہ سرکاری خزانے سے ان کی تعلیم و تربیت کے مصارف ادا کرے گی تاکہ ماں باپ کے پاپ کا خمیازہ ان کی معصوم اولاد کو نہ بھگتنا پڑے۔ بیسویں صدی عیسوی میں یورپ اور امریکہ کو بھی ایسا ہی قانون وضع کرنا پڑا جس سے ایک بار پھر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جہاں تک قوانین اسلامی کے عملی نفاذ کا تعلق ہے، اس کے لیے وہ حضرت عمرؓ کی طرح کی کسی قد آور شخصیت کی محتاج نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کی اصل خوبی جس کی وجہ سے ہم ان کے محتاج ہیں، ان کی کا قد آور ہونا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ صدرِ اول کے ممتاز ترین فقیہ تھے، اسلام سے سرشار تھے اور انہیں اسلام کے اصولوں اور قوانین کا گہرا ادراک حاصل

تھا۔ ان کی شخصی زندگی کی مثال سے روشنی حاصل کر کے ہم اپنی زندگیوں کو سنوار سکتے ہیں۔ ان کی ذات ہر زمان و مکاں کے مسلمانوں کے لیے ایک پاکیزہ اور اعلیٰ نمونہ ہے لیکن بالفرض اگر ہم ان کی شخصی خوبیوں کو اپنے اندر پیدا نہ کر سکیں، تو بھی ہماری اجتماعی اور عملی زندگی کی فلاح کے لیے ان کے چھوڑے ہوئے فقہِ اسلامی کی پیروی بہت کافی ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ اس طرح ہم کم از کم غیروں کے ہاں سے قوانین اور "دساتیر" کی بھیک مانگنے کی ذلت سے تو بچ جائیں گے۔

اسلام خلافتِ راشدہ کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گیا

اسلامی نظام کے بارے میں ایک اور غلط فہمی بھی عام ملتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خلافت راشدہ اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے مختصر سے دور کو چھوڑ کر اسلامی نظام کبھی پوری طرح قائم نہیں ہوا۔ مگر یہ بات کہنے والے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ یا حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے بعد اسلام ایک مذہب اور نظام کی حیثیت سے ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ جوں کا توں موجود تھا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے خلافتِ راشدہ کے بعد بس حکومت کے نظام میں جزوی یا کلی طور پر ایک غیر صحت مندانہ تبدیلی آ گئی تھی، ورنہ جہاں تک معاشرے کا تعلق تھا اپنی روح کے اعتبار سے وہ اب بھی ایک اسلامی معاشرہ تھا؛ چنانچہ اس معاشرے نے کبھی "دولت مند" اور "غریب" یا "آقا" اور "غلام" کی طرح کی کسی طبقاتی تقسیم کو گوارا نہیں کیا، کیونکہ یہ اسلامی معاشرہ تھا جس کے تمام افراد ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک تھے اور محنت اور اس کے ثمرات و برکات سب میں ایک دوسرے کے ساتھ برابر کے شریک۔

اسلام کی عملداری۔ بعد کے ادوار میں

اسی طرح دنیا کے اسلام کے مختلف حصوں میں اسلام ہی کے قانون کی عملداری تھی جس نے یورپ کی طرح عوام کو کبھی جاگیرداروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ اسلامی روایات

سے مسلمانوں کی تاریخ کا ہر دور تابندہ نظر آتا ہے اور ان کی جھلکیاں ان جنگوں میں بہت آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں جو مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً اپنے دشمنوں کے خلاف لڑنی پڑیں۔ صلاح الدین ایوبی کے صلیبی معرکے اس ضمن میں بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح بین الاقوامی میدان میں معاہدات کی پاسداری کے معاملے میں مسلمانوں کی پچھلی تاریخ بھی بڑی روشن ہے۔ پھر علم سے محبت اور تہذیب و تمدن سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ دنیائے اسلام علوم و فنون کا گہوارہ تھی۔ اسلام کی روشن کی ہوئی اسی مشعل سے بالآخر سارا یورپ منور ہُوا اور اس قابل ہوا کہ ترقی اور عظمت کی راہوں پر گامزن ہو۔

مختصر یہ کہ اسلام اس مذموم مفہوم میں مثالی نظام نہیں جو مغرب میں اس سے بالعموم سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ ایک مکمل اور قابلِ عمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس پر ایک بار کامیابی سے عمل ہو چکا ہے اور آج اس پر نسبتاً زیادہ آسانی سے عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے کیونکہ گزشتہ تیرہ صدی کے عرصہ میں انسان کو جو تجربات ہوئے ہیں وہ اسے اسلام سے قریب تر لے آئے ہیں۔ اس دور میں اگر واقعی کسی نظام کو خالی خولی نظریہ اور دور از کار مثالیت قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ اشتراکیت ہے جس کو اب تک کہیں بھی کامیابی سے اپنایا نہیں جا سکا۔ خود اشتراکیوں کو اعتراف ہے کہ ابھی اشتراکیت اصلی کا مرحلہ دور ہے۔ البتہ دُنیا بتدریج اس کی جانب بڑھ رہی ہے۔ جب ساری دُنیا ایک ہی عالمی اشتراکی حکومت کے تحت آ جائے گی اور دولت کو دنیا کے لوگوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ تب کہیں حقیقی اشتراکیت قائم ہو گی۔ اس وقت "غریبوں" اور "امیروں" کی طبقاتی کشمکش بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی کیونکہ اس کشمکش کی اصل وجہ معاشی ناہمواریاں ہیں۔

اشتراکیّت کی خیالی جنّت

اشتراکیت کی اس خیالی جنّت کو حقیقت سے کوئی دُور کا علاقہ بھی نہیں۔ یہ کبھی حقیقت کے روپ میں جلوہ گر نہیں ہو سکتی۔ اس کی حیثیت "خود فریبی" اور جہاں فریبی سے زیادہ نہیں۔ جن مفروضات پر اس کی عمارت قائم ہے وہ سب باطل اور بے بنیاد

ہیں، کیونکہ نہ تو انسانوں کے درمیان مصنوعی ذرائع سے معاشی مساوات پیدا کی جا سکتی ہے، نہ محض دولت کی مساوی تقسیم سے انسان کے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ یہ بات صحیح ہے کہ انسانیت کی ترقی کا راز طبقاتی کشمکش میں مضمر ہے۔ اشتراکیت ایک ایسی "مثالیت" کی علمبردار ہے جس پر صرف وہی لوگ ریجھ سکتے ہیں جو سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہ نظریہ مادیت کے بیج سے پھوٹا ہے، مگر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس کے باوجود اسے انتہائی سائنٹیفک اور زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ ہونے کا دعویٰ ہے۔

پس چہ باید کرد؟

راہِ عمل

اسلام نے ہمیں جو نصب العین عطا کیا ہے اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ مانا کہ اسلام بہترین نظام حیات ہے اور اپنی تاریخی، جغرافیائی اور بین الاقوامی پوزیشن کو دیکھتے ہوئے اسلام ہی ہم مسلمانوں کے لیے عزت، قیادت اور معاشرتی انصاف کے حصول کا واحد ذریعہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ہم اس پر عمل پیرا کیونکر ہو سکتے ہیں جب کہ ساری دنیا اس کی مخالف ہے اور خود مسلمان ممالک پر ایسے ڈکٹیٹر مسلط ہیں، جو غیروں سے زیادہ شدومد کے ساتھ اس کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔

ایمان و ایقان کی راہ

جی ہاں، راہِ عمل کیا ہے؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی راہ وہی ہے جو انسانی تاریخ میں برپا ہونے والی ہر تحریک کو اختیار کرنی پڑی ہے اور یہ راہ ہے ایمان و ایقان کی راہ!!

عظیم تاریخی معجزہ

صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی قوت کا سرچشمہ یہی ایمان تھا۔ آج کے مسلمانوں کی نجات کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ بحیثیت مسلمان آج ہم جس صورتِ حال سے دوچار ہیں، وہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی حالت سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ وہ مٹھی بھر

لوگ تھے، مگر اس وقت کی دو سب سے طاقتور حکومتوں' روم اور ایران کے خلاف برسرِپیکار تھے جو افرادی قوت' مادی سروسامان' دولت' فنونِ حرب وضرب اور سیاسی طاقت ہر لحاظ سے ان پر فوقیت رکھتی تھیں' مگر اس کے باوجود پچاس برس سے کم عرصہ میں انہوں نے قیصر وکسریٰ دونوں کا غرور خاک میں ملادیا اور بحیرۂ احمر سے لے کر بحیرۂ رُوم تک ان کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ان کی یہ کامیابی تاریخ میں ایک عظیم معجزہ تھا!

تاریخ کی کسی مادی تشریح اور تعبیر کے ذریعے اس عظیم تاریخی معجزے کی کنہ کو پہنچا ہی نہیں جا سکتا۔ اسے صرف ایمان اور یقین کے حوالے ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی ایمانی جذبہ تھا جس کی وجہ سے مسلمان مجاہدین میدانِ جنگ میں دشمن کی فوج کو دیکھتے تھے تو پکار اٹھتے تھے:۔

الیس بینی وبین الجنۃ	میرے اور جنّت کے درمیان صرف اتنی سی
الا ان اقتل ھذا الرجل	بات حائل ہے کہ مَیں جا کر اس آدمی کو (کافر کو)
او یقتلنی ؟	ہلاک کر دوں یا خود اس کے ہاتھوں مارا جاؤں!

اور پھر یہ کہتے ہوئے وہ میدانِ کارزار کی جانب ایسے جذب وشوق سے لپکتے تھے کہ جیسے کوئی دُولہا حجلۂ عروسی میں داخل ہوتا ہے۔ یہ اسی ایمان کا کرشمہ تھا کہ دشمن کی سپاہ کو دیکھ کر وہ بے اختیار کہہ اُٹھتے تھے:۔

ھل تربصون بنا الا احدی	تم ہمارے معاملے میں دو بھلائیوں میں سے
الحسنیین (النصر اوالشھادۃ)	ایک بھلائی کے منتظر ہو؟ (یعنی فتح یا شہادت)

یہ ہے وہ راہ جس پر چل کر ہم اپنے گوہرِ مقصود کو پا سکتے ہیں۔ اس راہ پر چلے بغیر کوئی دعوت کامیابی کی منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔

کیا اسلحہ ضروری ہے؟

ہم سے اسلحہ کے بارے میں بھی سوال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس وقت

ہمارے پاس نہ اسلحہ موجود ہے اور نہ دوسرا ضروری سازوسامان۔ پھر اس کے بغیر ہم اسلامی نظام کے قیام کی جنگ کیسے جیت سکیں گے۔ اس طرح کی باتیں کرنے والے بعض تو مخلص لوگ ہیں اور کچھ شکست خوردگی کے احساس کے شکار۔ بلاشبہ اسلحہ اور مادی ساز وسامان ضروری ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت ان میں سے کوئی چیز بھی ہمارے پاس موجود نہیں ہے، لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری سب سے مقدم ضرورت اسلحہ نہیں ہے۔ محض اسلحہ کی مدد سے کوئی قوم اب تک کوئی معجزہ نہیں دکھا سکی ہے۔ پچھلی عالمی جنگ میں اطالوی فوج جدید ترین اسلحہ سے لیس تھی، مگر اس کے باوجود وہ کوئی کارِ نمایاں انجام نہ دے سکی۔ اس کے سپاہی انتہائی بزدل اور بھگوڑے ثابت ہوئے اور جاتے ہوئے اپنا سارا اسلحہ اپنے دشمنوں کے لیے چھوڑ گئے۔ ان کے پاس ہتھیاروں کی کمی نہیں تھی، بلکہ ایمان اور جذبہ کا فقدان تھا۔

اسلحہ اور ایمان

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ جذبۂ ایمانی سے سرشار ایک مختصر سے گروہ[1] نے جس کی تعداد بمشکل ایک سو افراد تھی اور جس کے چھاپہ مار دستوں میں کبھی چھ سات افراد سے زیادہ نہیں ہوتے تھے، اس عظیم، مگر کھوکھلی اطالوی سلطنت کے حکمرانوں کو تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر حواس باختہ کر دیا کہ انہوں نے ملک چھوڑ دینے ہی میں اپنی سلامتی سمجھی۔ اہلِ ایمان کے اس گروہ کے پاس کوئی مہلک ہتھیار نہ تھے۔ ان کے پاس نہ بھاری توپ خانہ تھا، نہ جیٹ طیارے اور نہ بکتر بند دستے۔ انہوں نے یہ لڑائی بظاہر معمولی پستولوں اور رائفلوں سے لڑی اور جیتی، مگر درحقیقت ان کے پاس دشمنوں کے ہتھیاروں سے کہیں زیادہ موثر اور خوفناک ایک ہتھیار موجود تھا۔ یہ ہتھیار ان کا جذبۂ ایمانی تھا۔ صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے وہ انہی جیسے جذبۂ ایمانی سے

---

[1] فاضل مصنف کا اشارہ یہاں پر غالباً طرابلس کے سنوسی مجاہدین کی جانب ہے۔ (مترجم)

سرشار تھے اور یہ عزم لے کر اٹھے تھے کہ یا تو خدا کے دشمنوں کو مار یں گے یا خود ان کے ہاتھوں شہید ہو جائیں گے! انتہائی مشکل اور ناسا عد حالات میں ان کی کامیابی کا اصل راز ان کا یہی ایمان اور عزم تھا۔

حق کی راہ۔ شہادت گہ الفت

ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ پھولوں کی سیج نہیں ہے، بلکہ سعی و جہد خون اور آنسوؤں کے درمیان سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس میں قربانیاں دیے بغیر چارہ نہیں۔ اپنے اعلیٰ اور پاکیزہ نصب العین کو یعنی عزت و وقار احترام اور معاشرتی انصاف کو ہم اسی طرح راہ پر چل کر پا سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سودا کوئی مہنگا نہیں ہے!

قربانیاں ناگزیر ہیں

واقعہ یہ ہے کہ نفرت، رسوائی، افلاس، کمزوری اور انتشار و افتراق کی بدولت ہم اب تک جن شدائد و مصائب کے طوفان سے گزر چکے ہیں، وہ ان شدائد و مصائب سے کہیں زیادہ ہیں جن کا اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے۔ گزشتہ عالمی جنگ میں لاکھوں عرب ہلاک ہوئے۔ ہزاروں اتحادیوں کے طیاروں کی بمباری کا نشانہ بنے بے شمار لوگوں کی جائیدادیں تباہ ہوئیں، ان گنت افراد گرفتار ہو کر قید و بند میں گرفتار ہوئے اور ایک کثیر تعداد کو بغیر کسی جرم یا وجہ جواز کے وسائل معاش اور رزق سے محروم کر دیا گیا، مگر اس کے باوجود ہم مسٹر چرچل کو خوش نہ کر سکے اور انہوں نے جنگ ختم ہوتے ہی کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر ہم سے کہہ دیا: ہم نے تمہیں بچایا ہے، اب اس کی قیمت چکانے کے لیے تیار ہو جاؤ!"

مغربی طاقتوں کا رویہ

ابھی کل کی بات ہے جب مغربی طاقتیں عربوں کو مشترکہ دفاع کے معاہدے

کے ذریعے اپنے ساتھ ملانے کے لیے بیتاب تھیں۔ ان کا اصل مدعا یہ تھا کہ اس طرح کم ازکم پچاس لاکھ عربوں کو اپنی مسلح افواج میں شامل کرکے ان پر اپنے ہلاکت آفرین ہتھیاروں کو آزمائیں تاکہ سفید فام امریکی اور انگریز ہلاکت سے بچ جائیں؛ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ عرب سیدھی طرح نہیں مانتے، تو انہوں نے زبردستی عرب دنیا کے تمام وسائل پیداوار پر قبضہ کرلیا۔ عرب عوام کو ذلیل اور رسوا کیا اور جب ان کی خدمات کی ضرورت نہ رہی، تو انہیں اٹھا کر پرے پھینک دیا۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے اور اس سے کسی جاندار کو مفر نہیں۔ اس لیے مصائب اور آلام سے دل برداشتہ ہونا بےکار ہے۔ کتنے ہی لوگ تھے جو ذلت اور رسوائی کی موت مرے؛ اندازہ ہے کہ جنگِ عظیم میں اتحادیوں کی خاطر لڑتے ہوئے کوئی پانچ لاکھ افراد لقمۂ اجل بنے۔ تو پھر آخر ہم اسلام کی خاطر — سربلندی، عظمت اور صداقت کی خاطر — اپنی جانیں لڑانے سے کیوں ہچکچائیں؟ اگر آج اسلام کی خاطر مرنے اور جینے والے پانچ لاکھ افراد موجود ہوں، تو یقین جانیے موجودہ سیاسی صورت حال بالکل بدل سکتی ہے۔ اس کے بعد نہ تو کوئی بر خود غلط ڈکٹیٹر دندناتا نظر آئے گا اور نہ کسی مسیحی یا غیر مسیحی سامراج کا وجود ہوگا۔ کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلامی نصب العین کے حصول کی صحیح راہ کیا ہے؟

اشتراکیت کی ترقی اور اسلام

بعض لوگ موجودہ دور میں اشتراکیت کی روزافزوں ترقی سے متوحش ہیں لیکن درحقیقت اس میں پریشان ہونے کی قطعاً کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اشتراکیت کی آمد سے عالمی صورت حال میں ذرہ بھر کوئی فرق رونما نہیں ہوا ہے۔ آج جو ممالک اشتراکیت کے زیرِ اثر ہیں وہ جب وسیع مسیحی دنیا کا حصہ تھے، تو وہ اسلام کے اتنے ہی شدید دشمن تھے جتنے کہ اب ہیں؛ چنانچہ اشتراکی انقلاب سے بہت پہلے بھی روسی حکومت مسلمان ملکوں میں پھوٹ اور انتشار ڈلوانے کے لیے اپنے ایجنٹ بھیجا کرتی تھی۔ اسے نہ اس وقت مسلمانوں کی فلاح عزیز تھی اور نہ اب

ہے۔ یہی حال یورپ کا ہے۔ ماضی میں یورپ مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگیں لڑتا رہا ہے اور تاحال اسی "مقدس" جنگ میں مصروف ہے۔ الغرض جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کا تعلّق ہے عالمی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

اس عالمی پس منظر میں ہم بحیثیت مسلمان آج ٹھیک اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں صدرِ اوّل کے مسلمان کھڑے نظر آتے ہیں۔ وہ دائیں بائیں ہر دو جانب سے اس وقت کی دو عظیم الشّان مخالف طاقتوں ـــ ایران اور روم ـــ کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ یہی حال آج ہمارا ہے۔ باقی رہے۔ وہ جابر اور مستبد حکمران جو آج اسلامی ممالک پر مسلّط ہیں، تو ان کے بارے میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ان کے دن تھوڑے ہیں، کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ اس طرح کی ظالمانہ اور کھوکھلی حکومتیں کبھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتیں۔

اسلامی شعور کا تقاضا

اس وقت جو واضح اسلامی شعور دنیائے اسلام میں اُبھر رہا ہے وہ اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اجتماعی عدل اور معاشرتی انصاف کو بروئے کار لانا چاہتا ہے اور اس غرض کے لیے وہ نہ مشرقی بلاک کی خوشہ چینی اور حاشیہ برداری کا روادار ہے اور نہ مغربی بلاک کی خیمہ برداری اور کاسہ لیسی اسے گوارا ہے۔

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا . . .

یہ امر باعثِ مسرّت و اطمینان ہے کہ انتہائی مشکل اور نامساعد حالات کے باوجود تحریکِ اسلامی ہر جگہ زور پکڑ رہی ہے۔ اس کی قوّت میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی اہمیت برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ موجودہ حالات کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا احیائ ناگزیر ہے اور صاف نظر آ رہا ہے کہ اس کے زیرِ اثر ایک بار پھر وہی شاندار اور درخشاں دورِ تاریخ طلوع ہونے والا ہے جس کی جھلک دنیا تیرہ صدی قبل دیکھ چکی ہے۔

موجودہ دنیا کے لیے راہِ نجات

آج کی دنیا ایک طرف مادیت پرستی اور دوسری طرف معاشی کشمکش کی دوہری لعنت میں گرفتار ہے۔ اسلام اسے ان دونوں سے نجات دلاتا ہے اور اسے ایک ایسا نظامِ حیات عطا کرتا ہے جو مادہ اور روح دونوں پر محیط ہے اور دونوں کے تقاضے بیک وقت پورے کرتا ہے۔ مادیت پرستی کی لعنت نے انسان کی روح اور قلب دونوں کا سکون و اطمینان لوٹ لیا ہے اور اس کی دنیا کو ایک مستقل کشاکش کا اکھاڑا بنا دیا ہے۔ دورِ جدید کے ان امراض کا علاج صرف اسلام ہی کے ذریعے ممکن ہے، کیونکہ وہ نہ روح کو مادہ پر قربان کرتا ہے اور نہ روح کی اہمیت میں اتنا غلو کرتا ہے کہ مادی پہلو نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جائے۔ وہ ان دو انتہاؤں کے درمیان نقطۂ اعتدال کو واضح کرتا ہے اور ان کے تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ دیر یا سویر دنیا والوں کو اسلام کی حقیقی قدر و قیمت کا احساس ہو کر رہے گا۔ اور اگر انہوں نے اسے بطورِ دین قبول نہ کیا، تو بھی وہ اس کے پیش کیے ہوئے فلسفۂ حیات کو تو کسی صورت بھی زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔ اس کے قبول کرنے ہی میں ان کی نجات مضمر ہے۔

باقی رہے ہم ___ تحریکِ اسلامی کے کارکن ___ تو عرض ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ کوئی ٹھنڈی سڑک نہیں ہے۔ صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح ہمیں بھی ابھی آزمائشوں، ابتلا اور ایثار کے کٹھن اور جانگسل مراحل میں سے گزرنا ہے۔ تب کہیں جا کر ہم دنیا کو اسلام کی صداقت اور حقانیت پر مطمئن کر سکیں گے، کیونکہ اس راہ میں جو بھی کوششیں اور قربانیاں کی جاتی ہیں، وہ کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ زمین اور آسمان دونوں اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۔	جو اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ بھی ضرور اس کی مدد کریگا۔ بیشک اللہ قوت والا اور غالب ہے۔

اور بے شک خدائے عظیم و بزرگ کا وعدہ سچا ہے!!